رویائے صادقہ

ڈپٹی نذیر احمد

ایک ہزار جلد

قیمت Rs.2/8

دیباچہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہرچہ دیدہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم

خدا کی یہ شان ہو تو اس کی حمد کیا مقدور انسان سے ہو۔ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ[1] نے پیغمبر صاحب کی نعت کا کچھ یوں ہی سا حوصلہ دلایا تھا۔ ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی[2] سے وہ بھی پست ہو گیا ؎

اِدھر مخلوق میں شامل اُدھر اللہ سے واصل
خواص اُس برزخ کبریٰ میں تھا حرفِ مشدد کا

تمہید کے طور پر جو کہنا منظور ہے یہ ہے کہ آدمی کے ساتھ ساتھ مذہب اور مذہب کے ساتھ ساتھ اختلاف پیدا ہوا۔ اور اس اختلاف نے دُنیا کو کبھی چین سے نہ رہنے دیا۔ ان دنوں مذہبی چرچے بڑے زوروں پر ہیں۔ اور اس کے ضروری نتیجے بھی ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اس رسالہ کے تصنیف کرنے سے غرض یہ ہے کہ مسلمان جہادی نہیں بلکہ اجتہادی مسلمان ہوں اور آپ بھی امن چین سے بیٹھیں اور دوسروں کو بھی امن چین سے بیٹھے رہنے دیں۔ معلوم نہیں میں اس ارادے میں کہاں تک کامیاب ہوں گا۔ مگر میرا دل تو ان ہی خیالات کی بدولت اسلام کی طرف سے پورا پورا مطمئن ہے۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

---

[1] میں بھی تم ہی جیسا بشر ہوں ۱۲ [2] پیغمبر صاحب نزدیک آئے پھر اور پاس کو سرکے یہاں تک کہ دو کمانوں جیسا فاصلہ رہ گیا۔ یا اس سے بھی کم۔ ۱۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلی فصل

تمہید کے طور پر صادقہ کی تقریب اور اسکی خواب دیکھنے کی عادت

لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ کیا دھوکا ہوا ہے ہم مدت تک اسی خیال میں رہے کہ صادقہ اور یوسفی دو سگی بہنیں تھیں اب تحقیق ہوا کہ ایک ہی عورت کے دو نام ہیں۔ اور اصلی ایک بھی نہیں۔ اس کو میکے ہی میں لوگ صادقہ کہنے لگے تھے۔ اس واسطے کہ اس نے ساری عمر نہ کبھی جھوٹا خواب دیکھا اور نہ اپنے جی سے بنا کر کوئی خواب بیان کیا۔ بیاہی گئی تو سسرال کی طرف سے یوسفی بیگم کا خطاب ملا۔ اس لئے کہ کثرت سے خواب دیکھتے دیکھتے اس کو تعبیر میں ایسا ملکہ ہو گیا تھا کہ اس کی رائے تیر بہدف ہوتی تھی۔ یوں تو کوئی ایسا بندہ بشر نہیں جو سوتے میں خواب نہ دیکھتا ہو۔ بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ آدمی کا دماغ ایک لمحہ بھی بے کار نہیں رہ سکتا۔ وہ ہمہ وقت کچھ نہ کچھ سوچا ہی کرتا ہے۔ جیسا جاگتے میں ویسا سوتے میں اتنا فرق ضرور ہوتا ہے کہ اکثر لوگوں کو خواب یاد نہیں رہتا مگر تو بھی وہ جتنی دیر سوتے ہیں، خواب ہی دیکھتے رہتے ہیں جانوروں میں سے اور جانوروں کا تو حال معلوم نہیں مگر گھوڑے کو جس کا جی چاہے آزمالے۔ کہ تھان پر کھڑا سو رہا ہے آنکھیں بند ہیں۔ خراٹوں کی آواز چلی آتی ہے اور یکایک خاص طور پر ہنہنایا۔

ایسے موقع پر سائیس یا جو کوئی آدمی موجود ہوتا ہے۔ "تھان ہے تھان ہے" کہہ دیا کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑا بھی کسی نہ کسی طرح خواب دیکھتا ہے۔ لوگوں نے بہت کچھ عقلیں دوڑائیں۔ مگر کسی کو ٹھیک پتہ نہیں ملا کہ خواب ہے کیا چیز اور اس کی تعبیر کے اصول کیا ہیں؟ ہم بھی مدتوں اس خبط میں گرفتار رہے۔ جب سے صادقہ کا حال سُنا یہ خیال ہی چھوڑ دیا۔ اور سمجھ لیا کہ خواب بھی اسرارِ الٰہی میں سے ہے۔ ع خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔

اس عورت کا دماغ بھی خدا نے عجیب ہی طرح کا بنایا تھا۔ وہ پرلے درجہ کی ذہین تھی۔ یوں بھی لڑکیاں بولنے اور بات چیت کرنے پر جلد قادر ہو جاتی ہیں۔ اور صادقہ تو پورے ڈھائی برس کی بھی نہ ہوگی۔ کہ ہم نے اپنے کانوں اس کو مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر مسلسل گفتگو کرتے سُنا۔ نہ لغزش، نہ لکنت، نہ رُکاوٹ۔ اس کا حافظہ ایسا قوی تھا کہ اس کو اپنے بچپن کے ان وقتوں کی باتیں جبکہ اس کو اچھی طرح گفتگو بھی نہیں کرنی آتی تھی ایسے صاف طور پر یاد تھیں کہ گویا کل کی بات ہے۔ ایک دفعہ کا اس نے مذکور کیا کہ "میں جھولے میں لیٹی ہوئی تھی۔ اوپر سے گری چھپکلی۔ اور اتفاق سے اُس وقت کوئی میرے پاس نہ تھا۔ میرے جی میں آیا کہ آواز دوں۔ مگر بولنا نہیں آتا تھا۔ ناچار رونے لگی۔ دَدّا نے مجھ کو آکر اٹھا لیا۔ میں چُپکی تو ہوگئی۔ مگر جب پھر اُس نے جھولے میں لٹانا چاہا تو میں اکڑ گئی دَدّا سمجھ تو گئی کہ جھولے میں لیٹنا نہیں چاہتی۔ مگر اس کو سبب کون سمجھائے۔ آخر اماں جان کا ذہن منتقل ہوا۔ اور لگیں کہنے۔ "ارے ذرا نیچے جھولے کو تو دیکھو۔ جوں ہی نیچے اٹھایا چھپکلی کو دیکھا یہ جا وہ جا، اماں جان نے مجھے گود میں لے کر پیار کیا۔ اور اسی وقت چھت گیری بنا دی۔ تب میرے دم میں دم آیا۔

وہ ایسی باتوں کے ایسے ٹھیک پتے دیتی تھی کہ تسلیم و تصدیق کے سوائے

کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ غالباً اس نے خواب بھی اسی زمانے سے دیکھنے شروع کئے ہوں گے۔ مگر اس کا چرچا گھر میں اس وقت سے ہونے لگا جب سے اُس کو بولنا آیا۔ جیسی اس کی عمر تھی۔ جیسے اس کے خیالات تھے۔ ویسے ہی اس کے ان دنوں کے خواب بھی ہوتے تھے۔ مثلاً ایک دن اُس کا بھائی کہ وہ بھی بچہ ہی تھا، اس سے کوئی دو برس بڑا، سویرے اُٹھ کھانے کے لئے ضد کرنے لگا۔ ماں نے کہا۔ "باسی کھچڑی تو میں تم کو دینے کی نہیں۔ رہیں کچوریاں، سو اول تو ابھی دکانیں نہیں کھلیں، اور دوسرے وہی ایسی کونسی خوبی بھری ہیں۔ گھی کا نام اور آدھے سے زیادہ تیل اور پھر ماش کی دال نہیں صاحب ذرا دم لو۔ ابھی میں تم کو غنی ٹکیا ڈلوائے دیتی ہوں۔ پھر چاہنا کھانڈ سے کھانا۔ یا مُربےّ کی پھانک سے۔ مگر خدا کے لئے اوپر سے پانی نہ پی لینا۔ ایسا نہ ہو پھر رات کو آپ بھی مارے کھانسی کے بیچین رہو۔ اور ہم سب کی نیند بھی حیران کرو۔" یہ سنکر صادقہ بولی

"اماں جان مربےّ کا مرتبان تو گر کر ٹوٹ گیا۔"

ماں:۔ "یہ کب اور کیوں کر؟"

صادقہ:۔ "کب اور کیوں کر تو میں جانتی نہیں مگر میں نے خواب میں دیکھا ہے۔"

خواب کا نام سنکر سب لوگ ہنس پڑے۔ بات گئی گذری ہوئی۔ ماما نے جلدی جلدی کر کے توا چڑھایا۔ ٹکیا پکائی۔ جوں مُربےّ کے لئے کوٹھری کھولی ایک چھوڑ دو دو بلیاں نکل کر بھاگیں۔ اندر جا کر دیکھا تو واقع میں مرتبان زمین پر ٹوٹا پڑا ہے۔

دو چار بار تو لوگ بے خبر ہوئے۔ لیکن جب دیکھا کہ یہ ہر روز خواب دیکھتی اور جو دیکھتی ویسا ہی ظہور میں آتا تو گھر والوں کو اچھا مشغلہ ہاتھ آیا۔ صبح ہوئی اور سب نے پوچھنا شروع کیا، "کیوں بی آج کیا خواب دیکھا؟" نہ کبھی ایسا ہوا کہ صادقہ نے کوئی خواب نہ دیکھا ہو اور نہ ایسا ہوا کہ دیکھا ہو۔ اور سچا نہ اُترا ہو۔ رفتہ رفتہ پہلے گھر میں پھر محلے میں پھر تو سارے شہر میں ایک غل سا مچ گیا۔ ادھر تو صادقہ کی شہرت بڑھتی جاتی تھی۔

اُدھر عمر کے ساتھ ساتھ وہ خوابوں میں ترقی کر رہی تھی۔ صادقہ کے خوابوں کے سلسلہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح کسی علم کے مبتدی کو پہلے آسان آسان باتیں سکھائی جاتی ہیں اور پھر تدریج وہ مشکل مشکل کتابوں پر عبور کرتا ہے۔ اسی طرح صادقہ کو پہلے صاف صاف خواب دکھائی دیتے تھے یعنی جو بات ہوئی جیسی کی تیسی اس کو خواب میں دکھائی دے گئی۔ وہی خواب وہی تعبیر لیکن آہستہ آہستہ اس کے خواب پیچ دار ہوتے چلے جو بدونِ تعبیر کے ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ جیسے پہیلی یا معمہ یا چیستان مثلاً گھر میں کسی کو تپ آنے کو ہوتی تو اس نے خواب میں دیکھا۔ بخار چڑھا ہوا ہے اور ٹپرے ہیں۔ پھر یوں دیکھنے لگی کہ دھوپ میں بیٹھے ہیں یا آگ سے تاپ رہے ہیں اور آخر آخر کو ایسا معلوم ہوا کہ آگے دیگچی[۱] رکھی ہے۔ اس میں چار رنگ کے چاول ہیں مگر ٹُسے ہوئے۔ اکثر تو ایسا ہوتا تھا کہ صادقہ کو خواب ہی میں اس کی تعبیر بھی معلوم ہو جاتی تھی۔ گویا تعبیر بھی جزو خواب تھی اور کبھی خواب میں تعبیر معلوم نہ ہوئی تو اس نے بیداری میں آپ تعبیر دے لی۔

ایک عجیب بات اور تھی کہ صادقہ کبھی فرمائشی خواب بھی دیکھتی تھی یعنی مثلاً ہم کو ایک بات کے معلوم کرنے کی ضرورت ہے اور ہم نے اس سے درخواست کی جیسا کچھ ہونے والا ہوا صادقہ نے خواب میں دیکھ دیا۔ مگر یہ بات اُس کے اختیار کی نہ تھی۔ بہتیری مرتبہ ایسا ہوا کہ صادقہ نے خواب دیکھنا چاہا اور بھلا یا بُرا کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ صادقہ نے سب تو نہیں مگر اپنے ضروری اور معرکے کے خواب تعبیر سمیت روزنامچہ کے طور پر ایک کتاب میں جمع کر لئے تھے اور اتفاق سے وہ اصل روزنامچہ ہمارے ہاتھ آگیا ہے۔ اور ہم اس کو عنقریب چھپوانے والے ہیں جب وہ روزنامچہ مشتہر ہو گا۔ تو قابل دید ہو گا۔ نہایت دلچسپ۔ اس روزنامچہ میں ایک بڑی خوبی تو یہ ہے کہ کو دن سے کو دن اور غبی سے غبی اس کو پڑھے اور اُلجھی ہوئی باتوں کو آسانی کے ساتھ سلجھانے لگے۔ اور اس میں تو ذرا سا بھی تامل نہیں کہ صادقہ کا روزنامچہ دیکھنے کے بعد تنی

---

[۱] دیگچی معدہ چار رنگ کے چاول صفرا خون بلغم سودا اخلاط چاولوں کا ٹُسنا خلطوں کا حرارت سے [illegible]

بات تو چار و نا چار تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اس جہان کے علاوہ ایک عالم ارواح بھی ہے۔ اور سوتے میں ہم کو اس کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اور اگر ہم اس میں مشق و مہارت پیدا کریں تو بہت سے اسرارِ قدرت منکشف ہوں۔ اور یہی معمولی خواب جو ہم اکثر دیکھا کرتے ہیں اور کبھی ان کی پروا نہیں کرتے۔ ان میں سے ہر ایک میں بڑے بڑے مطالب پوشیدہ ہوتے ہیں مگر ہم کو ان کے دریافت کرنے کا سلیقہ نہیں۔

دوسری فصل

صادقہ کا ایک عجیب خواب

لیکن یہ باتیں روز نامچے کے ساتھ لکھنے کی ہیں۔ تاہم اس غرض سے کہ لوگوں کو صادقہ کے خوابوں کی وقعت ہو جس کے وہ مستحق ہیں، مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ صادقہ کے ماموں الہ آباد کی طرف کہیں تحصیل دار تھے۔ کثیر العیال اور اس پر رحم دل اور سخی ایسے کہ باوجود موٹا کھانے اور موٹا پہننے کے ہمیشہ محتاج، روپیوں کے نہیں پیسوں کے، تو وجہ کیا تھی کہ آدھے کے لگ بھگ تو ان کی تنخواہ مصارف خیر میں چلی جاتی تھی۔ بیواؤں اور یتیموں اور مسکینوں کی تنخواہیں جو مقرر تھیں سو تھیں۔ کتنے ہی غریبوں کے بچوں کی فیس دیتے، ان کے لئے کتابیں بہم پہنچاتے۔ اور ان کو مدرسوں میں پڑھواتے کبھی سنا نہیں کہ کوئی سائل اُن کے یہاں سے محروم پھرا ہو۔ وہ ہمیشہ نئے سائلوں اور مواقع خیرات کی تلاش میں رہتے۔ اور ان کا خیال یہ تھا کہ نہیں معلوم کس کا دیا خدا کی درگاہ میں قبول ہو جائے۔ ساری عمر بیش قرار ماہانے کی نوکریاں کیں اور گھر میں دیکھو تو بیوی بیٹیوں کے کانوں میں چاندی کی بالیاں، تنگ موہری کے پاجامے، چمڑے کی سادی جوتیاں۔ جس طرح بانگی سے اناج کے ڈھیر کا حال معلوم ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک بات سے

آدمی کا تمام طرزِ مزاج کھل پڑتا ہے۔ جو شخص اس درجہ کا سنجی ہو محال عقل ہے کہ ظالم و مرتشی ہو تحصیل دار صاحب کا حال یہ تھا کہ اگر کسی سرکاری کام سے علاقہ پر جاتے۔ ایک چھپٹی ککڑی کی قسم۔ گھاس کا تنکا حرام۔ غرض عملے کے لئے عذاب و مصیبت تھے رعایا کے حق میں خدا کی رحمت۔ سرکار کے معتمد الخدمت۔ بیچارے کو مشکل یہ درپیش تھی کہ قانون یاد نہیں ہوتا تھا۔ ہر برس امتحان میں جاتے اور ہر بار فیل ہوتے۔ کلکٹر مہلت دلواتے دلواتے تھک گئے۔ حکام بالا دست درگذر کرتے کرتے عاجز آگئے۔ ضلع اور کمشنری بلکہ بورڈ تک سے معافی امتحان کی رپورٹیں ہوئیں۔ مگر اُن دنوں کی گورنمنٹ کچھ ایسی سخت گیر تھی کہ مطلق نہ پسیجی۔ گورنمنٹ اس بات پر تلی ہوئی تھی کہ کچھ بھی ہو نئے تعلیم یافتہ اختیار اور اعتبار کے عہدوں پر بھرتی ہوں۔ دیانت سہی، امانت سہی، راست بازی سہی، سرکار کی خیر خواہی سہی، پُرانے لوگ وہ روشن خیالی، وہ آزادیٔ رائے۔ وہ بے تعصبی، وہ معلومات کہاں سے لائیں گے۔ جس کے بدون ملک داری ہو ہی نہیں سکتی۔ خیر ؏

رموزِ مصلحت خویش خسرواں دانند

تحصیل دار صاحب کا یہ آخری سال تھا کہ یا امتحان پاس کریں یا نوکری سے برطرف۔ بس یہاں تو منکر سے منکر کو بھی ماننا ہی پڑے گا کہ خدا ہے اور آڑے وقت پر آڑے آتا اور اپنے نیک بندوں کی مدد کرتا ہے۔ امتحان میں بس زیادہ نہیں کوئی ایک ہفتہ باقی رہا ہوگا۔ کہ صادقہ نے خواب دیکھا اور وہاں ماموں صاحب کا وہی حال کورے سپاٹ۔ کارروائی اچھی۔ مقدمات کی تجویز درست۔ کتابی سوال پوچھو تو سکوت، اور کچھ بتایا بھی تو ادھورا اور غلط۔ خدا جانے کسی کی دعا لگی۔ کجا صادقہ اور کجا قانون کا امتحان۔ مگر ہاتفِ غیبی نے خواب میں پورے کے پورے سوال تبلادئیے۔ صادقہ نے صبح سویرے اٹھ سوال لکھ رجسٹری کرا ماموں پاس روانہ کئے۔ ہر چند تحصیل دار صاحب کی طبیعت کو قانونی مناسبت نہ تھی۔ اور کسی قدر نسیان بھی تھا۔ مگر سوالات ایسے وقت پر

پہنچے کہ تحصیل دار صاحب نے اطمینان کے ساتھ اُن کے جوابات سوچ لئے۔ صادقہ کے خواب پر بھروسہ تو تھا۔ مگر تو بھی اندر سے دل دُھکڑ پکڑ کرتا تھا۔ مجلس امتحان میں جاکر بیٹھے تو ایک نقطے اور شوشے کا بھی تو فرق نہ تھا۔ بڑی ناموری کے ساتھ پاس ہوئے تنخواہ اور اختیارات زیادہ ہوئے سو الگ۔

تیسری فصل

خواب دیکھنا صادقہ کے حق میں مُضر ہوا

بے شک صادقہ میں حکمی خواب دیکھنے کی ایک خاص صفت تھی۔ لیکن سوائے اِس ایک خواب کے جو ہم نے ابھی بیان کیا۔ اور ایک خواب جس کا حال آگے چل کر معلوم ہوگا اس نے کبھی کوئی بکارآمد خواب نہ دیکھا۔ اس کو آیندہ کے خواب دکھائی دیتے تھے۔ مگر اتنا ہی فرق تھا کہ اور لوگوں کو وقوع کے بعد خبر ہوتی تھی اور اس کو ذرا پہلے۔ ایک عالم غیب کی ٹوہ کے پیچھے پڑا ہے اور اسی بنیاد پر نجوم اور رمل اور جفر اور فال اور شگون اور کیا اور کیا۔ کتنے پاکھنڈ دنیا میں چل پڑے ہیں۔ لیکن جب ہم واقعات اور اُن کے نتیجوں کو روک نہیں سکتے تو پہلے سے جان لینا اگر ہو بھی تو کیا فائدہ دے سکتا ہے؟ اور یہی سبب ہے کہ خدا نے کسی بندہ کو غیب کا علم نہیں دیا۔ کیونکہ سب باتیں اُس نے اپنے قبضۂ قدرت میں رکھی ہیں اور کسی کو اس قدرت میں شریک کرنا چاہا نہیں تو نرا علم بے قدرت کس کام کا تھا۔

صادقہ کے خواب بھی اسی قبیل سے تھے۔ اگر اس نے کوئی اچھا خواب دیکھا تو اصلی اور عین خوشی کے مقابلے میں اُس کی خوشی بہت ہی ہوتی ہوگی تو جیسے عید سے پہلے عرفہ اور اگر بُرا دکھائی دیا تو وہی کہاوت ہوئی کہ قبل از مرگ واویلا۔ صادقہ کو ہم نے کبھی اس کی شیخی مارتے بھی نہ دیکھا اور کچھ کام کی بات ہوتی تو اس پر ناز ہوتا پر ہوتا۔ بلکہ ہمارا خیال یہ ہے،

کہ صادقہ اپنی اس حالت سے دل میں خوش نہ تھی۔ گو اس نے ناخوشی کبھی ظاہر نہیں کی۔ اوّل تو لوگوں کی فرمائشیں اُس کو پریشان کئے رہتی تھیں۔ کوئی بندہ بشر ایسا نہیں جس کو واقعات آیندہ کے دریافت کرنے کی ضرورت نہ ہو یا واقعات آیندہ کے دریافت کرنے کا اس کو شوق نہ ہو۔ جو سنتا ایک فرمائش لے دوڑتا۔ اور فرمائشی خواب کا دیکھنا صادقہ کے اختیار میں نہ تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ کسی خاص معاملے میں اُس نے خواب دیکھنا چاہا۔ اور ہر چند کوشش کی، مگر بُرا بھلا کچھ بھی نہ دکھائی دیا۔ تو جن لوگوں کی کار برآری نہ ہوتی ناحق ناراض ہوتے۔ اور صادقہ پر بے توجہی یا اخفائے حال کی بدگمانیاں کرتے۔ جس سے صادقہ کو ایذا ہوتی اور ایذا کی بات بھی تھی۔

سب سے بڑا نقصان جو صادقہ کو اپنے خوابوں کی بدولت پہنچا یہ تھا کہ لوگ اُس کی نسبت خیال کرنے لگے کہ اس کے سر پر کچھ ہے۔ ایک طور پر اس کا ادب کرتے اور اس کو وقعت کی نظر سے دیکھتے۔ مگر دل ہی دل میں ڈرتے بھی تھے کہ خدا جانے کیا اسرار ہے۔ اور آیندہ چل کر کیا گُل کھلے۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ صادقہ اکیس بائیس برس کی ہو گئی اور کہیں سے اس کے بیاہ نکاح کا پیام سلام کیسا؟ مذکور تک بھی تو نہ آیا۔ کئی برس تک اس کی ماں اس پہاڑی بیٹھی رہی کہ "بڑی آگے سے اُٹھے گی تو چھوٹیوں کا ٹھکانا کروں گی۔ بڑی کے آگے چھوٹیوں کو بیاہے جانے کا کیا حق ہے۔ بڑی کو کوئی نہیں پوچھتا تو چھوٹیوں کے لئے میں سو دفعہ کسی سے نہیں پوچھتی۔ یہی نہ کہ تینوں میرے گھٹنے سے لگی لگی بوڑھی ہو جائیں' بلا سے۔ خدا نہ کرے کہ میرے یہاں کاہے کی کمی ہے۔ پہلے یہ تینوں اور پیچھے ہم سب۔ مجھے تو دونوں آنکھیں برابر ہیں۔ اور تینوں ہی میرے کلیجے کے ٹکڑے ہیں۔ بڑی کو بٹھا رہنے دوں۔ اور چھوٹیوں کے گھر بسا دوں تو بڑی دل میں کیا کہے گی۔ اور پھر تو بڑی کی بات کہیں ہوتی بھی ہو تو نہ ہو۔ لوگوں کے دل میں دل نہیں ڈالا جاتا۔ خدا رکھے دو بہنیں اور بھی ہیں مگر بڑی بڑی ہی سی ہے۔ صورت شکل میں دونوں سے بیس۔ خانہ داری کا سلیقہ ماشاء اللہ ایسا کہ گھر کی یہ ساری

رونق صادقہ ہی کے دم سے ہے۔ پڑھی لکھی، ہوشیار، ذہن کی تیز اور کتنی بڑی خوبی ہے۔ دیندار۔ کچھ آج کل کے مردوں کی قسمت ہی ہیٹی ہے۔ ورنہ اس کے گنوں کو دیکھیں تو ہزاروں اُس کے خریدار ہوں۔ اور جب اس کی قسمت کھلے گی۔ تو جس کے پلے بندھے گی وہ زندگی کا مزہ بھی پائے گا اور کہے گا کہ ہاں بیوی ہو تو ایسی ہو۔ رہی خوابوں کی بات، سو اوّل تو مدتوں سے ان میں بہت ہی کمی ہو گئی ہے۔ اور عجب نہیں بیاہ سے اتنی بھی نہ رہے۔ لیکن کسی کا ہرج ہی کیا ہے، بلکہ قدر کرنے والا ہو تو سو ہنر ایک طرف اور یہ اکیلا ایک طرف، بیوی کی بیوی اور نجومی کی نجومی۔ آج لوگ کیسے کیسے جتن کرتے ہیں کہ آگے کا کچھ حال معلوم ہو۔ اور اٹکل کے تکّوں کے سوائے کچھ حاصل نہ حصول۔ اور میری صادقہ تو جو کہتی ہے گویا لوحِ محفوظ سے دیکھ کر کہتی ہے۔ اس کی بات نہ کبھی جھوٹی ہوئی اور نہ کبھی جھوٹی ہو۔ لیکن حق ناحق جو لوگ شبہ کریں، اور خللِ آسیب قرار دیں، اس کا کیا جواب۔ بس صبر اور شکر الٰہی۔ جو ایسا شبہ کریں اُن کو۔ اُن کے جھینوں کو۔ اُن کے پیاروں کو۔ اور اُن کے رہنے سہنوں کو۔ میری صادقہ کو اللہ رسولؐ کی امان۔ اللہ رسولؐ کا سایہ۔"

یہ تھے خیالات صادقہ کی ماں کے جو ایک ماں کو ہونے چاہئیں لیکن وہ لوگوں کی عام رائے کا اگرچہ وہ رائے غلط تھی، مقابلہ کر نہیں سکتی تھی۔ حال یہ تھا کہ چھوٹی بیٹیوں کے لئے منہ پھوڑ کر کہا بھی جاتا تھا تو بھی کوئی حامی نہیں بھرتا تھا۔ لحاظ کے مارے کسی نے منہ سے نہ کہا۔ مگر وہ چپ کر جانا بھی کہے داخل تھا۔ آخر کنبے کے لوگوں نے سمجھایا کہ "اس کے کرم میں بر ہی نہ لکھا ہو گا تو کیا کرو گی۔ ایک کی خاطر دو کی منزل کھوٹی کرتی۔ بھلا یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے۔ اور فرض کرو زبردستی سر پکڑ کر کیا بھی اور خدا کو اس کا گھر بسانا منظور نہ ہوا تو؟ اپنی اپنی تقدیر اپنا اپنا نصیب۔ ایک ماں کے پیٹ سے دس بچے ہوتے ہیں۔ دسوں کی دس صورتیں اور دس طرح کی قسمت۔ رہا بیٹیوں کا ٹھانا۔ سو یہ ہاتھی بادشاہوں سے نہیں باندھے گئے۔ بیٹیاں پرایا دھن ہیں۔ اور سدا سے ہوتی چلی آئی ہے اور ہوتی چلی

جائے گی کہ ان کو پالو پوسو اور آخر کار جس کی امانت ہے۔ اُس کے حوالے کر دو۔ تو تم یہ ضد چھوڑ دو۔ بندے کا کیا حوصلہ ہے کہ خدا سے لڑے۔ چھوٹیوں کو ٹھکانے لگنے دو۔ بڑی کا بھی خدا مالک ہے۔ جب اس کا وقت آئے گا۔ اور اس کے نصیب کھُلیں گے۔ غیب سے کوئی اس کا بھی خریدار پیدا ہو جائے گا۔ آگے کو رستہ تو ہو۔ دوہرے دوہرے سمدھیانے ہوں گے۔ چار کے کان آواز پڑے گی۔ ایسا بھی کیا ہے کہ کوئی اس کا خواہاں نہ ہو؛

غرض برس کے اندر ہی اندر دونوں چھوٹی بہنیں بیاہی جا کر دو دو تین تین بچوں کی مائیں ہو گئیں۔ اور بیچاری صادقہ ہے کہ کوئی اس پر ہاتھ نہیں رکھتا۔ گویا بیاہے جانے کے لئے خدا نے اس کو پیدا ہی نہیں کیا۔ یوں تو بیٹی والوں کو بہتیری ہی جلدی ہوتی ہے اور نہ کیوں ہو۔ دیر لگی اور لڑکی کھٹائی میں پڑی لیکن لحاظ کے مارے اور کچھ اس خیال سے بھی کہ خدا جانے کوئی کیا گمان کرے، یہ لوگ گھبراہٹ کو ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ نہ اُن کی طرف سے ابتدا ہوتی اور نہ اس قدر جلد رضامند ہو جاتے کہ بس منتظر ہی بیٹھے تھے۔ لیکن صادقہ کے لئے تو وضعداری کو بھی اٹھا کر بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔ اس پر بھی کوئی نہیں جمتا تھا۔ اور بس وہی ایک واہمہ کہ اُس کے سر پر کچھ ہے۔ جب صادقہ کی ماں کے کان میں یہ بھنک پڑی تو اُس نے صادقہ کو بڑا قدغن کر دیا تھا کہ ”خبردار جو خواب کا نام لیا ہوگا“۔ اور اس کے بعد سے اگر کوئی پوچھنے آیا اُس کو بھی تُرش روئی سے کہہ دیا کہ ”تو کو کیا کھیل لگا یا گیا ہے۔ ایسا ہی غیب دانی کا شوق ہے۔ تو نجومیوں کے پاس جاؤ۔ پنڈتوں سے پترا کھلواؤ۔ مولوی مُلا سے فال نکلواؤ۔ اس بیچاری کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔ اب یہ گھر کا کام کاج کرے یا تمہاری بیگار بھگتے“۔ پس اگرچہ کئی کئی برس سے خوابوں کا چرچا بند تھا مگر تاڑنے والے تاڑ گئے تھے۔ اور صادقہ کی نسبت لوگوں کا وہ عام خیال کہ اُس کے سر پر کچھ ہے نہ مٹا پر نہ مٹا۔ اُدھر تو صادقہ کی ماں نے اُس پر خوابوں کی بندش کر رکھی تھی اور اُدھر زور در زور نہیں اس کی سہیلیوں اور ہمجولیوں اور میل ملاپ والیوں کی معرفت تقاضا تھا کہ جس طرح ہو سکے

اپنے بیاہ کے بارے میں کوئی خواب دیکھے۔ صادقہ عجب مصیبت میں گرفتار تھی۔ خواب کا دیکھنا اس کے اختیار میں نہیں۔ جھوٹ موٹ دل سے بنا کر کہہ دے یہ اس کی عادت نہیں۔ ایسی کیا بات ہے کہ صادقہ کو اپنے بیاہے نہ جانے کا ملال نہ ہو۔ وہ دیکھتی تھی کہ گھر میں رات دن اسی کا مذکور ہے۔ اور ہر شخص اپنی جگہ افسردہ ہے۔ ممکن نہیں کہ اُس پر اس کا اثر نہ پڑتا ہو۔ کنبہ اور محلہ تو بجائے خود، اُس نے اپنے ہی گھر میں اپنے سے چھوٹی اور اپنے سے ہیٹی ایک چھوڑ دو دو بہنوں کو بیاہے جاتے اور بچے کھلاتے دیکھا تھی تو وہ بھی آدمی ہی کا بچہ کیوں نہ خیال آتا ہوگا۔ مگر اُس کے کسی ادا سے کبھی یہ بات ظاہر نہیں ہونے پائی کہ اس کو کواری بیٹھے رہنے کا اتنا بھی رنج ہے جتنی اُڑدھ پر سفیدی۔ وہ اپنی بہنوں کی شادی بیاہ چھٹی وغیرہ تقریبات میں ایسی خوش دلی سے شریک ہوئی کہ کواری عورت کے لئے بلکہ کسی قدر نامناسب سا تھا اُس نے ماں سے لڑ لڑ کر زائد از واجب بہنوں کے حقوق دلوائے۔ اور اتنا ماں کو بیاہی ہوئی بیٹیوں کا خیال نہ تھا جتنا کہ اُس کو بہنوں کا۔

چوتھی فصل

صادقہ کا انتظام خانہ داری

وہ جو کہتے ہیں کہ ناامیدی میں بھی ایک طرح کی راحت ہے۔ بس وہی حال صادقہ کا تھا۔ اُس نے سمجھ لیا تھا کہ اب میری یہ عمر آئی اور میں کواری ہی زندگی بسر کروں گی اور کواری ہی مروں گی۔ اور وہ ایسی زندگی کے لئے بالکل تیار تھی۔ ہمارے ملک میں لڑکیاں ایسی چھوٹی سی عمر میں بیاہ دی جاتی ہیں کہ اُن کو خانہ داری کے لئے تیاری کرنے کی کافی مہلت نہیں ملتی صادقہ کو بڑی مہلت ملی۔ مگر اس کو خانہ داری کی طرف سے بالکل ناامیدی تھی۔ تاہم اس نے ان لیاقتوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیا۔ جو ایک شریف بی بی۔ اور لائق ماں میں ہونی ضرور

ہیں۔ اس نے ماں سگے گھر کو اپنا گھر، اور چھوٹے بھائی بہنوں کو اپنے بچے سمجھ کر خانہ داری کے سب نشیب و فراز نظر میں کر لئے۔ جو باتیں سینہ بسینہ سکھائی جاتی ہیں۔ اُن کے علاوہ اس کی علمی لیاقت اس درجہ تھی کہ ایسا ویسا مرد اس کی جوڑ کا نہ تھا۔ وہ تو خدا کو پردہ ڈھکا رکھنا تھا کہ بیٹھے بٹھائے لوگوں کو اس پر آسیب کا اشتباہ ہوگیا۔ ورنہ کتنوں کو اس نے یہ کہہ کر جھٹکا دیا ہوتا کہ میں ان کے قابل نہیں ہوں۔

گھر والے اور نوکر چاکر گنے ہوئے بیس آدمی صبح اور بیس آدمی شام کھانے والے، اور یہ مہنگا سماں اور اُجلی زندگی اور گلتھم سو روپے مہینے کی آمدنی۔ اسی میں شادی اسی میں غمی۔ اسی میں تیر تیوہار اور اسی میں آیا گیا بھی۔ کسی دوسرے کے ہاتھ میں یہ انتظام ہوتا۔ تو نہیں معلوم کتنی دفعہ دیوالا نکلا ہوتا۔ مگر وہ تو صادقہ ہی سرے کی خوش سلیقہ تھی کہ ہر چیز سے امیری کی شان ظاہر ہوتی تھی۔ بال بچوں کا گھر اور ایسا ستھرا خدا جانے کیا کمال تھا۔ اور نوکروں اور بچوں کو کیسا سدھایا تھا۔ ہر ایک دالان میں بھرپور چاندنی بچھی ہوئی۔ صدر مقام پر جاڑا ہوا تو قالین اور گرمی ہوئی تو سوزنی۔ سوزنی پر گاؤ تکیہ۔ ایک پہلو میں پٹاری دوسرے میں صندوقچہ۔ سامنے اُگالدان۔ اُگالدان پر تنہ کیا ہوا اُجلا رومال۔ دالان کی دونوں طرف دو نواڑی پلنگ۔ دونوں پر سفید چادریں کسی ہوئیں۔ نہ جھول نہ سلوٹ۔ سرہانے کے تکیے الگ، بغلی الگ۔ پائنتی کو موسم کے مطابق چادر یا دُلائی۔ اوپر پلنگ پوش۔

باورچیخانہ ہم نے صاف دیکھا تو صادقہ کے گھر کا، کہ اگر چولھے نہ ہوں تو کوئی تمیز نہ کر سکے کہ یہ باورچیخانہ ہے۔ گھر کی صفائی دیکھ کر خیال گذرتا تھا کہ کیا ہر وقت ایک آدمی جھاڑنے والا کھڑا رہتا ہے کہ کہیں تنکے کا نام نہیں۔ کوٹھریوں میں گھس گھس کر دیکھا تو بلا مبالغہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک کوٹھری بجائے خود دکان ہے اور اس میں بیچنے کے لئے اسباب سجایا گیا ہے۔ پانی کے مٹکوں کی بھی کچھ اصل ہے۔ باوجودیکہ ہر سویں دن رمضان کے رمضان بدلے جاتے تھے مگر جب جس کے جی میں آئے جا کر دیکھ لے ایسے

معلوم ہوں گے کہ کورے منگوا کر رکھے ہیں۔ سبب یہ کہ دونوں وقت اندر باہر سے مانجے اور رگڑے جاتے ہیں۔ اور کائی یا گرد جمنے نہیں پاتی۔

ہم کو بڑی حیرت ہوئی تھی کہ سو روپئے میں ایسا گھر کیوں کر چلتا ہوگا لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ خانہ داری میں اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ اور ان ہی میں بہت خرچ بیٹھتا ہے۔ مثلاً بچوں کا ناشتہ اور بازار کا سودا سلف شہر میں رہ کر بازار کے سودے سلف کی قسم تو گھائی نہیں جاتی۔ مگر ہاں صادقہ اس اہتمام میں ضرور لگی رہتی تھی کہ جہاں تک ہو سکے کسی کو اس کی چاٹ نہ پڑنے پائے۔ یہ نہیں کہ وہ بچوں کو ترساتی تھی بلکہ ہر قسم کی خانہ ساز چیزیں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ اور وہ یقیناً بازاری چیزوں سے زیادہ لطیف اور مزہ دار ہوتی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ رات کا بچا ہوا باسی کھانا کسی کو نہیں بھاتا اور اکثر اس کا مزہ بھی اتر جاتا ہے اور یہی وجہ ہوتی ہے کہ چار و ناچار بازاری چیزیں منگوانا پڑتی ہیں۔ لیکن اول تو صادقہ کا اندازہ ایسا ٹھیک تھا کہ اگر کبھی کبھار کچھ بچا بھی تو ایسا کہ اس کو بچا نہیں کہتے۔ اس کا اصول یہ تھا کہ نہ باسی بچے نہ کتا کھائے۔ دوسرے اور گھروں میں بس دو وقت کے کھانے کو ضروری سمجھا جاتا اور اسی کا اہتمام ہوتا ہے۔ صادقہ کھانے سے بڑھ کر تازہ ناشتہ کا اہتمام رکھتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ کوئی بھول کر بھی بازار کے سودے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اور اگر آ بھی گیا تو کوئی چاؤ سے کھاتا نہ تھا۔ اور یوں مہینے کے مہینے ایک بڑی رقم پس انداز ہوتی تھی۔

زنانے کپڑوں میں وہ کچھ ایسا زیادہ کتر بیونت نہ کر سکی۔ بڑبڑاتی جاتی تھی مگر بنانے ہی پڑتے تھے لیکن مردانے کپڑوں میں اس نے ایسا تصرف کیا کہ اس مد میں روپیوں کی جگہ آنوں کا خرچ رہ گیا تھا۔ اس کو اس کی بڑی چڑ تھی کہ مرد اگرچہ وہ بچہ ہی کیوں نہ ہو مہین کپڑے پہنے یا عورتوں کی طرح گوٹہ ٹھپا لگائے۔ کچھ ایسی ٹپی پڑھا رکھی کہ آٹھ برس کے لڑکے کی کیا بساط وہ اپنے کسی ہم عمر کو کام دار جوتی پہنے دیکھ کر ہنستا تھا بس مردوں کے

کپڑے قیمتی ہوتے تھے مگر سادہ اور جپالاؤ۔ لباس کے بارے میں چاہو اُس کو فضول خرچی سمجھ لو کہ ایسے گھر میں دھوبی کو بہت اُڑ کر ملتا تو سوا روپیہ ڈیڑھ روپیہ۔ صادقہ چار روپیہ مہینہ دیتی تھی۔ مگر ان کے یہاں کے اترے ہوئے کپڑے دوسروں کے تازہ تہ دار دھلے ہوئے کپڑوں سے بہتر ہوتے تھے اور پھر مہینے میں چھ چھ سات سات دھلائیاں، جبکہ ہمارے یہاں کیا سارے شہر میں مہینے کی ایک دھلائی کا پٹینا پڑا رہتا ہے۔ ایک خاص بات صادقہ کے یہاں ہم نے اور بھی دیکھی کہ اندر باہر ملاکر پانچ نوکر تھے مگر اُن کے کام اس طرح پر بٹے ہوئے تھے کہ نہ کسی کو کثرت کار کی شکایت اور نہ اتنی فرصت کہ احدیوں کی طرح پڑے پڑے انڈا کریں، اور اس کی بڑی سخت تاکید کہ کوئی دوسرے کے کام میں ہاتھ نہ لگائے۔ اس سے ہوتا کیا تھا کہ ہر ایک کو اپنی ذمہ داری معلوم رہتی تھی۔ اور جب کوئی کام بگڑتا تھا۔ ایک شخص خاص کو اس کی جواب دہی کرنی پڑتی تھی۔ یہ نہیں کہ انا کو خالی بیٹھے دیکھ کر اس کے آگے سلائی ڈال دی۔ سینے والی سے آٹا گندھوا لیا۔ پکانے والی کو کسی کی خیر صلاح کی خبر کو بھیج دیا۔ اپنے کرنے کا کام نہ ہو تو خالی بیٹھی رہو مگر دوسرے کے کام میں دخل نہ دو۔ دیر ہو تو تمہاری بلا سے اور بگڑے تو تمہارے صدقے سے۔ اس ربط و ضبط کی قدر کوئی اُن کے دل سے پوچھے جو گھر کا انتظام اٹھائے ہوئے ہیں۔

یہ ہے ایک مختصر سا نمونہ صادقہ کی کارروائی کا، جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کس عقل اور کس سلیقے کی عورت تھی۔ ہائے افسوس ایسی دانشمند، ایسی زیرک، ایسی منتظم ایسی لائق، صورت کی اچھی، سیرت کی عمدہ اور بائیس برس کی عمر تک صرف اس وجہ سے کواری بیٹھی رہے کہ سچا خواب دیکھتی تھی اور لوگ ناحق ناروا شبہ کرتے تھے کہ اس کے سر پر کچھ ہے۔ لیکن خدا کا کوئی فعل مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ انسان اپنے قصور عقل کی وجہ سے اُن مصلحتوں کو اکثر نہیں سمجھتا اور منہ سے بھی نہ کہے تو دل میں ناراض ہوتا ہے اور اس کو ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں، ہم خیال کرتے ہیں کہ یہی حال رہا ہوگا صادقہ کا اور اس کی بہتری

چاہنے والوں کا۔ لیکن بعد کو منکشف ہوا کہ وہ اس غرض سے ٹھائی گئی تھی کہ روزِ ازل میں اس کا جوڑا ایسے شخص کے ساتھ بدا تھا کہ معمولی طور کی عورت نہ اس کو خوش رکھ سکتی تھی۔ نہ آپ خوش رہتی۔

پانچویں فصل

بیاہ کے بارے میں صادقہ کے خیالات

ناظرین کی خدمت میں اس شخص کی تقریب کرنے سے پہلے ہم ایک گفتگو نقل کرتے ہیں، جو صادقہ اور اس کی پرانی بچپن کی سہیلی ہمراز بیگم میں ہوئی تھی کہ اس سے بیاہ کے بارے میں صادقہ کے خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ دونوں میں رشتہ ناطہ کچھ نہ تھا۔ مگر ہمسائگی ہم عمری اور ہم مکتبی کی وجہ سے ایسا خلا ملا تھا کہ دو سہیلیوں میں کہیں ہوگا تو بس اتنا ہی ہوگا۔ خدا جانے کس نے بیان کیا تھا کہ دونوں نے ایک ساتھ کا سونا اس دن چھوڑا ہے۔ جب ہمراز بیاہی جا کر بدا ہوئی۔ اور تب ہی سے صادقہ ہمراز سے ذرا کھنچنے بھی لگی تھی۔ کیونکہ کواری لڑکی کا بیاہی ہوئی لڑکیوں سے بہت میل جول رکھنا ذرا بدنما بھی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن صادقہ کی رکاوٹ پر ہمراز کا یہ حال تھا کہ سسرال سے ہر روز بلا ناغہ خیر صلاح کے لئے آدمی بھیجتی، اور میکے آتی تو پہلے سیدھی صادقہ کے پاس آتی۔ اور سسرال جاتی تو سب سے اخیر اُس سے مل کر جاتی، اور باوجود ماں بہتیرا روکتی ٹوکتی رہتی کہ دیکھو ایسا نہ ہو کہ سسرال سے کوئی آدمی آنکلے۔ ہمراز کا (کیا گنتی بتائیں) ایک پاؤں اپنے گھر ہوتا تھا اور دوسرا صادقہ کے یہاں۔

شروع شروع میں تو یہی کیفیت رہی، مگر دنیا کی کسی چیز کو بھی قیام نہیں، جوں جوں ہمراز بال بچوں کے بکھیڑے میں پھنستی گئی، پیار اخلاص میں تو نہیں مگر ہاں تپاک میں کمی آتی گئی یوں تو صادقہ کے بیاہ کی طرف سے ماں کو ہر وقت تردد ہی تردد رہتا تھا مگر جب سے

لوگوں نے یہ صلاح دینی شروع کی۔ کہ بڑی کے بیاہ کا انتظار نہ کر کے چھوٹی لڑکیوں کو بیاہ دو۔ تب سے تو حقیقت میں ماں کا اضطراب اس قدر بڑھ گیا تھا کہ رات دن اسی کی دھن تھی۔ جہاں اُس نے اور تدبیریں کیں۔ اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ ہمراز کو بلا کر کہا کہ "میں تو نہیں کہہ سکتی۔ تم اپنے طور پر صادقہ سے کہہ۔ کہ اپنے بارے میں کوئی خواب دیکھے۔ اور عجب نہیں دیکھا ہو اور لحاظ کے مارے نہ کہتی ہو۔ تم اس کی ٹوہ لو"

ہمراز نے صادقہ کو الگ دالان میں لے جا کر باہر کی چلمنیں چھوڑ دیں۔ صادقہ اس بلا کی ذہین تھی کہ اتنی ہی بات سے سمجھ گئی۔ بارے جب دونوں ایک جگہ بیٹھیں تو صادقہ ہی نے بات نکالی کہ "اب کے تم سسرال میں خوب جمیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم لوگوں کی اگلی سی وہ چاہت نہیں رہی "۔

ہمراز۔ "مجھ کو تو سسرال میں ایک ایک دن دو بھر ہے۔ پر کیا کروں پرائے بس میں ہوں۔ ننھے کا ایسا ہلکا خون ہے کہ آئے دن بیمار رہتا ہے۔ اور اب کے تو دشمنوں کی کچھ بھی آس نہ تھی، ایسے زور کا معلی دکھ ہوا تھا کہ بارہ دن تک ساری ساری رات لئے بیٹھے رہے۔ بارے اب برسوں سے ہوشیار ہوا تو میں زبردستی نکل بھاگی۔ اماں جان تو اب بھی راضی نہ تھیں اور وہ مجھ سے راضی ہی کب ہوئی ہیں۔ ہاں تم اپنی تو کہو "۔

صادقہ۔ "خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ ہماری تو وہی کہاوت ہے۔ نہ ساون سوکھے نہ بھادوں ہرے۔ جیسے کل تھے ویسے آج ہیں۔ تمہارے ننھے کو میں نے خواب میں بیمار دیکھا تھا۔ مگر انجام بخیر تھا۔ بلکہ تمہاری اماں ایک دن گھبرائی گھبرائی آئیں تھیں اور میں نے اُن سے کہہ بھی دیا تھا اور خیر تو میں روز ہی پوچھ لیا کرتی تھی اور تم جانتی ہو میرے آنے کا کوئی موقع نہ تھا"۔

ہمراز۔ "ہاں اماں نے تمہارے خواب کا حال کہلا بھیجا۔ تب تو میرے دم میں دم آیا ورنہ اتنے دن دانہ منہ میں گیا ہو تو حرام۔ خیر ہمارے لئے تو تم نے بہتیرے خواب دیکھے یہ تو بتاؤ اپنے لئے بھی کچھ دیکھا یا نہیں ؟"

صادقہ: "میں اپنے لئے کیا دیکھتی؟"

ہمراز: "جس طرح میرے بیاہ سے پہلے مجھ کو دلھن بنا ہوا دیکھا تھا۔ کبھی اپنے تئیں بھی دیکھا یا نہیں؟"

صادقہ: "ہمراز تم اب بیاہی جا چکی ہو۔ اللہ رکھے تمہارے آگے بچے ہیں۔ تم کو مجھ سے ایسی باتیں کرنی نہیں چاہئیں۔"

ہمراز: "کیوں؟ کیا بیاہے جانے سے مجھ کو کچھ اور بھاگ لگ گئے ہیں؟ میں وہی ہمراز ہوں۔ جس کے ساتھ پہروں تم اس قسم کی باتیں کیا کرتی تھیں۔"

صادقہ: "بے شک وہی ہمراز ہو۔ مگر میری تمہاری حالت میں اب بڑا فرق ہے شاید لوگ میرا تمہارا بہت گاڑھا ربط اضطراب پسند نہیں کرتے۔ تمہارا تو کچھ نہیں بگڑے گا مگر مجھ کو منہ پر نہیں تو پیٹھ پیچھے پکی پھبتیں ضرور کہیں گے۔"

ہمراز: "اسی خیال سے میں نے چلمنیں چھوڑ دی ہیں کہ کوئی سنے نہیں۔"

صادقہ: "بوڑھی اماں ہو کر تم نے اتنی ہی عقل سیکھی۔ کوئی شبہ نہ کرتا ہو تو کرے۔"

ہمراز: "میں تمہاری اماں کے اشارے سے آئی ہوں۔ انہوں نے مجھ کو تمہارے پاس اسی غرض سے بھیجا ہے۔"

صادقہ: "نہیں معلوم اماں کو کاہے کی گھبراہٹ ہے۔ یہ میں جانتی ہوں کہ میرا روٹی کپڑا ان پر بھاری نہیں اور ساری اولاد میں مجھ کو چاہتی بھی بہت ہیں اور میں چلی جاؤں تو کوئی ان کا ہاتھ بٹانے والا نہیں۔ تو کیا میری کسی بات سے ان کو تقاضا معلوم ہوا؟"

ہمراز: "ہزار تقاضوں کا تقاضا تو تم خود ہو۔"

صادقہ: "خواہ نخواہ بھی؟ اور جو مجھ کو منظور ہی نہ ہو؟"

ہمراز: "کیا تم انوکھی عورت ہو کہ ساری عمر کنواری بیٹھی رہو گی۔ اور کوئی تم کو سچا بھی رکھے گا؟ اور تم کو انکار ہے تو منہ سے پھوٹتی کیوں نہیں کہ لوگ اپنا سبیتا کوسیں۔"

صادقہ۔ "بات یہ ہے کہ اوّل تو یہ ایسا مشکل معاملہ ہے کہ اطمینان کے ساتھ کوئی رائے قائم نہیں ہو سکتی۔ دوسرے اب میرے انکار کی بھی کیا سند ہے۔ میں انکار کرتی تو اس وقت کرتی۔ جب انکار کرنے کا موقع تھا۔ اب وہ موقع تو نکل گیا۔ انکار کروں تو میری وہی کہاوت ہو جو کسی کتاب میں میری نظر سے گذری ہے کہ ایک لومڑی چلتے پھرتے کسی باغ میں جا نکلی۔ دیکھا کہ انگور خوب پھلے ہیں۔ اور کوئی رکھوالا نہیں۔ ٹیٹوں کے تلے پہونچی تو معلوم ہوا کہ انگور تو لدے پڑے ہیں۔ مگر اونچے بہت ہیں۔ اُچھلی کودی اور بہتیرے جتن کئے۔ انگور ہاتھ نہ آئے۔ ناچار صبر کر کے چلتی ہوئی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتی جاتی تھی کہ خیر کمبخت تھے بھی کھٹّے۔"

ہمراز۔ "اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تم بیاہے جانے سے ناراض ہو۔"

صادقہ۔ "اگر ناراض نہیں تو راضی بھی نہیں۔"

ہمراز۔ "لیکن ہم تم میں جو مذکور رہا کرتے تھے وہ بھی یاد ہیں؟ تب تو تم کہا کرتی تھیں کہ میں بیاہی جاؤں گی تو یہ کروں گی اور وہ کروں گی۔"

صادقہ۔ "آدمی کے خیالات کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ تمہاری طرح مجھ کو دلہن بننے کی خوشی تھی۔ اور میرے نزدیک بیاہ اسی کا نام تھا کہ جیسی جس کی حالت ہے۔ عمدہ سے عمدہ کپڑے بدلے۔ گہنا پہنا۔ بنائے سنوارے گئے۔ دان جہیز لیا۔ سسرال سے چڑھاوے کا آیا۔ کچھ رونمائی میں ملا۔ سسرال جاتے ہیں تو وہاں خاطر مدارات۔ میکے آتے ہیں تو یہاں چوچلے۔ پھر جوں جوں عمر زیادہ ہوتی گئی۔ اور اونچ نیچ کی سمجھ آئی۔ بہت کچھ کتابوں میں پڑھا اور کسی قدر اپنی دیکھ بھال سے دریافت کیا تو بیاہ کے نام سے میرا کلیجہ تھر تھر کانپنے لگتا ہے اور اندر سے جی یہی چاہتا ہے کہ عمر بھر اسی طرح بیٹھی رہوں۔"

ہمراز۔ "سچ کہا ہے۔ بہت سیان پت بھی آدمی کو خراب کرتی ہے۔ سب تمہاری ہی طرح سوچا کریں تو دنیا کاہے کو بسے۔ آخر سب بیاہے ہی جاتے ہیں۔"

صادقہ " بیاہے تو جاتے ہیں۔ مگر ایک گھر کا نقصان دیکھاں جو تیوں میں دال نہ بٹتی ہو اور تم اپنے ہی تئیں کیوں نہیں دیکھتیں، باوجودیکہ تم کو خوش قسمتی سے میاں بھی ایسے ملے ہیں کہ ہزاروں میں ایک، پڑھے لکھے لائق، حسب نسب سے درست اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نوکر اور نوکری بھی معقول اور پھر نہ تم خوش اور تمہاری ہی نہیں ہے کہ وہ بھی تم سے خوش نہیں اور ابھی کے آمدی اور کے پیر شدی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔"

ہمراز " ہمارے یہاں تو یہ ایک ٹرابل آکر پڑا ہے کہ گھر گھر ساس نندیں ہاں لیکن ایسی آخر تو کہیں بھی نہ ہوں گی جیسی میری۔ ان کو رات دن میری بدیاں رونے کے سوائے اور کچھ کام ہی نہیں۔ وہ اپنی ذات سے ایسے بُرے نہیں مگر انہوں نے لگا لگا کے لگا لگا کے آخر مجھ کو اُن کی نظروں سے گرا دیا۔ اور اب بھی تو صبر نہیں۔"

صادقہ " کیا تم سے کچھ سختی کرتے ہیں؟"

ہمراز " نہیں۔ خدا نہ کرے سختی تو نہیں کرتے۔ مگر میری طرف اُن کا رُخ نہیں کبھی بہ ضرورت ایک آدھی بات کر لی۔ ورنہ کوئی پہچان نہیں سکتا کہ یہ میاں بیوی ہیں۔"

صادقہ " کیا ہوا بعض آدمی کم سخن بھی ہوتے ہیں۔"

ہمراز " اے ہے یہی تو غضب ہے! بڑے باتونی بڑے خوش مزاج۔ مگر مجھ سے نہیں اوروں سے ایک ہمارے رشتے کی خالہ ہوتی ہیں۔ ہمارے گھر سے دیوار بیچ ان کا گھر ہے ہم نے تو اُن کو ابھی کے دیکھا۔ خدا جانے کتنے برسوں میں حج کر کے آئی ہیں۔ اور بغداد اور بیت المقدس اور نہیں معلوم کہاں کہاں گئی تھیں۔ اُن کو بُلا بُلا بھیجتے ہیں اور پہر دل اُن سے اِدھر اُدھر کے حالات پوچھا کرتے ہیں۔ یا ہمارے ماموں زاد بھائی میاں آگاہ جب کبھی آ نکلتے ہیں تو پھر ان دونوں کی باتیں سنو۔ دونوں میں سے کسی کے ہاتھ میں اخبار ہوتا ہے۔ اور روم اور روس اور خدا تمہارا بھلا کرے کابل اور کون کون ملکوں کے

لہ ہمراز نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کیا کیونکہ ہندوستان میں بی بی شوہر کا نام نہیں لیا کرتی۔ ۱۲

جھگڑے پیش ہوتے ہیں۔ میں تو کچھ سمجھتی بوجھتی نہیں۔ مگر نہ تو اُن کا جی اٹھنے کو چاہتا ہے اور نہ یہ اُن کا پنڈ چھوڑتے ہیں تو کیوں کہوں کہ کم سخن ہیں۔"

صادقہ لم کو پہنچ تو گئی مگر ہمراز کی دل شکنی کے خیال سے کچھ کہہ نہ سکی اور پوچھا تو یہ پوچھا کہ "تم نے کبھی موقع پا کر اپنے میاں سے اس کا سبب بھی دریافت کیا؟"

ہمراز۔ "ایک بار! بیسیوں دفعہ۔ جب پوچھا یہی کہہ دیا کہ میں جس دنیا میں ہوں۔ تم کو اس کی ہوا ہی نہیں لگی۔ اور کھانے پہننے کی باتوں سے میرا جی الجھتا ہے کیونکہ یہ تمہارے کرنے کے کام ہیں نہ ان میں مجھ کو درک اور نہ دخل دینے کی ضرورت۔ میرا بہت سا وقت صرف ہوتا ہے کچہری میں۔ تم کو اس سے کچھ مناسبت نہیں۔ میں ہر چند سوچتا ہوں تم سے کرنے کی کوئی بات ہی سمجھ میں نہیں آتی، سو ہوا اب تو ہار کر میں نے بھی اس کا خیال چھوڑ دیا۔ وہ کوارپنے کی بے فکریاں جو کبھی یاد آجاتی ہیں تو ایک سناٹا سا گذر جاتا ہے۔"

صادقہ۔ "اور پھر میں کہتی ہوں تم سینکڑوں ہزاروں میں اچھی ہو۔ میں نے تو بڑی دور تک خیال دوڑائے ہیں۔ وہ امن چین وہ تسلی وہ خوشی جو بیاہ کا مقصود ہے کسی ایک آدھ ہی کو نصیب ہوتی ہوگی اور اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے ہاں کا بیاہ اندھے کا نشانہ ہے۔ لگا تو تیر، نہیں خالی تکا۔ کیا مرد کیا عورت ہر ایک کا مزاج الگ، ہر ایک کی طبیعت جدا، ہر ایک کی خو خصلت علیحدہ۔ دو آدمی اجنبی محض۔ جان نہیں پہچان نہیں ملاقات نہیں صاحب سلامت نہیں۔ اوپر والوں کی تجویز سے ملا دیئے جاتے ہیں۔ اب وہ شیر و شکر کا سا ملنا ملیں تو اُن کی تقدیر اور تیل اور پانی کا سا ملنا ملیں تو ان کی تقدیر۔ اور چونکہ مرد کا پلہ زبردست ہے۔ موافقت نہ آئی تو عورت زندہ درگور ہو چکی۔ یہی سوچ سمجھ کر میرا جی دھکڑ پکڑ کرتا ہے۔ اور واقع میں میں کوئی انوکھی عورت نہیں ہوں جو دنیا جہان کی بیٹیوں کا دستور وہ میرا دستور۔ مجھ کو ہرگز امید نہیں کہ ساری عمر بھی اطمینان کے ساتھ اس کا فیصلہ کر سکوں گی۔ غرض اندر دل سے تو میں بیاہ سے راضی نہیں۔ مگر جانتی ہوں کہ سب اس کے

درپے ہیں تو انکار بھی نہیں کر سکتی۔"

ہمراز:۔ "پھر آخر میں تمہاری اماں سے کیا جا کر کہوں ؟"

صادقہ:۔ "ان سے تو اتنی ہی بات کہہ دینا کہ خواب تو میں نے کوئی دیکھا دکھایا نہیں اور نہ ہونا ہوتا تو مجھ کو ضرور دکھائی دیتا۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہوگا تو سہی مگر دیر سے۔"

چھٹی فصل

صادقہ کے بیاہ کی چھیڑ چھاڑ

چھوٹی بہنوں کے بیاہ سے پہلے پہلے تو صادقہ کے بارے میں بڑی گرما گرمی رہی جب سے یہ دونوں بیاہی گئیں نہیں معلوم ان کے شغل میں لگ گئے یا ناامید ہو کر بیٹھ رہے۔ غرض مدتوں سے گھر میں صادقہ کے بیاہ برات کا کچھ چرچا سننے میں نہیں آتا تھا لیکن ماں کے تو تلوؤں سے لگی تھی۔ وہ پانچوں وقت نماز کے بعد دعا مانگا کرتی تھی۔ برسوں اس کے لئے اُس نے حصن حصین پڑھی۔ اور عمل تو جس نے جو بتایا کیسا ہی مشکل کا ہو اس کو کرنا ضرور۔ بارے بخارا کی طرف کے کوئی بزرگ سیاحت کے طور پر شہر میں آنکلے تھے۔ اتفاق سے اسی محلے کی مسجد میں آکر ٹھیرے۔ معمول کے مطابق صادقہ کے یہاں سے دونوں وقت کھانا آتا رہا۔ وہ بیمار ہو گئے۔ ان لوگوں حسبتہ ﷲ ایسی خبر گیری اور خدمت کی کہ جو خبر گیری اور خدمت کا حق ہے۔ دونوں وقت حکیم کو حال کہلا بھیجنا۔ نسخہ منگوانا۔ بنانا۔ حکیم نے جو کچھ کھانے کو بتایا ہے۔ وقت پر طیار کرا دینا۔ اتنے تعلق سے ان بزرگ کو اس گھر کے بعض حالات بھی معلوم ہوئے۔ اور اُن میں سے صادقہ کا معاملہ بھی تھا۔ آخر ان بزرگ نے کہلا بھیجا کہ انشاءاللہ میں بھی دعا کروں گا اور تم میں سے کسی سے ہو سکے تو نماز تہجد کے بعد تنہائی میں دو نفلیں تعدیل ارکان کے ساتھ پڑھ کر

اول آخر سات سات بار درود۔ اکھتر دفعہ اس آیت شریف کا ورد کرو اور پھر خشوع وخضوع کے ساتھ عرض حاجت۔ آیت یہ ہے۔ ومن ایاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ۔ ان بزرگ نے یہ بھی فرمایا کہ اس عمل کی حد تو ایک چلّے کی ہے۔ مگر مجھ کو خدا کی ذات سے توقع ہے کہ ہفتے کے اندر ہی اندر بشارت ہو گی۔

عمل کو شروع کئے ہوئے تیسری رات تھی کہ اُدھر صادقہ کی ماں دعا مانگ رہی تھی اور ادھر صادقہ کو خواب دکھائی دے رہا تھا۔ دیکھتی کیا ہے کہ جیسے اس کے والد چوکھٹ میں ایک تصویر لئے کھڑے ہیں۔ اور اس کو دکھا رہے ہیں اور وہ تصویر کسی انگریز کی سی ہے۔ صادقہ نے اجنبی مرد کی صورت دیکھتے ہی بے اختیار اپنا منہ چھپا لیا تو اس کے والد کہتے ہیں۔ بیٹا یہ تو تصویر ہے اور تصویر بھی ٹھیک نہیں۔ دیکھو اصلی صورت یہ ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے اس تصویر کے نیچے سے اور تصویر نکالی تو وہ ایک مسلمان کی تھی مگر دونوں تصویریں تھیں ایک ہی شخص کی۔ صادقہ کو تو اپنے خوابوں کی تعبیر کی مہارت تھی ہی۔ سمجھ گئی کہ بیاہ کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ کوئی اور نادان عورت ہوتی مارے خوشی کے اچھل پڑتی۔ مگر صادقہ کو ان ذمہ داریوں کا خیال آگیا جو بیاہ کے پیچھے اس پر عائد ہوں گی اور وہ ابھی سے سوچ رہی گئی کہ اس چہرے مہرے کا شخص کس مزاج کا ہوگا اور اس کو رضامند رکھنے کے لئے مجھ کو کیا کرنا پڑے گا۔ قیافے کے سوائے تحقیقات کا اور کوئی ذریعہ تھا نہیں۔ تو اس نے عقل دوڑائی کہ یہ مرد درمیانہ قد سے نکلتا ہوا ہے۔ اور اس کی گردن بھی لمبی ہے تو یہ برتری کی دلیل ہے۔ اور ضرور ہے کہ ایسا شخص نام ونمود کا طلبگار ہوگا۔ اس کا سر بڑا ہے یعنی دانشمند ہے۔ پیشانی اونچی اور فراخ ہے تو خوش مزاج

لہ اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تم ہی میں سے تمہارے لئے بیبیاں پیدا کیں کہ تم ان کی طرف رغبت کرو اور تم میں اور ان میں دوستی اور مہربانی قائم کی۔ ۱۲

ہوگا۔ ماتھا ابھرا ہوا ہے۔ ذہن کا تیز ہے۔ آنکھیں روشن اور بڑی ہیں۔ بلند نظر اور سیر چشم ہے۔ ہونٹ پتلے اور بچے ہیں۔ ارادے کا پکا اور ہٹ کا پورا ہے۔ ناک کسی قدر موٹی اور نتھنے چوڑے ہیں۔ خوددار اور غصیلا ہے۔ اور کیا عجب ہے مغرور ہو۔ کنپٹیاں الگ دکھ پڑتی ہیں۔ کمانے کے خوب ڈھنگ آتے ہوں گے۔ سینہ چوڑا ہے تو تندرست اور قوی دل ہے۔

یہ روداد تو کچھ بری نہ تھی۔ بلکہ ان صفتوں کے آدمی میسّر نہیں آتے۔ مگر کچھ یہ سمجھ میں نہ آیا کہ دو تصویریں کیسی۔ چند روز کا وقفہ دے کر پھر صادقہ نے دیکھا کہ باپ نے وہی دو تصویریں اس کے حوالے کیں کہ لو تم اپنے پاس رکھو مگر بہت احتیاط سے رکھنا۔ اس کا مطلب بھی صاف تھا۔ تیسری بار کسی کو خواب میں پکار کر کہتے ہوئے سُنا کہ وہ تصویریں تمہارے ہمنام کی ہیں۔ "صاد" نے غور تو کیا، مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس سے کیا مراد ہے؟

آج جمعرات کی رات کو صبح ہوتے ہوتے صادقہ نے یہ آخیر کا خواب دیکھا اور اگلے ہی دن کوئی چار گھڑی دن چڑھتے چڑھتے ڈاکیے نے آواز دی کہ "رجسٹری خط لے جاؤ"۔ دیکھیں تو ایک بڑا سا راعمدہ انگریزی کاغذ کا لفافہ صادقہ کے والد میر خسرو کے نام بنارس سے صادق نامی کسی شخص نے ایسے اہتمام سے بھیجا ہے کہ لفافے کی درزوں پر ایک ایک انچ کے فاصلے سے لاکھ کی مہریں ہیں۔ مکتوب الیہ کا نام اور پتہ انگریزی فارسی دونوں خطوں میں ایسا صاف لکھا ہوا تھا کہ اس میں کسی طرح کا شک و شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ لفافہ لے تو لیا مگر یہ معمولی طور کا لفافہ نہ تھا۔ کسی کا ذہن منتقل نہ ہوتا تھا کہ ہمارے متعارفین میں سے بنارس میں اس نام کا کون شخص ہے اور اس کو ایسا لفافہ رجسٹری بھیجنے کی کیا ضرورت پڑی ہوگی۔ سردی کا تھا موسم اور ابھی کچھ ایسا دن بھی نہ نہیں چڑھا تھا۔ سب لوگ ایک ہی دالان میں جمع تھے۔ ازاں جملہ صادقہ بھی۔ یہ تو سمجھ گئی کہ ہمنام کی یہ تعبیر ہے۔ میر صاحب نے تھوڑی دیر تامل کر کے آخر لفافے کو کھولا۔ اندر سے جز کا جز ایک خط نکلا۔ چند سطریں بھی پڑھتے نہیں پائے تھے کہ بی بی نے پوچھا "آخر کون ہیں؟ کیا لکھتے ہیں؟"

میاں۔ ”ابھی اس کے پوچھنے کا کیا موقع ہے۔ ذرا پڑھ تو لینے دو۔“

بی بی۔ ”بس میرا بولنا تو تم کو زہر لگتا ہے۔“

میاں۔ ”تم بات ہی ایسی کرتی ہو کہ نہ رکھی جائے اور نہ اٹھائی جائے۔ اول تو تم کو میری ہر ایک بات کی کرید ہی کرنی کیا ضرور ہے۔ اور پھر صریحاً دیکھ رہی ہو کہ کتاب کی کتاب میرے ہاتھ میں ہے۔ پڑھنا شروع کیا ہے کہ تم نے بیچ میں ایک پتھر کھینچ مارا۔ مجھ کو خود معلوم نہیں تو جواب کیا دوں؟ ابھی زردے کا عمل پورا نہیں ہوا۔ اوپر تلے چار پانچ پان کھاؤ گی تو تمہارا مزاج درست ہوگا۔“

بی بی۔ ”آپ سارے دن حقہ بیٹھے گڑگڑائیں۔ تو کچھ نہیں۔ میرے زردے کا یہ وقت طعنہ تو اب زردہ کھاؤں تو حرام کھاؤں۔ مُردار کھاؤں۔“ یہ کہہ کر گلوری جو تھوڑی دیر ہوئی منہ میں رکھی تھی۔ اور ابھی اس کے چبانے کی بھی نوبت نہیں آئی تھی۔ اگالدان اٹھا کر تھوک دی۔ میر صاحب بیچارے خط ہاتھ میں لئے دُم دبائے چلتے ہوئے۔ اور اگر ایک لمحہ بھی بیٹھے رہیں تو دونوں میں ایسی ہی لڑائی ہو جیسی ہر روز ہوا کرتی تھی۔ باہر مردانے میں اطمینان سے بیٹھ کر خط پڑھا تو لکھا تھا۔

ساتویں فصل

سید صادق کی طرف سے شادی کا رقعہ، کہنے کو رقعہ اور واقع میں کتاب اور اسی میں علیگڈھ کالج کا مختصر حال اور نکاح کے بارے میں لوگوں کی رائیں

جناب من۔ بندے کا نام تو آپ کو لفافے ہی سے معلوم ہو گیا ہوگا میں اس پر اتنا اور زیادہ کرنا چاہتا ہوں کہ سنہ ۱۸۹ء کے بی اے کے امتحان میں جو شخص کلکتہ یونیورسٹی میں اول رہا وہ یہی خاکسار ہے جس نے علیگڈھ کالج میں تعلیم پائی ہے اور اب بھی اسی کالج

کی ایم۔اے کلاس میں پڑھتا ہوں۔ بندے کا وطن آبائی توفیض آباد ہے مگر قضا وقدر فلک تنکوہ کے توسل کی وجہ سے والد نے بنارس میں رہنا اختیار کیا۔ اور چونکہ کچھ جائداد از قسم زمینداری وغیرہ بھی پیدا کر لی ہے۔ اب ہم یہیں کے ہو گئے ہیں۔ ہمارا نسب نامہ محفوظ ہے۔ اور میں اُس سے آپ کو اپنے سید الطرفین ہونے کا یقین دلا سکتا ہوں۔ اور اس کا بھی کہ بزرگوں میں علماء اور مشائخ اور حکام وقت مشاہیر گذرے ہیں۔ ع

لیکن بنوہ وصف اضافی ہُنر ذات

میں آپ اپنا معرف ہونا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ مجھ کو آپ کے ایک بڑے واقف کار سے آپ کے ذاتی اور خانگی حالات بالتفصیل سُننے کا اتفاق ہُوا ہے۔ اور اُس سے جو خیلل میرے دل میں آپ کی طرف سے پیدا ہوا اُسی نے مجھ کو اس عریضے کے لکھنے اور پیش کرنے کی جرأت بھی دلائی۔ گو آپ انگریزی نہیں جانتے لیکن مجھ کو بہ تحقیق دریافت ہوا ہے کہ آپ کا مزاج بے تعصب واقع ہوا ہے۔ طبیعت منصف، ذہن رسا، رائے صائب عقل مصلحت اندیش، خیال آزاد۔ افسوس ہے کہ لوگوں کو یہ بات عام طور پر معلوم نہیں کہ ہمارے کالج میں کاہے کی خصوصیت ہے۔ مجھ کو اس بات کے مان لینے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ پڑھائی کے اعتبار سے ہم میں کوئی برتری نہیں اور چونکہ سرکار نے تعلیم اپنے اختیار میں کر رکھی ہے وہ لیاقت کے درجے ٹھیراتی اور انہی کے مطابق بی۔اے وغیرہ علمی خطاب دیتی تو ہم اس میں کمتی ردو بدل کر نہیں سکتے۔ ہم سب سمجھتے ہیں کہ یہ تعلیم ہم کو کچھ ایسی زیادہ مفید نہیں لیکن تا وقتیکہ گورنمنٹ اپنا کورس نہ بدلے ہم کو چارو ناچار اسی کی پیروی کرنی ہے۔ غرض میں اپنی اسی بات کا پھر اعادہ کرتا ہوں کہ پڑھائی کے اعتبار سے ہم میں کوئی برتری نہیں۔ اور یہ جو نماز روزے کی تاکید اور دینیات کے درس کا چرچا آپ سنتے ہیں۔ تو چند دانے ہیں جو مسلمانوں کو دام تعلیم میں لانے کے لئے بکھیر دیئے گئے ہیں۔ پادریوں کا مقصود اصلی ہے اپنے دین کی اشاعت اور ہمارا دنیاوی تعلیم۔ وہاں لوگوں کو دین عیسوی سے گریز ہے اور ہمارے ہاں

متعلق انگریزی تعلیم سے۔ تو پادریوں نے دفع وحشت کے لئے دنیاوی تعلیم کو آڑ بنایا ہے اور ہم نے دینیات کو۔ ہمارے کالج میں جو خصوصیت ہے صرف دو باتوں کی ہے۔ ایک تو ہمارے یہاں کثرت سے ایسے طالب علم ہیں جو مدرسے ہی میں پڑھتے۔ مدرسے ہی میں کھاتے، مدرسے ہی میں سوتے، مدرسے ہی میں کھیلتے اور رات دن مدرسے ہی میں رہتے ہیں۔ اور گھروں کی بے تمیزیاں لو، سوسائٹی کی بیہودگیاں۔ بزرگوں کی ناز برداریاں ان کی طبیعتوں پر بُرا اثر کرنے نہیں پاتیں۔ دوسرے پڑھنے کے علاوہ لڑکوں کو دنیا کے معاملات میں غور کرنا اور دنیا میں رہنے کا سلیقہ سکھلایا یعنی طالب العلموں کو آئندہ کی زندگی کے لئے تیار کیا جاتا ہے سو اگر مجھ کو بالغرض کسی کا چال چلن دریافت کرنے کی ضرورت ہو اور وہ شاید ایک درجن عمدہ سے عمدہ سرٹیفکیٹ مجھ کو دکھا سکے تو میں سچ عرض کرتا ہوں کہ میرا دل اس کی طرف سے ہرگز ایسا مطمئن نہیں ہوگا جیسا صرف ایک اتنی بات سے کہ وہ میری طرح علیگڈھ کالج کا پڑھا ہو۔ اگر آپ نے علیگڈھ کالج کے کچھ حالات معلوم کئے ہیں اور آپ جیسے بیدار مغز روشن خیال آدمی سے تعجب ہے کہ نہ کئے ہوں تو آپ نے کالج کی رپورٹوں میں، علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں ضرور ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ ہم بورڈر کیوں کر اپنے کھانے اور پہننے اور کھیلنے اور کل ضرورتوں کا خود انتظام کرتے، آپس میں کیسے مباحثے رہتے اور ایک دوسرے کے دُکھ درد میں کس طرح شریک ہو جاتے ہیں۔ ہم لوگوں میں کئی قسم کی کمیٹیاں قائم ہیں! از انجملہ ایک کمیٹی الاصلاح ہے۔ اس کے تحت میں ایک سب کمیٹی ہے جس میں صرف بیس برس سے زیادہ عمر کا طالب علم شریک ہو سکتا ہے۔ اور مجھ کو اس کمیٹی کے سکرٹری ہونے کی عزت بخشی گئی ہے۔ اس کمیٹی کی کارروائی شب کے وقت دروازے بند کر کے ہوتی ہے۔ اور ممبروں کے سوائے کسی کو کمیٹی میں آنے کی اجازت نہیں۔ اس کمیٹی کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص نکاح کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرے اور اس پر رد و قدح ہو۔ تا کہ جو شخص ایسا تعلق کرنا چاہے وہ اس کے نفع و نقصان اور لوازم و نتائج کو پہلے سے سوچ چکا ہو۔

مدت تک میری یہ رائے رہی کہ میں تجرد میں اپنی زندگی بسر کروں گا جس دن میں نے کمیٹی میں اپنی یہ رائے ظاہر کی اور وہ مضمون جو لکھ کر لے گیا تھا پڑھ کر سنایا۔ ممبروں کا ایک گروہ کا گروہ اس کی تردید کو کھڑا ہو گیا۔ اور مہینوں اس پر بڑی سرگرمی اور جوش کے ساتھ بحث ہوتی رہی۔ میں نے جن باتوں پر زور دیا تھا۔ وہ یہ تھیں کہ اس تعلق کا مدار دلی رغبت اور محبت پر ہے۔ بلکہ رغبت اور محبت کی جگہ لفظ تعشق استعمال کیا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ جو رغبت و محبت کی مثال میرے نزدیک درخت کی سی ہے کہ ایک دم سے سموچے کا سموچا زمین سے نہیں نکل کھڑا ہوتا۔ بلکہ اس کا بیج بویا جاتا ہے۔ پھر وہ جڑ پکڑتا ہے، پھر پھوٹتا ہے پھر اس میں کونپل نکلتی ہے۔ پھر پتے لگتے ہیں، پھر پھیلتا اور بڑھتا ہے۔ پھر پھولتا اور پھلتا ہے بعینہ یہی حال ہے رغبت اور محبت کا۔ دو طبقوں میں ایک طرح کی خلقی مناسبت ہوتی ہے پھر ساتھ رہنے سے انس پیدا ہوتا ہے۔ اُنس سے اُلفت۔ اُلفت سے رغبت اور آخرکار رغبت سے محبت پھر آگے محبت کے مدارج ہیں۔ تو جن دو شخصوں نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں و ایک دوسرے کے پاس نہیں بیٹھے، ساتھ نہیں رہے، ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔ ایک دوسرے کے شریک رنج و راحت نہیں ہوئے۔ کیونکر ایک کو ایک کی محبت ہو سکتی ہے بس ہمارے یہاں کا تعلق زناشوئی ایک طرح کا جوا ہے۔ لگ جیتنے بھی ہیں اور ہارتے بھی ہیں۔ اور چوں کہ محبت ایک کے کرنے سے نہیں ہوتی۔ جیتنے کا احتمال ایک ہے۔ تو ہارنے کے دو۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر خانہ داریوں میں فساد سنے جاتے ہیں۔ تو میں نہیں سمجھتا کہ انسان کیوں یہ مصیبت مول لے۔ ہم مسلمانوں میں سے دولت نکل گئی ہے اور نکلتی چلی جاتی ہے، اور دولت کے کمانے کے جو طریقے ہیں اُن سے ہم کو گریز ہے اور مسلمانوں کی طرف سے میں بالکل نا امید ہوں اور اسی میں ان کی بہتری سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ جہاں تک ممکن ہو اپنے شمار کو بڑھنے نہ دیں کیونکہ شمار کے ساتھ مفلسی اور خواری بڑھتی جائے گی۔ ہوں[1]، اور ذلیل و محتاج ہوں تو ہوں ہی کیوں؟ بے شک میرے اکیلے کی کون سنتا ہے اور نہ صرف میری اکیلے

---

[1] پیدا ہوں اور ذلالت کی زندگی بسر کریں، تو پھر پیدا ہی کیوں ہوں؟

کی بلکہ مجھ جیسے سینکڑوں کی ہزاروں کی لیکن مسلمانوں کے فائدے کی جو بات سوجھ پڑے اس کے ظاہر کئے بدون بھی تو نہیں رہا جاتا۔ تھوڑا سا اثر ہوگا۔ تو بھی بہت ہے۔ اس معاملہ میں سب سے زیادہ مشکل ہم لوگوں کی ہے جنہوں نے انگریزی پڑھی ہے یا پڑھ رہے ہیں۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ انگریزی پڑھنے سے معلومات میں وسعت اور خیالات میں آزادی آجاتی ہے اور ایک خاص طرح کا مذاق پیدا ہوتا ہے۔ ہندوستانیوں (پرانے خیالات کے ہندوستانیوں) کے مذاق سے بالکل جدا اور ممتاز بلکہ متبائن۔ اختلاف رائے، اختلاف وضع، اختلاف خیالات کے ہوتے دوسرے تعلقات تو خیر بُری طرح یا بھلی طرح نبھ بھی سکتے ہیں لیکن یہ خاص تعلق، یہ تمام تعلقات سے قوی تر تعلق۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایک دن بھی خوش اسلوبی سے نبھ سکتا ہے۔ جو شخص اپنے برابر والوں کو بلکہ اپنے سے بڑوں کو صرف پرانے خیالات کی وجہ سے منہ سے نہ بھی کہے تو دل میں ضرور حقیر سمجھے، کیوں کر مانوس ہو جائے گا۔ اُس عورت سے جس کو اس کے سے خیالات چھو بھی نہیں گئے؟ کیا وہ خوش رہ سکتا ہے اس سے کہ جب گھر میں آئے پکانے کھانے اور سینے پرونے کے سوائے کوئی بات نہ سُنے؟ کیا وہ خوش رہ سکتا ہے اس سے کہ جب دو عورتیں مل کر بیٹھیں اس کی بدی، اس کی غیبت کے علاوہ ان میں کوئی مذکور نہ ہو؟ کیا وہ خوش رہ سکتا ہے اس سے کہ جن باتوں میں اس کو دلچسپی ہے گھر میں کسی کو اس سے لگاؤ نہیں؟ کیا یہ خوش رہ سکتا ہے اس سے کہ جتنی دیر گھر میں رہے اکیلا پڑا ہوا کتاب دیکھا کرے یا اخبار پڑھا کرے۔ اس لئے کہ گھر والی کے ساتھ گفتگو کی سلسلہ جنبانی کرنے کو یہ کوئی مطلب نہیں پاتا؟ کیا یہ خوش رہ سکتا ہے۔ اس سے کہ اعتبار سے بی بی کو ایک انچ ابھار نہیں سکتا اور اس کے پست خیالات میں شریک ہونے کے لئے اپنے تئیں گرا نہیں سکتا؟ کیا یہ خوش رہ سکتا ہے؟ اس سے کہ سارے گھر کی روزی پیدا کرنے کے لئے یہ اکیلا دن بھر مصیبت جھیلے اور رات کو تھکا ماندہ گھر آئے تو کوئی آشنا نہ ہو کہ اُس کو صلاح بتائے یا زبانی سہارا لگائے؟ کیا یہ خوش رہ سکتا ہے۔ اس سے کہ پردیس

میں ہو تو صرف اس وجہ سے کہ بی بی پڑھی لکھی نہیں، نہ اپنی کہہ سکے اور نہ اس کی سن سکے؟ کیا یہ خوش رہ سکتا ہے۔ اس سے کہ ماں کی بے تدبیریوں سے اس کے بچے ہلاک ہوں، وہ پڑیں بیمار اور دوا کے عوض ان کو پلائے جائیں تعویذ، باندھے جائیں گنڈے، اتارے جائیں ٹونے، مانی جائیں منتیں؟ کیا یہ خوش رہ سکتا ہے اس سے کہ اولاد کی ابتدائی تربیت میں ایسی غلطیاں کی جائیں کہ ساری عمر ان کی اصلاح نہ ہو سکے، الغرض ان وجوہ سے اپنی نسبت اس وقت تک میرا ایسا خیال ہے کہ میں شادی نہیں کروں گا۔ اور میں اس کمیٹی کے ممبروں کو بھی یہی رائے دیتا ہوں۔ کیونکہ "آنچہ بر خود نہ پسندی بر دیگرے مپسند"۔

میں تو اتنا کہہ کر بیٹھ گیا۔ اور پھر جو اس پر چاروں طرف سے پوچھاڑ ہونی شروع ہوئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے مضمون کیا پڑھا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ کوئی شخص نہ تھا جس کے منہ میں ایک یا دو اعتراض نہ ہوں۔ ان میں سے بعض بودے اور پھسپھسے بھی تھے لیکن میں نے کمیٹی کے سکرٹری ہونے کی حیثیت سے روداد میں لکھنے کے لئے سب کو یکجا کیا تو مجموعہ ایسا قوی معلوم ہوا کہ مجھ کو اپنی رائے بدل دینی پڑی۔ اعتراضات کا خلاصہ یہ تھا کہ "ہم کو اپنے دوست سید صادق کی رائے سے ہرگز اتفاق نہیں۔ ان کی رائے مدلل ہے مگر غلطی اور مبالغے سے خالی نہیں۔ انہوں نے اس اصول کے [illegible] دینے میں بڑی مگر وہ غلطی کی ہے کہ تعلق زناشوئی کو ہونا چاہیئے نتیجہ محبت یعنی طرفین میں پہلے رابطۂ محبت قائم ہولے۔ اس کے بعد یہ تعلق ہو۔ ہم بالکل اس کے برخلاف سمجھتے ہیں۔ اور ہمارا خیال ہے کہ محبت پیدا ہوتی ہے تعلق زناشوئی کے بعد بیشک دو اجنبی جن میں مطلق سابقہ معرفت نہیں ایک دوسرے سے ملا دیئے جاتے ہیں۔ ان میں خدائے تعالیٰ نے ایک دوسرے کی طرف رغبت کرنے کا مادہ ودیعت رکھا ہے۔ نکاح سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مرد اور عورت کو ایک دوسرے کی طرف رغبت کرنے کا موقع دیا جائے، چنانچہ موقع پاکر وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف رغبت کرتے ہیں

جس کو تخم محبت کہنا چاہیئے۔ اور آخر کار اکثر ان میں محبت پیدا ہو بھی جاتی ہے۔ اور جتنی خانہ داریاں ہیں سب مظاہر اُسی محبت کے۔ ہمارے دوست سید صادق نے محبت کے پیچ کو بہت زور سے کس دیا ہے۔ اور وہ اُس موانست کو جو تعشق سے کم ہو محبت نہیں کہنا چاہتے۔ یہ بھی ان کی غلطی ہے تعشق کیا چیز ہے؟ بے قرار ہی کی محبت اور اس درجے کی محبت کو عقلاء اور حکماء اور اطباء اور صلحاء ان میں سے کسی ہے تے بھی جائز نہیں رکھا ایسی ہی محبت یعنی شیفتگی ہے جس کو پیغمبر صاحب صلوٰت اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین فرماتے ہیں۔ حب الدنیا راس کل خطیئۃ (دنیا کی محبت اعلیٰ درجہ کا گناہ ہے) ایسی ہی محبت یعنی شیفتگی ہے۔ جس کو اطباء نوع من الجنون (ایک طرح کی دیوانگی) لکھتے ہیں۔ انتظام دنیا کے لئے ایسی گاڑھی محبت جو عشق اور شیفتگی کی حد کو پہنچ گئی ہو درکار بھی نہیں۔ اور کیوں اس کو خانہ داریوں میں ڈھونڈا جائے جتنی معمولی طور کی محبت سے خانہ داریاں چلتی ہیں اور چل سکتی ہیں عموماً ہر گھر میں پائی جاتی ہیں۔ اس سے کہ میاں بی بی کسی وقت کسی بات پر دو دو کر لیتے ہیں، نہیں کہہ سکتے کہ ان میں محبت نہیں، وہ صبح کو روٹھتے اور شام کو منتے، دن کو لڑتے اور رات کو پیار اخلاص کرتے ہیں۔ ہمارے دوست سید صادق عجیب حکمت سے پردے کی بحث کو اڑا گئے ہیں لیکن جو ان کا اصل مطلب ہے وہ ان کی تمام تقریر سے ٹپکتا رہتا ہے وہ حقیقت میں عورتوں کے پردے کے مخالف معلوم ہوتے ہیں۔ کیوں کہ یہی پردہ ہے جو تعلق نکاح کے بدون مرد اور عورت میں اختلاط کا مانع ہے۔ لیکن بے پردگی سے جو شرمناک نتیجے یورپ اور امریکہ میں پیدا ہوئے۔ ہمیشہ کے لئے وہ ایک غیور اور منصف مزاج آدمی کی آنکھیں نیچی رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ شاید سو میں نناوے ہوں گے جو بے پردگی کی رسم بد کو آج اٹھا دیں اگر ان کا بس چلے۔ علاوہ بریں وہ محبت جس کو ہمارے دوست نے اس تعلق کے لئے ضروری سمجھا ہے اور وہ ضروری ہے بھی پردہ داری کی صورت میں زیادہ محفوظ رہ سکتی ہے، کیونکہ عورت نہ اجنبی مرد

دیکھتی اور نہ اس کی نیت ڈانواڈول ہو سکتی، پردہ اس کو سکھاتا ہے کہ وہ صرف اپنے شوہر کے لئے ہے اور بس۔ پردے کی غرض و غایت کیا ہے؟ عورت کی پاک دامنی اور ناموس کی حفاظت۔ لیکن جن لوگوں میں پردے کا دستور نہیں وہ بھی اپنی عورتوں کی پاک دامنی اور ناموس کی ویسی ہی حفاظت کرنی چاہتے ہیں جیسی ہم۔ ہم میں اُن میں اگر فرق ہے تو اتنا ہی کہ مثلاً ایک شخص نے خزانے کے صندوق پر تالا لگایا۔ دوسرے نے تالا بھی لگایا اور صندوق کو ایسی جگہ رکھا کہ چور کی نظر نہ پڑے۔ ہم پوچھتے ہیں، ہم اپنے دوست کے منہ سے سننا چاہتے ہیں، دونوں میں خزانے کی طرف سے زیادہ مطمئن کون؟ بیشک وہی جس نے تالا بھی لگایا۔ اور صندوق کو ایسی جگہ رکھا کہ چور کی نظر نہ پڑے۔ ہم اس کو مانتے ہیں کہ انگریزنیں ہماری عورتوں سے بہت زیادہ لائق ہیں۔ انتظام خانہ داری، شوہروں کے خوش رکھنے میں، اولاد کی تربیت و تعلیم میں، بلکہ علمی لیاقت میں بھی لیکن نہ بے پردگی کی وجہ سے بلکہ عام سوسائٹی کی شائستگی اور تہذیب اور ترقی کی وجہ سے ہم میں بھی لائق مردوں کی ماں بہنیں جورو ان سے زیادہ لائق ہوتی ہیں۔ دین داروں کی دیندار، نیک کرداروں کی نیک کردار، بھلوں کی بھلی۔ بُروں کی بُری۔ شریفوں کی شریف۔ پاجیوں کی پاجی۔ یوں تو جیسی دو آنکھیں مردوں کی، ویسی عورتوں کی۔ جیسے دو کان مردوں کے ویسے عورتوں کے۔ جیسے قوی دماغ مردوں کے ویسے عورتوں کے لیکن پھر بھی خدا نے مرد اور عورت میں بڑا فرق رکھا ہے۔ عورتیں کتنے ہی ہاتھ پاؤں پٹیں، کتنا ہی غل غپاڑا مچائیں وہ فرق مٹ نہیں سکتا۔ عورت کی حالت کہے دیتی ہے کہ وہ گھر کا کام کاج دیکھنے بھالنے بچوں کے پالنے کے سوائے اور کچھ کر نہیں سکتی۔ اور کرے گی تو کیا؟ کرنا چاہے اور کرنے کا قصد کرے تو ہم سمجھیں گے کہ مردوں کا منہ چڑاتی ہے۔ اور ہم مردوں میں اس سے زیادہ اس کی قدر نہیں ہوگی جیسی عورتوں میں ہیجڑے کی۔ شور و شغب تو بہت کچھ سنتے ہیں۔ مگر یورپ اور امریکہ میں بھی عورتوں نے آزادی پاکر اس سے زیادہ کونسا کمال حاصل کرلیا ہے

کہ میڈم اُمک گاتی خوب ہے۔ میڈم ڈھمک پیانو کے بجانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی، میڈم فلاں تھیٹر میں سوانگ ایسا بھرتی ہے کہ نقل کو اصل کر دکھاتی ہے۔ یا بڑی فضیلت پناہ لیاقت دستگاہ ہوئیں تو ناول یعنی قصے کہانی کے ڈھکوسلے ہانکنے لگیں، اور قصے کہانیاں بھی گندے ناپاک ع "می ترا دو چہ گنم انچہ درآوند من است۔" کسی نے وزارت کی؟ کوئی سپہ سالار ہوئی؟ مقنن بنی؟ اور یوں سینکڑوں برس میں دو چار نام ونمود کی ہوگئیں تو ایسی آذان دینے والی مرغیاں کبھی ہمارے ڈربوں میں سے بھی نکل آتی ہیں۔ اب رہی ہمارے دوست سید صادق کی یہ تجویز کہ مسلمان بے دولت ہیں، اور دولت کے کمانے کے ہنر اُن کو سیکھنے منظور نہیں، اس لئے ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اُن کا شمار بڑھنے نہ پائے۔ تشخیص مرض تو درست ہے مگر علاج غلط۔ اگر ہاتھ میں ایک پھنسی نکلے اور اس کا زہر پھیلتا چلا جائے اور خوف ہو کہ سارا ہاتھ از کار رفتہ ہو جائے گا۔ تو کیا طبیب کا یہ کام ہے کہ پھنسی کا نام سننے کے ساتھ ہاتھ کے جڑ سے اڑا دینے کا حکم دے یا کسی پھوہڑ عورت کے سر میں جوئیں پڑ جائیں تو اُس کو یہی صلاح دینی چاہیے کہ سر منڈوا ڈال، نہ بال ہونگے نہ جوئیں پڑیں گی۔ نہیں نہیں۔ علاج اس کا نام ہے کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔ زخم اچھا ہو جائے اور قطع ید لازم نہ آئے۔ چٹیا بھی رہے اور روپے لیکھ ڈھونڈی نہ ملے۔ اب ہمارے دوست سید صادق کا صرف ایک اعتراض اور رہ گیا ہے کہ انگریزی پڑھے ہوؤں کو اُن کی مرضی کی بیبیاں مل نہیں سکتیں۔ سچ ہے کہ نہیں مل سکتیں۔ جس طرح عورتوں کو ایسے شوہر نہیں مل سکتے۔ جو دایہ گری کا کام بھی جانتے ہوں۔ عورتوں سے وہ توقعات ہی کیوں پیدا کی جاتی ہیں۔ جو اُن کے بس کی نہیں؟ اور آخر ایسی ہی عورتوں کے ساتھ لاکھوں کروڑوں آدمی گذارہ کرتے ہیں۔ انگریزی خواں جو خوش نہیں رہ سکتے تو اس وجہ سے کہ انہوں نے انگریزی پڑھ کر اپنے تئیں چھوئی موئی بنا لیا ہے۔ قصور تو اپنا اور اُلاہنا دوسروں پر۔

سید صادق نے تاہل میں تو بہتیرے کیڑے ڈالے لیکن انہوں نے ان قباحتوں پر بھی

نظر کی جو تجرّد کو لازم ہیں۔ اگر یہ بیٹھے جیسا کہ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹھنا چاہتے ہیں۔ تو زیادہ نہیں آج سے نو دس برس کے اندر اندر دکھا دیں گے کہ کسی ناگفتہ بہ بیماری میں گل سڑ کے مر گئے ہوں گے۔ یا پڑے گھُل رہے ہوں گے یا تبدیلیوں کے ساتھ سڑک کوٹتے ہوں گے۔ یا ایسی خراب حالت میں ہوں گے کہ کالج کے پرنسپل اور پروفیسر اور طالب العلم تو رہے اپنی جگہ۔ کالج کے بھنگی کو "یہ کہتے ہوئے شرم آئے گی کہ یہ بھی کبھی ہمارے کالج میں تھے۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ لیکن اگر ہو تو وہ سزا ہو گی اُن کی اپنے کرتوت کی کہ انہوں نے قانونِ قدرت کو توڑا۔ اور پیغمبرِ اسلام کی سنت سے منہ موڑا۔ اے جناب یہ اعتراض سُنکر میں تو لگا بغلیں جھانکنے۔ اور مجھ سے ایک بات کا بھی جواب دیتے نہ بن پڑا۔ اور میں نے اپنا کان امیٹھا اور تجرّد سے توبہ کی۔ اور اب مجھ کو یہ سوچ پیدا ہوا کہ تاہل کرنا تو ضرور ہے۔ اور میں نے اپنی غلط فہمی سے اُس کی عمر کا ایک حصہ ضائع بھی کر دیا۔ اگر میں زیادہ دن تک بیٹھا رہوں تو لوگ ایسا خیال کریں گے کہ میں اسی غلطی پر جما ہوا ہوں۔ اور کمیٹی ہے کہ اپنے قاعدے کے مطابق برابر ہوئے چلی جا رہی ہے جس کے جی میں آتا ہے۔ کوئی رائے پیش کرتا ہے۔ اور اُس پر بحث ہوتی ہے۔ میں تو پہلی ہی دفعہ تجرّد کی حمایت کر کے گوسا ہو گیا۔ اب سُنتا سب کی ہوں مگر حوصلہ نہیں پڑتا کہ آپ بھی کچھ کہوں لیکن کمیٹی کی کارروائی جواب تک ہو چکی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کافی اور کافی سے زیادہ ہے۔ اور مجھ کو کوئی حالت منتظرہ باقی نہیں۔ میں کمیٹی کے ممبروں کے نام ظاہر نہیں کر سکتا اور نہ کمیٹی کے قواعد کی رُو سے کسی کو ایسی اجازت ہے۔ ورنہ جیسی جیسی گفتگو کمیٹی میں ہوئی ہے۔ میں نام بنام بیان کرتا۔ اور چونکہ کمیٹی میں بعض آپ کے بھی متعارف ہیں۔ آپ کو کسی قدر مزہ بھی ملتا۔ لیکن مجھ کو جہاں کہیں اس خط میں ضرورت ہو گی۔ میں حرفوں سے کام لوں گا۔

ایک دن الف۔ نامی ایک ممبر کے منہ سے نکل گیا "میں تو انگلش لیڈی کروں گا"

اس پر جو گفتگو ممبروں میں ہوئی۔ اس کی نقل کرتا ہوں۔

ب:۔ " ارے میاں کہیں خدا کے لئے ایسا غضب نہ کر بیٹھنا "

الف:۔ " آپ تو جانتے ہیں کہ میں اپنے والد کا اکیلا بیٹا ہوں۔ اور وہ جیسے کفایت شعار ہیں معلوم، اُن کے پاس اچھا اندوختہ تھا۔ اور ہمیشہ سوچا کرتے تھے کہ اس کو کاہے میں مشغول کر دوں۔ کوئی صلاح دنیا تجارت میں۔ تو وہ کہتے مجھ کو آپ تو اس کا سلیقہ نہیں اتنا سرمایہ نہیں کہ اس سے بڑی تجارت ہو سکے۔ اے ہوئے پچاس ساٹھ ہزار تو ان کی کیا بساط۔ اور پچاس ساٹھ ہزار بھی میں نے مثال کے طور پر بیان کئے ورنہ میں نے تو اتنی بڑی رقم کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی۔ اور دیکھتا کہاں سے۔ اس نعمت پر ہیچ ڈپٹی کلکٹری میں تو موقع ہی نہیں۔ وہ موذی کلکٹر چھاتی پر بیٹھا ہوا مونگ دلا کرتا ہے۔ آپ بڑے دن کی ڈالیاں لے۔ مفت کی سواریوں پر لدا لدا پھرے۔ دورے میں دودھ انڈا، مرغی۔ کوئلا، لکڑی۔ گھاس کسی چیز کے دام۔ قلی بیگار کی مزدوری نہ آپ دے اور نہ اس کے لشکر والے دیں تو کچھ نہیں۔ عین میز کے تلے عملے کی تقدیر کا ہُن برسا کرے تو خبر نہیں۔ چپراسی اور خانگی ملازم انعام کے لئے کتّوں کی طرح لوگوں کو پیٹیں تو پروا نہیں مگر ڈپٹی صاحب نے خدا جانے اس کا باپ مارا ہے یا کیا بگاڑا ہے جب دیکھو ان ہی کے حال کی تفتیش، ان ہی کی خبروں کی کُرید۔ بھلا ایسی تاک جھانک میں کس کی شامت آئی ہے۔ کہ رشوت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ بادش بخیر تحصیلداری کا خدا بھلا کرے کہ دس بارہ برس نبھ گئی۔ تو ذرا پر پُرزے بھی درست ہو گئے۔ اور ایک خدا نے یہ بھی بڑا ہی کرم کیا کہ چینگی پوٹے بہت نہ ہوئے۔ ساری عمر میں یہ ایک چینچلا کہ خدا کرے جیتا رہے۔ ورنہ گھر والی کا سلیقہ بھی دھرا ہی رہتا۔ تو ایسی تھوڑی پونجی میں کیا تجارت کر سکتا ہوں۔ تحصیلداری۔ ڈپٹی کلکٹری کرنے کے بعد یہ تو مجھ سے ہونے کا نہیں کہ بساطی بنوں۔ یا آٹے دال کی دُکان کھول بیٹھوں۔ چار و ناچار دوسرے کی آڑ میں شکار مارنا

ہوگا تو وہ دوسرے ایسا کیا قرآن کا جامہ پہنے ہوں گے کہ جو کمائیں گے میرے ہاتھ لاکر دھر دیں گے۔ آٹا ے کر نمک چھوڑ دیں تو غنیمت۔ غرض تجارت میں روپیہ لگانا تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" دوسرا کہتا "جناب تو آپ پرامیسری نوٹ خرید لیجئے۔ اس سے مطمئن تر پیرایہ تو کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ برکت خدا نے سود ہی میں دی ہے۔ بیٹھے چڑھے سوتے چڑھے۔ اور پھر نہ ہلدی لگے نہ پھٹکری۔ چھ ماہی ہوئی۔ اور اپنے ٹکے گنوا لئے۔ نہ ہڑ ہڑ نہ کھڑ کھڑ"۔ تو والد فرماتے کہ "کہتے تو سچ ہو۔ مگر فائدہ تو دیکھو۔ اونٹ کے منہ میں زیرا وہ کندن اور کاہ برآوردن۔ اپنی چھاتی تلے سے رقم نکال کر دو۔ اور برس بھر بیٹھے سیوا کرو اتنی زحمت کے بعد ملا کیا۔ سو پیچھے چار۔ دیکھو تو کیا چالاک قوم ہے۔ یہ کسی کے چھپر پر پھوس نہیں رہنے دیں گے۔ بادشاہ ہو کر رعایا سے لیں قرض اور اس کو ریلوں اور نہروں اور فائدے کی چیزوں میں لگائیں۔ اور بیس پچیس پچیس روپئے سیکڑا کمائیں۔ اور روپئے والوں کو دیں چار۔ کہا ہوں نمک کھایا ہے۔ ان کو خدا کی سنوار۔ اور پھر اس میں سے ٹیکس کی کٹوتی۔ اور کل کو عملداری اٹھ گئی تو کاغذ کو لئے چاٹا کرو۔ اور عملداری کا کس نے بیمہ لیا ہے۔ روس آہستہ ہی آہستہ بڑھتا ہی چلا آتا ہے۔ امیر کابل کی آڑ تھی۔ سو اس کا یہ حال ہے کہ یہ کہتے ہیں سیدھی اور وہ سمجھتا ہے اُلٹی۔ دیکھئے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ نا صاحب نوٹ کی صلاح تو ٹھیک نہیں۔" اس پہ وہ صلاح کار بولا "بس تو زمینداری"۔

والد۔ "ہاں میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ مگر کمبخت زمینداروں کی بھی شامت ہے۔ دیکھتے نہیں۔ آئے دن تھانے اور تحصیل میں کھنچے کھنچے پھرتے ہیں۔ اور اب زمینداری میں رہ ہی کیا گیا ہے۔ گودا گودا تو سرکار نکال لیتی ہے۔ باقی بچی ہڈیاں اُن کو زمیندار اور کاشتکار پڑے چچوڑا کریں۔ اول تو زمین میں وہ اگلے وقتوں کی سی پیداوار یاں کہاں اور جو من کی جگہ پنسیری رہ بھی گیا ہے۔ تو کاشتکار ہی کا پورا نہیں پڑتا۔

زمیندار کو کہاں سے دے۔ اور جب سے سرکار نے موروثی کاشتکاروں کے حقوق تسلیم کر لئے ہیں۔ گاؤں میں چوکیدار کی وقعت ہے۔ اور نہیں ہے تو زمیندار کی۔ یہ کسی کا کر ہی کیا سکتا ہے۔ کہ کوئی اس سے دبے اور اس کا حکم مانے پس زمینداری اب اس کا نام ہے کہ کاشتکاروں سے جو کچھ وقت پر منت سے خوشامد سے وصول ہوا اپنے پاس سے پورا کر کے سرکار میں بھرا۔ اور حق زمینداری میں تحصیل والوں کی جھڑکیاں سنیں۔ دھکے کھائے۔ حوالات میں رہے۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔ گاؤں میں واردات ہوگئی تو پہلا مجرم زمیندار۔ بہتیری تدبیریں کرتا ہے کہ بھلا کچھ بچے نہیں تو مہاجن کا سود تو پہنچتا رہے۔ مگر برس کے دورے کی ٹڈیوں کا پڑاؤ ایک تدبیر کو پیش رفت نہیں ہونے دیتا"

صلاح کار"۔ پھر جناب آپ فائدے سے قطع نظر کیجئے اور جو کچھ آپ کے پاس ہے لئے بیٹھے رہئیے۔ مال عرب پیش عرب۔ اول تو آپ کی پنشن ہی اتنی ہوگی کہ آپ اس میں سے بھی کچھ نہ کچھ پس انداز کر لیا کریں گے۔ گرہ سے نہ کھانا پڑے" تو یہ فائدہ کیا کم ہے۔ اور اگر آپ روپئے سے روپیہ کمانا چاہیں گے۔ تو اس میں تھوڑی یا بہت زحمت بھی ہوگی۔ کم یا زیادہ خطرہ بھی ہوگا"

والد"۔ روپئے کے معطل ڈال رکھنے کو تو طبیعت گوارہ نہیں کرتی۔ دیکھو کوئی علاقہ ہی مول لوں گا۔ ہر چند زمینداری میں چند در چند قباحتیں ہیں۔ پھر بھی میں خیال کرتا ہوں کہ ان لوگوں کو زمینداری کرنی نہیں آتی۔ ورنہ بہتیری گنجائشیں نکل سکتی ہیں۔ اور جو ناجائز تکلیفیں زمینداروں کو پہنچتی ہیں۔ اکثر ان ہی کی ناواقفیت کی وجہ سے، اور اگر ان کو پورے طور پر اپنے حقوق اختیارات اور ذمہ داریاں معلوم ہوں تو اب بھی زمینداری بسا بہتر چیز ہے۔ اور میں جو اس کو اپنے لئے پسند کرتا ہوں تو اس کی ایک خاص وجہ اور بھی ہے کہ اب میری ہونے والی ہے پنشن۔ یوں تو تم دیکھتے ہو کہ خدا کے

فضل و کرم سے میں کسی طرح کام سے معذور نہیں۔ اب بھی چھ سات گھنٹہ قلم ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا۔ اور دس کوس پندرہ کوس بے تکان گھوڑے پر چڑھ سکتا ہوں، انگریزوں کی طرح پیدل دوڑا تو نہیں جاتا لیکن یوں ہوتے ہوتے دو تین کوس چل لینا کچھ بات نہیں۔ غرض کوئی حاکم مہربان ہو تو پچپن سالہ کے قاعدے سے مستثنیٰ ہو سکتا ہوں۔ مگر اب سرکار کا منشاء نہیں ہے کہ ہم جیسے لوگ جن کو انگریزی نہیں آتی بڑے عہدوں پر رہیں تو ایسے سر پڑ کر نوکری کرنے کی کیا ضرور ہے۔ اور سر پڑ نا کیسا ہیں تو بہتیرا پاؤں پڑوں، مگر اگلا ہاتھ بھی دھرے۔ تو میں سوچتا ہوں کہ پنشن ہوئے پیچھے کیا کروں گا۔ ساری عمر کام کرتے گذری تو کوئی نہ کوئی شغلہ ہونا ضرور ہے۔ زمینداری سے بہتر کوئی مشغلہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ وہ تحصیلداری اور ڈپٹی کلکٹری تو کہاں تاہم اس میں ایک طرح کی حکومت ہے۔ غرض ضلع بلند شہر کا وہ مشہور گاؤں خدا داد پور جو آپ نے سنا ہو والد نے خرید لیا۔ داخل خارج میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ آخر کار دیوانی کرنی پڑی۔ اور ہائی کورٹ سے قبضہ ملا۔ اب والد کی پنشن اور گاؤں کی آمدنی ملا کر چھ سات سو روپے مہینے کی معقول بافت ہے۔ مگر چونکہ والد کو ہمیشہ سے جوڑنے کا مرض ہے۔ میں ان کو کبھی خوش نہیں دیکھتا۔ اگرچہ وہ آپ انگریزی نہیں پڑھے اور اُن کے خیالات بھی کچھ ایسے شگفتہ نہیں ہیں۔ مگر آخر ڈپٹی کلکٹری کرتے تھے اتنی بات اُن کو زمانے نے سکھا دی تھی کہ مجھ کو انگریزی پڑھنا ضرور ہے۔ جبلّی کفایت شعاری کی وجہ سے وہ مجھ کو انگریزی پڑھواتے رہے۔ مگر کس طرح کہ اُن کے ملاقاتیوں میں سے، یا انگریزی دفتر کے کرانیوں میں سے، کسی کے پاس چلا گیا۔ یا کسی کو ڈپٹی صاحب کا ایسا ہی پاس و لحاظ ہوا تو تھوڑی دیر کے لئے اس نے تکلیف کی۔ میں نے اس وجہ سے پانچ یا چھ برس انگریزی پڑھی اور جس کے باپ کو انگریزی نہ آتی ہو اس کو ایسے طور پر پڑھنے سے جتنی اور جیسی انگریزی آنی چاہیئے۔ مجھ کو آتی بھی تھی۔ اتنے میں نوشن پڑا کہ کل

سید احمد خاں آنے والے ہیں۔ ڈاک بنگلے میں ٹھیریں گے۔ اور اگلے دن علیگڈھ کالج کے لئے چندہ جمع کرنے کی غرض سے لکچر دیں گے۔ سید احمد خاں کا نام تو سنتا ہی تھا۔ میرے دل میں بھی گدگدی ہوئی۔ کہ اُن کو دیکھوں اور لکچر سنوں۔ بارے والد صاحب ان سے ملنے گئے تو مجھ کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ والد صاحب اور اُن سے پہلے کی بھی ملاقات تھی۔ مجھے ساتھ دیکھ کر پہچان گئے ہوں گے کہ ان کا بیٹا ہے۔ غرض میں نے دور سے بہت ہی جھک کر سلام کیا اور ان کے فرمانے سے ایک کرسی پر مؤدب بیٹھ گیا۔ والد کی طرح لباس میرا بھی ہندوستانی تھا۔ مگر سادہ۔ اس واسطے کہ بڑھیا پوشاک نہ وہ آپ پہنتے تھے اور نہ مجھ کو زرق برق کے کپڑے پہننے دیتے تھے۔ والد صاحب اور سید صاحب دونوں باتیں کر رہے ہیں۔ اور میں سر جھکائے سید صاحب کو کبھی کبھی نیچی نظروں سے دیکھتا جاتا ہوں۔ آخر والد صاحب نے کہا "دیکھئے آپ کی منشاء کے مطابق میں بندہ زادہ کو انگریزی پڑھوا رہا ہوں"۔

سید صاحب۔ ایسا انگریزی پڑھوانا کیا فائدہ دے سکتا ہے۔ جب تک تم اس کو جنٹلمین نہ بناؤ اور وہ تمہاری سوسائٹی میں رہ کر ہو نہیں سکتا۔ نری انگریزی پڑھ کر یہ بہت کرے گا تو ایک کرانی بننے کے لائق ہو جائے گا۔ اور ایک اسسٹنٹ اس کو ویسا ہی ذلیل سمجھے گا۔ جیسا ہم لوگ کتے کو سمجھتے ہیں"۔

والد "تو میں اس کو کسی اسکول میں داخل کر دوں؟"

سید صاحب "ان اسکولوں اور کالجوں سے تو یہی بہتر ہے کہ تم اس کو گھر پر پڑھواؤ جیسا پڑھواتے ہو"۔

والد "پھر آپ جیسا ارشاد فرمائیں"۔

سید صاحب "ابھی تک آپ میرے ارشاد فرمانے ہی کے منتظر ہیں۔ میں ولایت تک کی خاک چھان آیا۔ کئی برس مجھ کو بھیک مانگتے ہو گئے۔ اپنے اوپر کفر کے فتوے لکھوائے گالیاں سنیں برا بھلا کہلوایا۔ ابھی تک آپ کو معلوم ہی نہیں کہ میں کیا ارشاد فرماتا ہوں۔

اے جناب میں آپ کی خدمت میں بمنت التماس کرتا ہوں کہ آپ اس کو میرے ساتھ کر دیجئے کہ میں اس کو لے جا کر علیگڈھ کالج میں داخل کر دوں۔ ابھی تک آپ نے اس کو پڑھوایا ہے۔ اور آپ دیکھتے ہیں کہ یہ کیا ہے۔ میرے اور آپ کے سامنے بھیگی بلّی بنا ہوا بیٹھا ہے۔ گویا یہ آدمی نہیں۔ اور نہ یہ سمجھتا ہے کہ میں بھی آدمی ہوں۔ اس کو لے جاؤں گا۔ اور آدمی بناؤں گا۔ اس کو سکھاؤں گا کہ تو کیا ہے۔ اور تجھ کو کیا ہونا چاہیئے۔ یہ پہلے اپنی عزت آپ کرے گا۔ اور پھر دوسروں سے طلب گار ہوگا کہ اس کی عزت کریں۔ اسسٹنٹ جنٹ کلکٹر کیا چیز ہیں۔ اس سے لاٹ صاحب کے آگے بھی ہاتھ نہیں جوڑے جائیں گے۔ ہاتھ جوڑنے کے عوض یہ اُن سے شیک ہینڈ کرنا چاہے گا۔ اور ان کو شیک ہینڈ کرنا پڑے گا۔ اور وہ اس کے شیک ہینڈ کرنے سے اتنے خوش ہوں گے۔ جتنے تمہارے ہاتھ جوڑنے سے نہیں ہوتے۔ یہ انگریزوں سے نہیں ملے گا اس طرح پر جس طرح تم لوگ ملتے ہو کہ احلطے سے باہر سواری سے اُترے اور دبے پاؤں اندر گئے۔ جس کی بڑی رسائی ہوئی شاگرد پیشوں میں بیٹھا۔ ورنہ ذلت اور بے عزتی کے ساتھ دور دور پڑا پھرا۔ بڑی لمبی چوڑی عزت رکھتا ہے۔ تو گھنٹوں کے انتظار کے بعد بلایا گیا۔ کھڑے کھڑے سلام کیا۔ رخصت صاحب کچہری جانے لگے۔ ناد شما فراشی آداب بجالائے۔ دل میں فرض کر لیا کہ دیکھا اور پہچانا۔ خوشی خوشی گھر واپس آئے۔ اور گھر جا کر شیخی بگھاری۔ یہ انگریزوں سے ملے گا۔ جس طرح ایک جنٹلمین ایک جنٹلمین سے ملتا ہے۔ ملاقات کے اوقات معلوم ہیں عین برآمدے میں سواری لے گئے۔ کارڈ بھیج دیا۔ صاحب آپ باہر آ کر لے گئے یا اُن کو ملاقات کے کمرے میں بٹھایا۔ طیار ہو کر آئے ہاتھ ملایا بٹھایا۔ جی کھول کر باتیں کیں عزت سے گئے تھے، آبرو کے ساتھ رخصت کیا۔ اور ہمارے کالج کے لڑکے اسی طرح اب انگریزوں سے ملتے ہیں۔ جج اور کلکٹر ان کے ساتھ کرکٹ کھیلتے اور دوستانہ ان کے

ساتھ مدارات کرتے ہیں"۔

یہ باتیں ہو ہوا کر اس وقت ہم دونوں باپ بیٹے رخصت ہو آئے۔ اگلے دن سید صاحب نے مسلمانوں پر لیکچر دیا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ لیکچر تھا یا سحر تھا۔ سید صاحب آپ بھی روئے اور سننے والوں کو بھی ایسا رُلایا کہ لوگوں کی ہچکی بندھ گئی۔ بندے کو ایک بار میر انیس کے سننے کا بھی اتفاق ہوا ہے۔ عجب باکمال آدمی تھا۔ رزم پڑھ رہا ہے اور لوگ ہیں کہ اوچھل اوچھل پڑتے ہیں۔ اور ہر طرف سے واہ واہ اور تحسین کی صدا بلند ہے۔ کہ دفعتاً پکارا صاحبو اپنے اپنے رومال سنبھالو کہ میں کچھ رقت آمیز بند پڑھنے کو ہوں۔ اس کے بعد تو مجلس کی یہ کیفیت ہوتی تھی، جیسے مرغ بسمل۔ میر انیس اہل بیت نبوی علیہ السلام کے مرثیہ خواں تھے۔ اور سید احمد خاں مسلمانوں کی قوم کے مرثیہ خواں ہیں۔ وہ اپنے فن میں طاق تھے۔ یہ اپنی شان میں یکتائے روزگار ہیں۔ اگرچہ میرے سامنے ہی سید احمد خاں صاحب نے والد سے مجھے علیگڈھ بھیج دینے کے لئے کہا تھا۔ مگر میں جانتا تھا کہ والد صاحب اتنا خرچ گوارا نہیں کر سکیں گے۔ دوبارہ والد اکیلے سید احمد خاں سے ملنے گئے۔ خدا جانے کیا سمجھایا کیا نہ سمجھایا کہ گھر آتے کے ساتھ ہی میری کتابیں اور کپڑے بیگ میں رکھ مجھ کو سید صاحب کے ساتھ کر دیا۔ پہلے ہی مہینے میں دوسو ساڑھے بارہ روپئے کا بل گیا۔ والد تو بہت گھبرائے یہ کیا آفت آئی۔ اور سید صاحب کو لکھا کہ میں ایسی تعلیم سے باز آیا۔ میرے لڑکے کو الٹا بھیج دیجئے۔ مگر اس لکھا پڑھی میں اتنا عرصہ گذرا کہ میرا جی لگ گیا تھا۔ میں نے والد کو صاف لکھ دیا کہ میں پڑھوں گا، اور علی گڈھ کالج ہی میں پڑھوں گا۔ نوبت بایں جا رسید کہ آخر کار والد صاحب خود تشریف لائے اور میرے ٹھاٹھ دیکھ کر بہت ہی ناراض ہوئے۔ اور مارے غصّے کے یہ بھی تو نہ پوچھا کہ میں نے اتنے دنوں میں کیا ترقی کی ہے۔ کہ آج میں کالج میں کرکٹ

ٹیم کا کپتان ہوں۔ جمناسٹک میں ہمیشہ اول رہتا ہوں۔ تین بار رننگ ریس جیت چکا ہوں۔ پڑھنے میں میرا سائنس کمزور ہے۔ مگر تلفظ ایسا اچھا ہے کہ کئی انگریزوں نے میرے منہ پر تعریف کی ہے۔ تاہم میں امید کرتا ہوں کہ امسال انٹرنس ضرور پاس کروں گا۔ میں خانگی جھگڑوں کے بیان کرنے سے آپ کا قیمتی وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ والد نے بات کا ایسا بتنگڑ بنایا کہ ناخوش ہوکر شہر میں جا رہے اور سارے کنبے کو جمع کرلیا۔ اور مجھ پر ہر طرح کا دباؤ ڈالنا چاہا مگر اصیل مرغے کی ایک ٹانگ۔ میں نہایت مضبوطی کے ساتھ اپنی ہٹ پر جما رہا۔ اور میں نے سب کو یقین دلادیا کہ اگر میرے ارادے میں ناکامیابی ہوگی تو میں اپنے تئیں ہلاک کردوں گا۔ چونکہ میں ایک بیٹا ہوں۔ اور سوائے اس کے جنٹلمین کی شان سے رہنا چاہتا ہوں کسی طرح کا الزام میرے ذمے عائد نہیں ہو سکتا تھا۔ اور لوگ والد کی کفایت شعاری اور جزرسی سے بے وجہ ناراض بھی تھے۔ سب نے والد ہی کو قائل معقول کیا۔ کہ تمہاری یہ عمر آئی کہ تم گویا قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہو اور تمہارے اندھیرے گھر کا یہی ایک چراغ ہے۔ تم نے اب تک جو کچھ کیا اسی کے لئے کیا اور اب بھی جو کچھ کرتے ہو۔ اسی کے لئے کرتے ہو۔ کیوں اس کو ضد دلاؤ؟ جوان لڑکا ہے۔ ایسا نہ ہو اپنی جان پر کھیل جائے۔ اور اگر خراب کرنے پر آئے گا تو آج نہیں کل تمہارے بعد اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ اس وقت کون اس کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے۔ ہماری صلاح مانو تو خدا داد پورا اس کے سر مارو۔ یہ جانے اور اس کا کام جانے جو چاہے سو کرے۔ تم جب تک جیتے ہو پنشن ہے۔ تمہاری پلاؤ کی رکابی کہیں نہیں گئی۔ اور آخر یہ بھی بڑے نام ونمود کے کالج میں پڑھتا ہے۔ اور سنتے ہیں کہ یہاں لڑکوں کے چال چلن کی بہت نگرانی کی جاتی ہے۔ انگریزوں سے ملتا جلتا ہے۔ اور یہ لوگ جیسے منتظم ہوتے ہیں ظاہر۔ کچھ تو ان کی خو بو اس میں بھی آئی ہو گی۔ دودھ پیتا

بچہ نہیں۔ اتنا تو سمجھتا ہوگا کہ اگر جائداد کو ضائع کردوں گا تو یہ اللے تللے کی زندگی کیسے نبھے گی۔ کچھ پس و پیش نہ کرو۔ اور بسم اللہ کرکے خداداد پور[1] پر اس کا نام چڑھوادو کہ اسی کے سر بوجھ رہے۔ یہ خداداد پور جس پر اب میں اکیلا قابض و متصرف ہوں۔ مجھے زندگی شروع کرنے کے لئے بہت ہے اور میں نے مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ میں نے انٹرنس پاس کیا اور میں ولایت روانہ ہوا۔ خداداد پور پر پندرہ بیس ہزار روپئے مل جانا کچھ بات نہیں۔ تین برس میں ولایت رہوں گا۔ بیرسٹری کے لئے قانون پڑھوں گا انگریزی میری اب بھی اچھی ہے۔ ولایت میں اور بھی اچھی ہو جائے گی۔ بیرسٹری کے امتحان میں کسی کو فیل ہونے سنا نہیں۔ کچھ لکچر ہوتے ہیں کہ وہ سننے پڑتے ہیں۔ بے شک میں اونچے درجے کی سوسائٹی میں ملوں جلوں گا۔ اور کسی نہ کسی مس کے ساتھ میں اپنی ڈِنِس جمالوں گا۔ میں نے تحقیق سنا ہے کہ وہاں شادی کرلینا کچھ بات نہیں۔ عورتوں کو مرد کم ملتے ہیں۔ اور خوش حال آدمی پر مسیں اس طرح گرتی ہیں۔ جیسے شہد پر مکھیاں جب میں بیرسٹری کا ڈپلومہ اور میم لے کر ہندوستان واپس آؤں گا۔ تو میں سب سے زیادہ خوش نصیب آدمی ہوں گا دنیا میں۔"

ب۔ "نہیں نہیں۔ تم سب سے زیادہ بد نصیب آدمی ہوگے دنیا میں۔"

الف۔ "کیا اس وجہ سے کہ میں ولایتی بی بی کا خرچ نہیں چلا سکوں گا؟ ذرا مجھ کو بیرسٹری کا ڈپلومہ تو لے آنے دیجئے دکھادوں گا۔ کہ انگریزی گفتگو کے ذریعہ کتنا کما سکتا ہوں۔"

ب۔ "میں نے خرچ کے لحاظ سے نہیں کہا۔ آپ تو ماشاء اللہ بیرسٹری کے بدون بھی اتنا مقدور رکھتے ہیں۔ بلکہ میں نے اختلافِ صورت، اختلافِ مزاج، اختلافِ طبیعت، اختلافِ رسم و عادت، اختلافِ مذاق، اختلافِ وضع، اختلافِ مذہب اختلافِ حالت کے اعتبار سے کہا کہ اتنے اختلافات کے ہوتے یہ پیوند محض بے جوڑ معلوم

---

[1] گاؤں کے نام۔

ہوتا ہے۔ اور میں یقین نہیں کرتا کہ یہ گنگا جمنی رشتہ تم دونوں میں سے کسی کو بھی سازگار ہو۔"

الف:- "اگر ہم طبیعت اور رسم و عادت اور کیا اور کیا کے ایسے مغلوب ہیں تو ہمارا اس کالج میں رہنا لاحاصل ہے۔ میں اپنے تئیں دیکھتا ہوں کہ بالکل بدل گیا ہوں اور نیٹو سوسائٹی سے مجھے سخت نفرت ہے۔ اور مجھ کو ان کی کوئی ادا نہیں بھاتی اور برسویں دن تعطیل میں بہ مجبوری گھر جاتا ہوں۔ تو گھر مجھ کو پھاڑے کھاتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ میں ولائتی بی بی لانی چاہتا ہوں۔"

ب:- "یہ تمہارا خدع نفس ہے۔ اور میں تمہاری رائے کی تردید میں اتنے واقعات چشم دید پیش کر سکتا ہوں کہ اُن کو سننے کے بعد ضرور تم کو اپنی رائے بدلنی ہوگی میں نہیں کہتا کہ انسان اختیار سے اپنی کوئی چیز نہیں بدل سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو صحبت اور تلقین و تعلیم اور افہام و تفہیم سب لغو و لاطائل ماننا پڑے۔ مگر ہاں یہ ضرور میری رائے ہے کہ بعض باتیں انسان میں ایسی بھی ہیں۔ اور وہ شاید اُس کی خاص فطرت میں داخل ہیں کہ وہ اُن کو مشق و مہارت سے کم تو کر بھی سکے مگر مطلقاً معدوم نہیں کر سکتا۔ ازاں جملہ ایک مذاق ہے کہ اس کی جڑ طبیعت سے نہیں نکلتی۔ بندے کے والد اصل میں دیہات کے ہیں۔ اور کوئی دس گیارہ برس کی عمر سے شہر میں آئے اور تب سے برابر شہر ہی میں ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ اُن کی طبیعت چنے کے ساگ بھنوے کی کھوجی، چونی کی روٹی، ایسی چیزوں کو للچایا کرتی ہے۔ اور باوجودیکہ گھر میں لوگ ان کو چھیڑتے بھی ہیں۔ مگر وہ مذاق سے مجبور ہیں۔ اور جب کبھی اُن کو اپنی مرضی کی کوئی چیز مل جاتی ہے، اگرچہ کم ملتی ہے اور مشکل سے ملتی ہے مگر جب کبھی مل جاتی ہے تو ایسے چاؤ سے کھاتے ہیں کہ کبھی پلاؤ زردے کو بھی اس رغبت سے کھاتے نہیں دیکھا۔ اس سے زیادہ عجیب ایک بات سُنو کہ مسٹر فلاں جو یہ انگریزی طرز اختیار کئے

ہوئے ہیں۔ میں جانتا ہوں تیس برس سے بھی زیادہ ہوئے ہوں گے تیس برس کی عادت کو طبیعت ثانیہ کہا جائے۔ تو کچھ بے جا نہیں۔ اور چوں کہ خدا نے اُن کو بہت بڑا مقدور دے رکھا ہے جس قدر تکلف سے رہنا چاہیں رہ سکتے ہیں۔ اور یہ سارے نخرے دولت ہی کے ہیں۔ تو ان سے کوئی انگریزی شان چھوٹنے نہیں پائی اور انگریز بھی ریل اور پولیس کے سٹریل یوریشن نہیں بلکہ اعلیٰ درجے کے ولایت زا۔ یہ صاحب ایک دفعہ پڑے بیمار، ہلکا سا بخار تھا۔ مگر امیری چوچلے، اُن کے لئے وہ بھی بڑا خطرناک تھا۔ دن میں گھنٹے گھنٹے بعد ٹمپریچر لیا جاتا تھا۔ انگریز تو بلا کے موجد ہیں۔ تھرمامیٹر کے قسم کی ایک نلی نکالی ہے۔ اس سے حرارت کا درجہ معلوم ہوتا ہے۔ جو چاہے دیکھ لے۔ اس نلی کے آگے نبض اور قارورے اور زبان کی رنگت کے دیکھنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اس نلی کو پہلے مریض کی بغل میں رکھتے تھے۔ اب منہ میں رکھنے لگے ہیں۔ آیندہ دیکھیے کہاں رکھنا تجویز کریں۔ غرض دن میں گھنٹے گھنٹے ٹمپریچر لیا جاتا۔ اور ایک کتاب میں لکھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر ٹمپریچر لے کر باہر آیا اور مریض صاحب کے اعزہ اور احباب اور خوشامدی اور اہلِ اغراض اُس کو آچمٹے۔ اُن لوگوں کو مریض کی حرارت کی اتار چڑھاؤ کی ایسی لگی رہتی تھی کہ آج ایکسچینج کے اتار چڑھاؤ کی بھی کسی کو نہیں لگی رہتی۔ بعض کے تو ایسے مغز چلے ہوئے تھے کہ وہ مریض کا بلیٹن نکالنے کی فکر میں تھے۔ جیسا آئے دن بڈھے گلیڈسٹین کا نکلتا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اور بخار ہے کہ جنبش نہیں کھاتا ڈاکٹر نے اوپر تلے کونین کی ایسی بھرمار کی کہ اس کی یبوست سے مریض کو بہکنا لگ گیا۔ اس بہکنے میں بیمار کو تہیر کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ تیمارداروں میں کوئی سمجھتا نہ تھا کہ تہیر کیا چیز ہے۔ اور جو اُن کے عزیز سمجھتے تھے وہ مارے شیخی کے بتا نہیں سکتے کہ رسوائی ہوگی تہیر غالباً جوار یا اسی قسم کے کسی اناج کے دلیے کا نام ہے۔ جو دیہات میں چھاچھ کے ساتھ پیا جاتا ہے۔ بیمار نے کبھی بچپن میں اپنے گھر تہیر پیا ہوگا۔ اور اُن کی روح تہیر

میں ایسی پڑی تھی کہ بھکنے میں مہیرہی مہیر رٹتے تھے۔ تو جب ایسے شخص کا مذاق نہ بدلا تو کیوں کر باور کر لیا جائے۔ کہ تمہارا یا کسی کا مذاق بدل سکتا ہے۔ اور یہ تو میں نے مثال کے طور پر بیان کیا۔ کتنی ایسی باتیں ہیں کہ طبیعت میں جم گئیں تو جمیں پھر ساری عمر نہیں نکلتیں کیا تم پسند کرو گے کہ تمہاری بی بی فُل ڈرس پہنے؟ کیا تم پسند کرو گے کہ وہ غیر مردوں کے ساتھ بغل گیر ہو کر ہال میں ناچے، بشرطیکہ تمہارے تعلق کی وجہ سے کوئی انگریز اس کے ہال میں بلانے یا آنے کا روادار ہو، کیا تم پسند کرو گے کہ وہ اجنبی لوگوں کے ساتھ آمد و شد یا خط و کتابت رکھے اور تم اس سے اتنا بھی نہ پوچھ سکو کہ کہاں جاتی ہو یا اتنی دیر کہاں رہیں؟ یا کس کا خط ہے اور کیا لکھا ہے؟ شاید تم اپنی بات کی پچ پر آ کر کہہ دو گے کہ ہاں پسند کروں گا۔ اور بے شک تم اس وقت ایسا ہی خیال کرتے ہو گے، مگر بھائی جان منہ سے کہہ دینا آسان ہے اور عمل میں لانا مشکل۔ جب تمہاری بی بی کے ساتھ تمہارے دیکھتے کوئی لگاوٹ کی باتیں کرے۔ اور تم کو بُرا نہ لگے تو جانیں۔ جب تک تمہاری رگوں میں ہندوستان کا بلکہ مجھ کو کہنا چاہیئے مسلمان کا خون ہے، ممکن نہیں کہ تم ایسا اختلاط، ایسا گاڑھا ربط ضبط، ایسی بے تکلفی دیکھو اور بدگمان نہ ہو۔ الرِّجالُ قوّامونَ علی النّساءِ[1] کی آواز اُس وقت سے ہمارے کان میں پھونکی گئی ہے۔ جب ہم صرف اتنا ہی سمجھتے تھے کہ عورت ماں کو کہتے ہیں اور مرد باپ کو۔ یا عورت بہن کو کہتے ہیں اور مرد بھائی کو اور اگرچہ مسلمان اپنے مذہبی احکام کی تعمیل میں بہت پہلو تہی کرنے لگے ہیں۔ مگر الرجال قوامون علی النساء[1] کے قاعدے پر بڑی سختی اور مضبوطی کے ساتھ قائم ہیں اور ہمارا قومی مزاج اسی قسم کا واقع ہوا ہے۔ کہ ہم عورتوں پر حکمرانی کرنے کو اپنا حق لازمی سمجھتے ہیں اور ہم نے ہر ایک گھر میں اس قاعدے کو ایسے عام طور پر برتتے جاتے دیکھا ہے کہ جہاں اس کے توڑنے کا نام لیا جاتا ہے، وہیں فساد ہوتا ہے۔ جب تم کو شخصی مزاج

---

[1] عورتوں کے کار فرما مرد۔ ۱۲

کے بدلنے پر پوری قدرت نہیں تو قومی مزاج بدرجۂ اولیٰ تمہارے بس کا نہیں۔ اور یورپ میں بالکل اس کا الٹ ہے۔ النسآء قوامات علی الرجال۔ تو تمہارا انگلش لیڈی سے شادی کرنا اور سازگاری کی امید رکھنا اس سے زیادہ امکان وقوعی نہیں رکھتا جیسے کوئی شخص جون اور دسمبر کو ملا کر ایک معتدل موسم بنانا چاہے۔ میاں بی بی کے ایک اختلاف سے دونوں کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے نہ کہ اتنے اختلافات کہ تم اور انگلش لیڈی میں سوائے اس کے کہ دونوں آدمی ہو۔ اور کوئی صفت مشترک نہیں۔ علاوہ اس کے جھونپڑوں میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھنا تو کچھ ٹھیک بات نہیں۔ ولایت کی بات تو رہی ولایت کے ساتھ، اس ملک میں ہم ہندوستانیوں کو ولایت کی سی آزادی تو نہ نصیب ہوئی ہے اور نہ کبھی نصیب ہوگی۔ ہم میں اور انگریزوں میں فاتح و مفتوح کا تفرقہ ہے۔ جو نہ مٹا ہے نہ مٹ سکتا ہے۔ بنگالی بڑے بڑبڑائیں اور سید احمد خانی بلا سے اپنے منہ میاں مٹھو بنیں یہاں کے انگریزوں کو کب خوش آتا ہے کہ ہم ان کو چھیڑیں اور چڑائیں۔ کوٹ پتلون پہننے تک کا تو خیر چنداں مضائقہ نہ تھا بعض کریم النفس انگریز ایسا برا بھی نہیں مانتے۔ مگر داماد بننا تو تمہارے یہاں بھی کھلی کھلی بے نقط گالی ہے۔ تو تم انگلش لیڈی لا کر اپنی عزت تو کیا بڑھاؤ گے، اس بے چاری کو بھی اس کے ہموطنوں اور ہم قوموں کی نظر میں ذلیل کر دو گے۔ اور اس گستاخی کا خمیازہ بھگتو گے سو الگ۔ انگلش سوسائٹی تم کو اپنے میں لے گی نہیں اور ہندوستانی سوسائٹی سے خود تم کو گریز ہوگا تو تم دو میاں بی بی شہر کے باہر اکیلے بنگلے میں پڑے کیا بھلے لگو گے؟ ازیں سو رانده وزآں سو در مانده ممکن ہے کہ شروع شروع میں تم کو میم صاحب کے ساتھ ایسا شغف ہو کہ کسی کا کسی وقت خلل انداز صحبت ہونا تم کو پسند نہ ہو۔ لیکن پھر سوسائٹی کی تم کو حاجت ہو اور رہو انگلش لیڈی کے تمہارے قید نکاح میں آنے سے تم دونوں کو ساری عمر قید تنہائی

میں رہنا ہوگا۔ اس کو سمجھ لو۔"

الف۔ "خیر تو میں یوریشین لیڈی کروں گا۔"

ب۔ "ع برین عقل و دانش بباید گریست۔ اے وہ ۔۔ نہیں چھی چھی بات تو وہی کی وہی رہی، اور اگر تمہاری قسمت میں یہی مصیبت لکھی ہے تو انگلش لیڈی بدرجہ بہتر۔ دوغلے نہ اِدھر نہ اُدھر یہ بلا کدھر عیب دیکھو تو چُن چُن کر دونوں قوموں کے موجود اور ہنر کے نام نہ اُن کے نہ اِن کے۔ اور ایسی ہی نسل تم چلانی چاہتے ہو کہ "خچر" کی طرح پوچھیں باپ کو تو بتائے ماں کو۔"

اس پر ایسا قہقہہ اڑا کہ بےچارے الف ہمزہ کے سے بل کھا کر رہ گئے۔

اس کے بعد کمیٹی کے کئی جلسوں میں اس پر بحث رہی کہ اگر آدمی کو اپنے پسند کی بی بی کرنے کا موقع ملے تو اس کو کون سی صفت کا گرویدہ ہونا چاہیے۔ اکثر کی یہ رائے تھی کہ حسن صورت کا، اس واسطے کہ یہی حسنِ صورت ہے۔ جو ابتداءً مرد اور عورت میں کُٹنی کا کام دیتا ہے۔ لیکن ہماری کمیٹی کے معزز ممبر ص نسبر جن کی رائے پر ان معاملات میں اکثروں کا صاد ہوتا ہے۔ کہتے تھے کہ نہیں۔ میں اُن کی عبارت ہی بلفظہا کیوں نہ نقل کروں۔ جس سے ان کا مطلب بخوبی سمجھا جائے۔ انہوں نے کہا کہ حُسن صورت کی مخالفت سے میری یہ غرض نہیں کہ دلوں کو حُسن صورت کی طرف سے پھیر دوں۔ اس کی پسندیدگی کو میں قریب قریب تقاضائے طبیعت سمجھتا ہوں۔ مگر ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ جس طرح انسان اور بہت سے بے اصل خیالات کیا کرتا ہے۔ ان میں سے ایک حُسن صورت بھی ہے۔ ہر ایک ملک کے آدمیوں نے ایک خاص طرح کے رنگ ایک خاص طرح کے تناسب اعضاء کو اچھا سمجھ رکھا ہے۔ اور کوئی پوچھے کہ کیوں؟ تو کچھ بتا نہیں سکتے۔ لیکن یہ خیال ایسا راسخ اور ایسا عام ہے کہ دنیا کے فسادات میں سے ایک تہائی ضرور اس کی وجہ سے ہیں۔ چنانچہ لوگ زر۔ زمین۔ زن تین چیزوں کو برابر

کے درجے میں فساد کی جڑ ہیں تبھی ہیں کوئی ایسا ہی زبردست حکیم یا صوفی ہو تو اس خیال کو مٹائے یا دبائے۔ خدا جانے مزاج کی نفاست ہے یا جنون ہے جس کو دیکھو حُسنِ صورت پر مفتون ہے۔ حسنِ صورت سے اصل ہو یا نہ ہو مگر اس کے بے ثبات ہونے میں تو کچھ شک نہیں۔ تو میرا کہنا یہ ہے کہ مگر صرف حُسنِ صورت علاوہ تعلق زناشوئی ہو تو دونوں میں کے دن نبھے گی۔ ایک طرف خدا کا فرمان ہے کہ آدمی پیدا ہو اور ماں کے دودھ سے پرورش پائے۔ پھر جب دودھ کفایت نہ کر سکے۔ تو اس کو غذا کی چاٹ لگے اور غذا کے چبانے اور نرم کرنے کے لئے اس کے دانت نکلیں اور تا کہ ایک حد تک وہ جلد جلد بڑھے۔ اور اس کی جسمانی اور دماغی قوتیں ترقی کریں۔ اس کے اعضا میں پھرتی ہو اور حواس میں تیزی اور پھر وہ چندے ایک حالت پر ٹھیرے۔ اور پھر خود گھٹتا اور مضمحل اور کمزور ہوتا جائے۔ قطعہ

ایک وقت تھا کہ ٹوٹے تھے دانت دودھ کے
پھر یہ ہوا کہ گذرنے لگی کھیل کود کے
اب حال یہ ہے عالمِ پیری میں اے ظفر
باقی نہیں حواس بھی گفت و شنید کے

اور جیسے ابتدا میں مٹی سے بنا تھا آخر کار مٹی میں جا ملے۔ منھا خلقنکم وفیھا نعیدکم ومنھا نخرجکم تارۃ اخری[1]۔ غرض ایک طرف تو خدا چاہتا ہے کہ یہ خاک کا پتلا دنیا کی بھول بھلیوں میں گشت کر کرا کے اپنی جگہ پر لوٹ آئے۔ دوسری طرف آدمی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدا ہی مسجد بنانے کی فکر میں ہے۔ وہ بھول بھلیوں میں آ کر سب کچھ بھول بسر گیا۔ اور سمجھتا ہے کہ بھول بھلیاں میرا گھر ہے۔ تو میں اس سے نکلوں کیوں؟ اور باہر جاؤں کس لئے؟ یہ قدم قدم پر ٹھٹکتا اور مچلتا ہے۔ لیکن خدا کی طرف سے ایک مصیطر اس کے پیچھے لگا ہے۔ وہ اس کو ٹھیرنے نہیں دیتا۔ یہ رُکا اور اس نے آگے کو

---

[1] ہم نے تم کو زمین سے پیدا کیا۔ اور زمین ہی میں تم کو لوٹا کر لائیں گے۔ اور اس سے پھر ایک بار تم کو نکال کھڑا کریں گے۔

دھکا دیا۔ جواڑا اور اُس نے اٹکانا اس کی بیہودہ ہٹ تو دیکھو کہ جوانی تو جوانی پیری تک چاہتا ہے کہ میں بچہ ہی بنا رہوں۔ ورنہ سٹھیا جانا اور بستر سے بہتر ہونے کے سعی کیا۔ اس نے جوانی کا رنگ و روغن باقی رہنے کے لئے پوڈر اور خضاب نکالے ہیں ؎

باقی ہے شیخ کو ابھی حسرت گناہ کی ۔۔۔ کالا کرے گا منہ بھی جو داڑھی سیاہ کی

دانتوں کے لئے منجنوں اور غراروں کے علاوہ یہ بندش کی ہے کہ ان کو باندھ باندھ کر رکھتا ہے۔ لیکن یہ سب دھوکے کی ٹٹیاں ہیں ؎

گرفتم سال را کردی نہاں با موچہ می سازی
گرفتم موئے را کردی سیہ با روچہ می سازی

آدمی اپنے جیسے احمقوں کو بہکا سکتا ہے۔ مگر خدا کے آگے اس کی ایک نہیں چلتی۔ اگر مرا نہیں تو جو بچہ ہے وہ جوان ہوگا ضرور، جوان بوڑھا ہوگا بیشک، جب بوڑھا ہے تو ایک دن مرے گا لاکلام۔ انسان کو خدا نے عقل دی ہے اور صاحب فہم و شعور بنایا ہے، اس کو کیا زیبا ہے کہ نادان بچوں کی طرح چند روزہ زرق برق اور عارضی چمک دمک پر فریفتہ ہو۔ اور جو شخص ایسی چیزوں سے متلذذ ہوتا ہے۔ اُس کی حالت اُس شخص سے زیادہ اطمینان کے لائق نہیں کہ ایک دریا ہے عمیق جس کی تھاہ نہیں، اور اُس میں ایک جگہ ایسا بھنور پڑتا ہے کہ اس کا گرا ہوا کبھی اُچھلا ہی نہیں اور اس میں بے شمار مردم خوار ناکے اور گھڑیال منہ کھولے پھرتے ہیں۔ اس بھنور کے عین کنارے پر وہ شخص کھڑا ہے۔ اور کنارے کی مٹی ایسی بھربھری ہے کہ ہمہ وقت دریا اُس کو کاٹتا رہتا ہے۔ کیا بھروسہ ہے کہ یہ شخص کس وقت غڑاپ سانی بھنور میں جا رہے گا۔ اور کیا معلوم بھنور میں گرے پیچھے اس کو کوئی ناکا اور نگل لے گا یا پانی کا گھماؤ اس کو نہیں اچھلنے دے گا۔ یہی حال حسن پرستی کا ہے۔ خدا کسی بھلے مانس کو

اس کی چاٹ ہی نہ ڈالے۔ جن لوگوں کو اس کی لت پڑی دیکھی ہے۔ اول تو ان کی نیت کچھ ایسی ڈانوا ڈول ہو جاتی ہے کہ نہ موقع دیکھیں نہ محل اچھی صورت سامنے آئی اور ان کی رال ٹپکی۔ دوسرے وہ جو کہا ہے۔ حبک الشئ یعمی و یصم بس اسی محبت پر صادق آتا ہے۔ لوگوں نے اس کے پیچھے ملک لٹا دئے۔ آبروئیں کھوئیں، اور بہتیروں نے جانیں بھی گنوائیں۔ اور اس میں مبتلا بھی اکثر وہی لوگ ہوتے ہیں جو بازاری طور کے ہیں بد وضع، آبرو باختہ، لوگوں کی نظروں میں سبک۔ کچھ تو دین نے روک تھام کی اور بہت کچھ لوگ ان خرابیوں کو بھی دیکھ کر ڈرتے۔ جو حسن پرستوں کو آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں ضرور پیش آتی ہیں۔ اس سے یہ شرک بعضوں کو نہیں ابھرنے پائی۔ ورنہ بھلے مانسوں کی شاعری نے تو بچے بچے کو فرہاد و مجنوں بنا ڈالا ہوتا۔ اور پھر دیکھئے اُسی کی جان کا دشمن ہیں، اور سیر سے خون کے پیاسے ختم۔ لیکن کان پڑی ہوئی آواز خالی تھوڑی جاتی ہے۔ جن کے منہ پر ہے۔ ان کے بھی دلوں میں دفتر لکھے پڑے ہیں۔ جو آنکھ بھر کر نظر کرنے کو جائز نہیں رکھتے سارا دن رات اسی کے خواب دیکھتے ہیں۔

یہ تقریر سنکر سارے ممبروں میں ایک سناٹا سا گذر گیا۔ اور کسی سے اتنا نہ ہو سکا کہ حسن صورت کی تائید میں ایک لفظ تو منہ سے نکالتا۔ اس کے بعد جو کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ تو ایک صاحب نے چھوٹتے ہی یہ سوال پیش کیا۔ کہ اگر کسی کو اتفاق سے دولتمند بی بی ملی ہو تو کمیٹی اس کو کیا رائے دیتی ہے۔

م: دنیا میں اس سے بدتر کوئی ذریعہ معاش ہو نہیں سکتا۔ اور جن لوگوں کو ایسی دولت مل گئی ہے ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور اس کی مثالیں کثرت سے تو نہیں مگر ہاں موجود ہیں۔

س: لیکن لوگوں کو کیا حق ہے کہ ایسے شخص کو ذلیل سمجھیں۔ اس نے کسی کا مال

---

۱ کسی چیز کی محبت آدمی کو اندھا بہرا کر دیتی ہے

نہیں مارا، چوری نہیں کی۔ امانت میں خیانت نہیں کی۔ کسی ناجائز طریقے سے روپیہ نہیں کمایا۔ دنیا میں ایسے بہت لوگ ہیں جن کو خدا بے زحمت دیتا ہے۔ لوگوں کو بخت و اتفاق سے کبھی گڑے دبے خزانے مل گئے ہیں۔ یا کسی اور طور پر غیر متوقع فائدے پہنچے ہیں۔ اور وہ جو کہتے ہیں کہ خدا دینے پر آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ نری خیالی بات تو نہیں ہے۔ ایسا ہوا ہے۔ اور ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا سینکڑوں ہزاروں آدمی ایک ہی ذریعے سے معاش پیدا کرتے ہیں۔ سب کے سب کی ایک حالت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص بی بی کے ذریعہ سے مال دار بننا چاہے تو میرے نزدیک اس میں کوئی قباحت نہیں۔ شاید دنیا میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں نکلے گا جس نے دوسرے کی دولت سے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔ اور نہیں تو اس نے بزرگوں ہی سے کچھ نہ کچھ میراث میں پایا ہوگا۔ تو وہ دوسرا شخص بی بی ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہ جو آپ نے کہا ہے کہ لوگ نظر حقارت سے دیکھتے ہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ رشک و حسد اس کا باعث ہوتا ہوگا۔ جس سے شاید کوئی نفس بشر خالی نہیں۔ لوگ کسی کی دو دو اور چپڑی نہیں دیکھ سکتے۔"

م: "تو کیا آپ اسی کو جائز رکھتے ہیں کہ شوہر بی بی کا گھونڈا ہو کر رہے؟"

س: "یہ سوال خارج از بحث ہے۔ اول تو ضرور نہیں کہ ہر ایک مال دار بی بی اپنے مال دار ہونے کی وجہ سے نکتوڑے کرے۔ اور فرض کیا کہ کرے، تو شوہر کو یوں بھی بی بی کی نازبرداری کرنی ہی پڑتی ہے نہ کہ مال دار بی بی کی۔ بعد اگر مرد ایسا تنک مزاج ہے۔ اور بی بی کے ساتھ اس درجہ کی مغائرت برتنا چاہتا ہے۔ تو ایسے شخص کو بی بی ہی کرنی کیا ضرور ہے۔ اور ایسی مثالیں بھی میری سماعت میں آئی ہیں کہ مال دار بیبیوں نے مدفع بدگمانی کے لئے معمول اور توقع سے زیادہ شوہروں کی اطاعت کی ہے۔

م: "کچھ بھی ہو اپنی حمیت تو تقاضا نہیں کرتی کہ جورو کے دست نگر ہو کر رہیں۔"
س: "آپ شاید کسی بات میں بھی بی بی کا شوہر سے بہتر ہونا پسند نہیں کرتے؟"
م: "بے شک۔"
س: "صورت شکل میں بھی؟"

اب تو م صاحب سٹ پٹائے۔ اور ایک تیسرے صاحب ج بولے "نہیں۔ کہاں روپیہ، کہاں صورت شکل۔ صورت شکل عورت کی صفت لازمی ہے۔"
س: "صورت شکل پر بھی عورت کو ویسا ہی ناز کرنے کا موقع ہے جیسا دولت پر۔"
ج: "ہاں لیکن وہ ناز اور قسم کا ہے اور یہ ناز اور قسم کا۔"

اس رد و کد میں بات طے ہوتی ہوئی معلوم نہ ہوتی تھی کہ ض صاحب نے کھڑے ہو کر فرمایا: "بات یہ ہے کہ ہمارے پاس اس خاص بارے میں خدا کا فرمودہ موجود ہے جس سے بخوبی اس نزاع کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ وہ جو میں نے کمیٹی کے کسی جلسے میں قرآن کی ایک آیت پڑھی تھی۔ الرجال قوامون علی النساء وہ حقیقت میں پوری آیت نہیں، بلکہ آیت کا ایک جز ہے۔ اور مجھ کو اس وقت اسی جز سے کام لینا تھا۔ اس جز کے ساتھ اتنا اور بھی ہے۔ الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضہم علی بعض وبما انفقوا من اموالہم۔ اس آیت میں خدا نے عورتوں پر مردوں کے قوام یعنی حکمران ہونے کے دو سبب بیان کئے ہیں۔ ایک مردوں کی فضیلت مطلقہ عورتوں پر۔ لیکن وجہ فضیلت بیان نہیں فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً مرد مطلقاً عورت پر فضیلت اور برتری رکھتا ہے۔ اور یہ فضیلت خلقی ہے۔ اس قسم کی جیسے انسان کی فضیلت جانوروں پر کہ گھوڑا اگرچہ وہ نجی عرب کا ہو اور اگرچہ وہ کاب کی نسل مستند کا ہو۔ تاہم اس پر فضیلت ہے انسان کو۔ اگرچہ وہ حبشی یا وحشی یا گونڈ یا بھیل ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرا سبب عورتوں پر مردوں

کے حکمراں ہونے کا فرمایا ہے۔ بِمَا اَنْفَقُوا مِنْ اَمْوَالِھِمْ کہ مرد عورتوں پر اپنا مال خرچ
کرتے ہیں یعنی مہر دیتے اُن کے نان و نفقے کا بار اُٹھاتے۔ تو جو شخص عورت کا دست
نگر ہو کر رہنا چاہے۔ وہ پھر بھی قوام ہوگا اس لئے کہ اس کی خلقی فضیلت باقی ہے۔ جو اس سے
کسی حالت میں جُدا نہیں ہو سکتی۔ مگر ادھورا۔ کیونکہ اُس کو وہ دوسری خرچ کرنے کی
فضیلت حاصل نہیں۔ اور جو شخص مالدار بی بی ڈھونڈتا ہے۔ آخر کوئی نہ کوئی اس کی
غرض و غایت تو ضرور ہوگی۔ اور وہ سوائے اس کے کیا ہو سکتی ہے کہ وہ بی بی کے
مال سے متمتع ہونا چاہتا ہے۔ اور یہ دلیل ہے اس کے قصورِ ہمت کی۔ اور افسوس ہے
کہ ہمارے کالج کا کوئی طالب علم ہماری کمیٹی کا کوئی ممبر ایسے پست خیال کو ایک منٹ
کے لئے بھی اپنے دل میں آنے دے۔ آخر دولت آدمی ہی پیدا کرتے ہیں۔ اور جو دوسرے
آدمیوں نے کیا ہے۔ یا دوسرے آدمی کرتے ہیں۔ کیا وجہ کہ ہم نہ کر سکیں۔ اور اگر ہم ہمت
ہار دیں گے۔ تو بُرے نمونے ہوں گے۔ اپنے ابنائے جنس کے لئے۔ اور موجب بدنامی
ہوں گے اپنے کالج کے حق میں۔ جس رسوائی سے خدا ہم سب کو بچائے"

اس پر آمین کے غل سے سارا کمرہ گونج اُٹھا۔ اور جلسہ برخاست ہوا۔ ہماری کمیٹی
میں شہری، دیہاتی کسی کی خصوصیت تو ہے نہیں۔ مگر اتفاق سے جتنے ممبر ہیں۔ سب
شہری، دلّی۔ آگرہ۔ لکھنؤ۔ بنارس کے رہنے والے۔ اِلّا ایک صاحب شیخ کہ وہ ضلع
سہارنپور کے رہنے والے ہیں۔ یہ صاحب حاضر ہونے والے تو ایسے جیّد ہیں کہ شروع
سے لے کر اب تک کمیٹی کا کوئی جلسہ نہیں ہوا جس میں یہ نہ رہے ہوں۔ سنتے تو بڑی توجہ
سے رہتے ہیں۔ مگر آپ کچھ دخل نہیں دیتے۔ آخر ایک دن خدا جانے کس نے کہا کہ آپ
بھی تو کچھ فرمایا کیجئے۔ تو لگے کہنے کہ "مجھے تمہاری کمیٹی کے مباحثوں میں مزہ تو بہت ملتا ہے
مگر مجھ کو اس کمیٹی سے کوئی ذاتی تعلق نہیں۔ اس لئے کہ میں ٹھیرا دیہات کا رہنے والا
ہمارے یہاں شہری قیدیں ہیں۔ اور یہاں انتخاب کا قاعدہ چل نہیں سکتا عورت

تو عورت ہمارے یہاں کو امرد بھی گو وہ کیسا ہی جوان ہو، اپنے بیاہ برات کے معاملے میں بھلی یا بُری کوئی بات منہ سے نہیں نکال سکتا۔ وہ لوگ اس کو پرلے درجے کی بے حیائی سمجھتے ہیں۔ دوسرے ہم ہیں جتنے اور برادری کے لوگ، کوئی کتنا ہی امیر ہو یا کیسا ہی پڑھ لکھ جائے۔ اگر اس کو دیہات میں رہنا ہے، تو چار و ناچار برادری کے قاعدوں کی پابندی کرنی پڑے گی۔ یہاں تک کفو کا لحاظ کیا جاتا ہے کہ شیخ ہیں نسیم ہوں۔ تول تو ہونے ہی کیوں لگا، لیکن اگر سید بھی مجھے بیٹی دینے پر راضی ہو تو میں نہیں لے سکتا۔"

شیخ صاحب تو اتنا کہہ کر چُپ ہو گئے، اور اس پر بہت سے ممبر گفتگو کرنے پر آمادہ معلوم ہوئے تو جلسے کے پریذیڈنٹ نے کہا کہ "شیخ صاحب بات تو بہت مختصر کی، مگر اس میں دو امر بڑے بحث طلب اغراض کمیٹی سے متعلق ہیں۔ ایک شرافت دوسرے شرم۔ میں امید کرتا ہوں کہ آج کے جلسے میں دونوں امر طے ہو سکیں گے۔ تو جن صاحب کو کچھ کہنا ہو شرافت کی نسبت اپنا خیال ظاہر کریں۔ اور شرم کو اگلے جلسے پر ملتوی رکھا جائے۔"

الف۔ "میرے نزدیک شرافت یعنی شرافت نسب کوئی چیز نہیں۔ ہمارے پاس عقلی شہادت موجود ہے کہ کُل آدمی ایک آدم کی اولاد ہیں۔ ان کی جسمانی بناوٹ، ان کی خواہشیں، ان کی ضرورتیں سب یکساں ہیں۔ کسی کو کسی چیز پر ترجیح نہیں۔ یہی وہ خیال ہے جو میرے نزدیک سب سے زیادہ ہم مسلمانوں کے تنزل کا باعث ہوا۔ جو لوگ شریف گنے جاتے ہیں، وہ شرافت کی شیخی میں ہیں کہ کسی طرح کا کمال حاصل کرنا نہیں چاہتے، اور جو لوگ رذیل سمجھے جاتے ہیں، ان کو لیاقت کے پیدا کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔"

ب۔ "نہیں نہیں۔ شریف و رذیل کیسے برابر ہو جائیں گے؟ کہنے کو تو آدمی وہ بھی

آدمی یہ بھی۔ مگر آدمی آدمی انتر کوئی ہیرا کوئی کنکر۔ اول تو صورت سے شریف و رذیل الگ پہچان پڑتے ہیں۔ شریفوں کو دیکھو گے اکثر رنگ کے گورے، چہرے مہرے کے درست۔ صورت شکل کے پاکیزہ، متناسب الاعضا، نازک کہ دیکھنے سے جی خوش ہوتا ہے۔ اور رذیل ہیں کہ ان کی صورتیں ہی کچھ دوسری طرح کی ہوتی ہیں۔ پکّی پکّی۔ بہنگم، کرخت، بدرنگ، اور چوں کہ یہ فرق پیدائشی ہے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی مرضی سے ہے۔ اور جیسے گھوڑا اور گدھا کہ خدا نے دونوں کو یکساں نہیں بنانا چاہا۔ اور نہ وہ یکساں ہیں۔ اور نہ کوئی ان کو یکساں سمجھ سکتا ہے۔

الف: یہ قیاس مع الفارق ہے۔ اگر ذلیلوں کی یعنی ان لوگوں کی جن کو تم رذیل کہتے ہو، صورتیں اچھی نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو معاش پیدا کرنے کے لیے محنتیں کرنی پڑتی ہیں۔ وہ گرمی کے دنوں میں میر صاحب اور مرزا صاحب کی طرح تہ خانوں میں رہ نہیں سکتے۔ دھوپ اور مینہ اور سردی سے بچنے کے لیے نہ ان کے پاس سامان ہے کہ ان کا رنگ میلا نہ ہو۔ اور نہ وہ بیکار رہ سکتے ہیں کہ ان کے اعضا نرم اور لچیلے ہوں۔ ان کی یہ حالت داغ خود غرضی ہے۔ انسان کے ناصیہ حال پر جو کسی طرح دھل نہیں سکتا۔ کیا حق رکھتا ہے۔ ایک شخص اتنا کھا جانے کا کہ اس کو ہضم کرنے کے لیے اس کو چورن کی ضرورت ہو، جب کہ اسی جیسے ہزاروں بندگان خدا فاقہ سے بھوک کے انتڑیوں کو مسوس کر رہ جاتے ہیں؟ کیا حق رکھتا ہے ایک شخص قیمتی دوشالہ اوڑھنے کا جب کہ دوسرے آدمی کو کمل بھی نصیب نہیں؟ کیا حق رکھتا ہے ایک شخص خدا کی دی ہوئی دولت کو شیخی اور نام نمود میں لٹانے کا جب کہ بہتیرے ایک مٹھی چنوں کے لیے کوڑی کوڑی دکان مانگتے پھرتے ہیں اور نہیں ملتی؟ دنیا میں جس قدر مصیبت ہے صرف اس وجہ سے ہے کہ ہم میں سے جتنے آرام پرست ہیں کما کا بوجھ لاد دیا بیٹھا جسکی کی جگہ منشی، منشی کی جگہ لپ، لپ کی جگہ جھولی، جھولی کی جگہ گٹھری، ڈھیری،

ڈھیر بیہاڑ، مجھ کو تو ہنسی اس بات پر آتی ہے کہ کرتوت تو یہ ہے۔ اور اس پر یعض کو دعوے ہیں ہمدردی کے، دین داری کے، رحم کے، جود وسخا کے، بذل کا اثیار کے، غرض ہیں حضرت انسان بھی عجائب المخلوقات، کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ کرنا چاہیئے کیا۔ اور کر رہے ہیں کیا۔"

د "لیکن شریف و رذیل کی عادت اور طبیعت کا فرق بھی تو دیکھئے۔ انتظام دنیا اس طرح واقع ہوا ہے کہ سب لوگ ایک حالت کے نہ ہوں، تو ایک محتاج ہو۔ دوسرا محتاج الیہ۔ ایک آمر ہو دوسرا مامور۔ ایک خادم ہو دوسرا مخدوم۔ اور اگر سب کی ایک ہی حالت ہوتی تو دنیا کا انتظام دگرگوں ہوتا۔ آپ اگر سب کو ایک حالت کا بنانا چاہتے ہیں۔ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ انتظام الٰہی میں دخل دیتے ہیں۔ آج تو آدمی ہے۔ کل کو آپ جانوروں کی وکالت کریں گے کہ یہ بھی جان رکھتے ہیں۔ ان کو بھی ایک تکلیف کا احساس ہے آدمی کیوں ان پر سوار ہو۔ کس لئے ان پر بوجھ لادے۔ ان سے محنت و مشقت کے کام لے کر اور سب سے بڑھ کر کیوں اور کس واسطے اپنے مزے کے لئے ان کو جان سے مارے۔ پھر آپ اور ترقی کریں گے تو درختوں کا ترس کھائیں گے کہ ان کی بھی ایک طرح کی زندگی ہے۔ لکڑی نہ کاٹو۔ پتّہ نہ توڑو۔ ایندھن نہ جلاؤ خلاصہ یہ کہ دوسروں کی خاطر مر رہو۔ اور جیو تو سر اُدگی ہو کر جیو۔"

ص "میرے دونوں دوست الف اور د مجھ کو معاف فرمائیں گے اگر میں یہ کہوں کہ دونوں صاحب اصل مطلب سے الگ ہو کر افراط و تفریط کے کناروں پر آگئے ہیں ہم کو صرف یہ دیکھنا ہے کہ شرافت نسب کوئی چیز ہے بھی یا نہیں۔ میں کہتا ہوں ہے اور دنیا کی تمام قومیں اس کو تسلیم کرتی ہیں۔ بے شک ہر زمانے میں ایسے باکمال لوگ ہوتے آئے ہیں۔ جو ایک صفت یا چند صفتوں میں اپنے ابنائے جنس پر تفوّق رکھتے تھے اور جس کو خدا ممتاز کرتا ہے۔ اس کی نسبت سے اُس کی سب چیزوں میں وقعت

آجاتی ہے، یہاں تک کہ رہنے کے مکان ہیں، پہننے کے کپڑوں میں، باندھنے کے ہتھیاروں میں، سواری کے جانوروں میں۔ لارڈ ٹینیسن مشہور انگریزی ملک الشعراء حال میں مرا ہے۔ اُس کے بیٹھنے کی کرسی کے، لکھنے کی میز کے، قلم کے، دوات کے لوگ لاکھوں روپے دینے کو موجود ہیں۔ اُس کے وارث چونکہ خود مقدور والے ہیں نہیں دیتے اور اس طرح کی مثالیں ڈھونڈنی چاہو تو ہر ایک ملک اور ہر ایک قوم میں کثرت سے ملیں گی کہ نامی نامور لوگوں کی کیسی قدر کی جاتی ہے۔ تو جب ممتاز لوگوں کی نسبت سے اُن کی سب چیزوں میں وقعت آجاتی ہو۔ تو کیوں اُن کی نسلوں کی وقعت نہ ہو۔ جو اُن کی زندہ یادگار ہیں۔ اور اُن کے ساتھ نسبت بھی قوی اور قریب کی رکھتے ہیں۔ یہ ہے ماخذ شرافت نسب کی قدر کا۔ اب دوسری بات میں یہ کہنی چاہتا ہوں کہ آدمی اشرف المخلوقات تو ہے۔ مگر اس کی مجموعی حالت کے اعتبار سے، ورنہ اسی کی بہت سی باتیں حیوانوں سے ملتی ہیں کہ اُن ہی کی طرح وہ کھاتا پیتا، سوتا چلتا پھرتا ہے۔ اس میں کئی خواص نباتات کے ہیں۔ کہ اس کو بالیدگی سے پھولنے پھلنے کی عوض اس کی نسل چلتی ہے۔ درختوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ایک درخت کے مزاج شخصی کے مطابق اس میں پھل لگتا ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ نیم کے درخت پر نیبو پھلیں یا نیبو کے درخت میں نبولیاں جس درخت کے پھل میں ایک خاص ذائقہ ہے۔ اسی سے جتنی نسل چلے گی وہ ذائقہ کم و بیش سب پھلوں میں ہوگا۔ غرض یہ بات نباتات، حیوانات اور انسان سب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں کہ نسلیں اپنے بزرگوں کے ساتھ مشابہت اور مماثلت گو باقی رکھتی چلی آتی ہیں۔ اس کی تصدیق الولد سر لابیہ سے ہوتی ہے۔ اور اسی طرح کی ایک کہاوت ہندی میں بھی ہے۔ باپ پر پوت پتا پر گھوڑا۔ بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا یہ مشابہت نہ صرف جسمانی بناوٹ میں ہوتی ہے۔ بلکہ افتاد مزاج میں بھی۔ میرے متعارفین میں ایک صاحب ہیں۔ اُن کی گدی میں ایک مسا ہے۔ وہ اس کو مہر شرافت

کہا کرتے ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ ایسا ہی مسّا اسی جگہ میرے باپ اور دادا کی گردن میں تھا۔ میرے ہوا بیٹا۔ تو اُس کی گردن میں بھی ایک مضمحل سا نشان مسّے کا تھا لیکن گدّی میں نہیں، بڑے ہو کر وہ مسّا کھسکتے کھسکتے اُسی خاندانی جگہ آ رہا۔ ایک نوجوان آدمی کا حال مجھے معلوم ہے کہ وہ شروع سے نہ باپ پاس رہا۔ نہ اُن سے پڑھا۔ لیکن باپ بیٹوں کا سوادِ خط اس قدر اشبہ ہے کہ تمیز نہیں ہو سکتی حضرت زید رضی اللہ عنہ جن کو لوگ۔ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا متبنّٰی سمجھ کر زید بن محمدؐ پکارتے تھے۔ گورے چٹے آدمی تھے۔ اور اُسامہ رضی اللہ عنہ کے فرزند سیہ فام اس سے لوگ ان کو چھیڑتے تھے۔ اور باپ بیٹے دونوں کو بُرا لگتا تھا۔ اور جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اُس خصوصیت کی وجہ سے جو زید کے ساتھ تھی، ایذا ہوتی تھی۔ ایک دن کا مذکور کہ زیدؓ اور اسامہؓ دونوں باپ بیٹے ایک چادر اوڑھے مسجد نبوی میں پڑے سوتے تھے۔ اور دونوں کے پاؤں چادر سے باہر نکلے ہوئے تھے ادھر سے کوئی قیافہ شناس ہو کر گزرا۔ اور بے اس کے کہ پہچانے دونوں کے پاؤں دیکھ کر کہنے لگا کہ واللہ یہ پاؤں ایک دوسرے کی نسل ہیں۔ یہ سنکر آنحضرتؐ کو بڑی ہی خوشی ہوئی۔ اور اس حکایت کو آپ نے کئی آدمیوں کے روبرو نقل کیا۔ ہم خیال نہیں کرتے ورنہ اس مشابہت کی مثالیں اس کثرت سے موجود ہیں کہ ہر فردِ بشر، ہر جانور، ہر پھل، ہر پھول، ہر پتا، اس کی گواہی دے رہا ہے بس شرافتِ نسب کی قدر کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم حقیقت میں اُن صفتوں کی قدر کرتے ہیں۔ جو بانی سلسلہ نسب میں تھیں۔ اور اُن صفتوں کے قابلِ قدر ہونے میں کسی کو گنجائشِ گفتگو نہیں تو قدرِ نسب میں کیوں ہو لیکن ہاں یہ بات بھی خیال کرنے کی ہے کہ تعلیم سے تربیت سے، دوسروں پاس اٹھنے بیٹھنے، رہنے سے بھی آدمی کے مزاج پر، اخلاق پر، عادت پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اور اچھوں کی اولاد بُری اور بُروں کی اچھی ہو جاتی ہے

اور یہی حال نباتات کی پود اور حیوانات کی نسل کا ہے۔ پھر بھی اصالت اپنا رنگ دکھلائے بدون نہیں رہتی ۔ اصل سے خطا نہیں ۔ اور کم اصل سے وفا نہیں ۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ میں مردوں کی طرف سے ایسا مطمئن نہیں ہوں جیسا عورتوں کی طرف سے ۔ کیونکہ جو چیزیں خارج سے مزاج پر اثر کرتی ہیں ۔ عورتیں اُن سے زیادہ محفوظ ہیں ۔ اُن کے پاس وہی موروثی اثاثہ ہے ۔ جو انہوں نے اپنے بڑوں سے پایا ۔ اور بس۔"

اس کے بعد جو کمیٹی کا جلسہ ہوا تو اس میں شرم پر گفتگو ہونی چاہیتی تھی ۔ مگر معلوم ہوا کہ سوائے ع کے اور کوئی گفتگو کے لئے طیار نہیں تو ع نے کہنا شروع کیا کہ " انسان میں بہت سی صفتیں ہیں ۔ جن کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کہلایا ان میں سب سے عمدہ سب سے زیادہ بکار آمد شرم ہے ۔ اگر ہم شرم کا مطلب دوسرے لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو شرم ایک طرح کا ڈر ہے کہ میں نے جو یہ بے جا بات کی ہے ۔ ایسا نہ ہو کسی پر ظاہر ہو جائے تو وہ میری نسبت کیا خیال کرے گا ۔ کہ یہ کیسا نالائق ہے ۔ تو اس ڈر کے لئے چاہیئے ۔ پہلے بُرے بھلے کی تمیز اور تمیز کے ساتھ اتنا اور کہ یہ بات بُری ہے تو مجھ کو کرنی زیبا نہیں ۔ اور یہی وجہ ہے کہ حیا کو جزو ایمان ٹھیرا کر فرمایا ہے ۔ الحیاءُ من الایمان کہنے کو تو شرم ایک چیز ہے مگر وہ اکھٹے تین کام دیتی ہے ۔ وقوع جرم سے پہلے تو اس کو قدرتی پریونٹو پولیس کا کانسٹبل یا کوئی اور عہدہ دار سمجھو جس کا کام ہے کہ جہاں تک ممکن ہے ۔ جرموں کا انسداد کرے ۔ دنیا میں کتنے گناہ ہیں ۔ جو شرم کی وجہ سے ہوتے نہیں پاتے ۔ دل میں ارادہ ہوتا ہے لیکن شرم دامنگیر ہو کر باز رکھتی ہے ۔ اور بندہ بشر ہے ۔ شرم مانع آتی ہی رہی اور اس سے قصور سرزد ہو گیا ۔ تو شرم ڈٹکٹو پولس کی طرح اس کو ماخوذ کرتی اور رنج بن کر اس کو سزا دیتی اور یہ افسوس کرتا کہ ہائے کیوں میں نے ایسا

جھک مارا اور آئندہ کے لئے اس سے مچلکہ مانگتی ہے کہ پھر ایسا نہیں کروں گا۔
خیر یہ تو مطلق شرم کی نسبت میں نے چند باتیں بیان کیں۔ اب مجھ کو اس شرم کے بارے میں کچھ کہنا چاہیئے جو شادی بیاہ کے معاملات میں کی جاتی ہے۔ عورت تو کوئی رذیل سے رذیل بھی اپنے بیاہ کی صلاح میں شریک نہیں ہوسکتی۔ میں سمجھتا ہوں وتنا تو نہیں مگر مردوں کا حال بھی قریب قریب عورتوں ہی کا سا ہے۔ پہلے مجھ کو تعجب ہوتا تھا کہ وہ ضرورت جو ہر فرد بشر کے پیچھے لگی ہے۔ اور خدا کی حکمت کاملہ اسی کی مقتضی ہوئی کہ اسی ضرورت کو دنیا کے بڑھنے اور باقی رہنے کا ذریعہ قرار دے۔ اتنی ساری شرم تو اس میں کہاں سے آ گھسی، بہت غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ ضرورت طرح طرح کے فسادات اور انواع و اقسام کے جھگڑوں کا پھاٹک ہے۔
اگر اس کو سختی کے ساتھ بند نہ رکھا جائے تو دنیا میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔ پہلا خون جو آدم کی نسل میں ہوا وہ اسی نالائق ضرورت کی وجہ سے ہوا کہ ہابیل نے عورت کے کارن اپنے بھائی قابیل کو مارا۔ اُس دن سے جو یہ پھاٹک تیغہ ہوا ہے تو آج تک تیغہ چلا جاتا ہے۔ اور اسی طرح روزِ قیامت تک تیغہ رہے گا۔ ضرورت کے لئے نکاح کی ایک کھڑکی کھلی رکھی گئی ہے۔ سو اس پر بھی جیسی کچھ روک ٹوک ہے آپ سب صاحبوں کو معلوم ہے، یہ روک ٹوک کی گئی تھی کسی مصلحت سے مگر لوگ اُس کی سختی کے متحمل نہ ہوسکے جس کا ضروری نتیجہ یہ ہوا کہ لگے دیواریں پھاندنے نقب لگانے، سرنگیں دوڑانے، میں خیال کرتا ہوں کہ پھاٹک کے چوپٹ کھول دینے سے اتنی خرابیاں نہ ہوتیں، جتنی ان ناجائز اور شرمناک رستوں سے ہوئیں اور ہوتی ہیں۔ اور ہوں گی۔ جب پہلے دن ہمارے دوست سید صادق نے بھری کمیٹی میں اپنا ارادہ تجرّد کا ظاہر کیا، تو مجھ کو سخت تعجب ہوا تھا۔ میں سید صادق کو ایسا ضابطہ اور مستقل مزاج آدمی سمجھتا ہوں کہ یہ مشکل سے مشکل بات کو بھی جی میں ٹھان لیں

توچاہے دُنیا اِدھر کی اُدھر ہوجائے۔ یہ اس کو پوراہی کرا تار ہیں۔لیکن جب انہوں نے تجرد کا نام لیا تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ الٰہی ہر سو میں دن ایک مہینے رمضان کے روزے تو پہاڑ کی طرح کٹتے ہیں۔ یہ ساری عمر کا روزہ ان سے کیوں کر نبھے گا! بارے لوگوں نے ان کو خوب ہی آڑے ہاتھوں لیا۔ اور چونکہ ہمارے سید صاحب منصف مزاج اور معقول پسند ہیں، یقین کرتا ہوں کہ انہوں نے اس خیال محال کو چھوڑ دیا ہے۔ یہ خدا کی ستاریاں ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو منہ دکھانے کے قابل بھی ہیں۔ ورنہ ؎

ٹھیرے ہے نہ پروانہ نہ روکے ہے زباں شمع وہ سوختنی ہے تو یہ گردن زدنی ہے

اخلاق کی کتابوں میں شرم کے تین درجے لکھے ہیں۔ ادنیٰ درجہ ہے کہ آدمی اپنے ابنائے جنس سے شرم کرے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ خدا سے شرم کرے اور سمجھے کہ وہ دانا ہے، نہاں و آشکارا ہمارے دلوں کے ارادوں تک سے واقف ہے اور ہم اندھیری رات میں ستر پردوں کے اندر کوئی کام کریں تو اور روزِ روشن میں ڈھول بجا کر کوٹھے پر چڑھ کر کریں تو اس کی نظر میں دونوں یکساں ہیں لیکن شرم کا ایک درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہے کہ آدمی کہ آدمی اپنے نفس سے شرم کرے۔ اور بُرے کام کرنے سے اس کو یہ خیال مانع ہو کہ یہ کام میری شان کے لائق نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ بڑے ہی شرمیلے تھے۔ یہاں تک کہ اکیلے مکان میں بھی برہنہ غسل نہیں کرتے تھے بے شک یہ ہے اعلیٰ درجے کی شرم جس کو خدا نصیب کرے۔ میں نے بہت غور کیا کہ ہم لوگوں کی شرم ان تین قسموں میں سے کس قسم کی ہے تو میری سمجھ میں یہ آیا کہ اس کو ایک قسم جداگانہ قرار دینا چاہیئے کہ گلگلوں کے تو نام سے چڑیں اور گڑ پائیں تو بھیلیاں کی بھیلیاں چٹ کر جائیں۔ غرض اس جھوٹی اور منافقانہ اور دکھاوے کی شرم کو شرم کہتے ہوئے

مجھ کو تو بہت ہی شرم آتی ہے۔ ایک بات اور ہے کہ یوں تو وہ شرم سے خارج ہے مگر ہے اسی کا ضمیمہ۔ چھوٹی عمر میں شادی کرنے کا دستور ہم مسلمانوں میں تو کم ہے مگر جیسی عمروں میں ہمارے یہاں اکثر شادی بیاہ ہوتے ہیں، لوگ اس کو بھی جلدی ہی سمجھتے ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ اسی سے ہماری نسلیں کمزور ہوتی اور عمریں گھٹتی چلی جاتی ہیں۔ اصل میں یہ اعتراض انگریزوں نے نکالا ہے۔ اور دوسرے ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے ہیں۔ لیکن اگر واقع میں ہماری نسلیں کمزور اور عمریں گھٹتی جاتی ہوں تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ جو قرار دیا جاتا ہے بلکہ اس کا سبب ہے ہمارا طرزِ تمدن کہ ہم لوگوں میں اصولِ صفائی کی مطلق رعایت نہیں۔ گنجان آبادی بند مکان، میلا پانی، گندی ہوا، آپ احدی، چلنے کے نہیں پھرنے کے نہیں۔ بل بوتہ آئے تو کہاں سے آئے؟ اور دیہات میں یہ خرابیاں کم ہیں۔ تو ویسے ہی وہاں کے لوگ موٹے تازے زبردست مضبوط چونچال جفاکش بھی ہوتے ہیں۔ ہم جیسے نہیں کہ چھینکنے سے ناک ملتی اور کھانسنے سے گولا اترتا۔ ملک کی آب و ہوا کہ یہاں مرد اور عورت جلد جوان ہو جاتے ہیں۔ اور سوسائٹی کی حالت دیکھ کر میں مسلمانوں کو شادی بیاہ میں دیر لگانے کی ہرگز رائے نہیں دوں گا۔ کہ کوارے میری جان کو کوسیں۔ اگر ہمارے یہاں کچھ جلدی ہوتی ہے اور اس سے کچھ قباحت لازم آتی ہے تو وہ اس قباحت بلکہ اُن قباحتوں کے آگے ہرگز قابلِ لحاظ نہیں جن کا دیر کی صورت میں پیدا ہونا کچھ بعید نہیں۔ بلا سے آگے کو نسل چلے اور مرجیونی ہو۔ اور ہم بھلے مانس رہیں۔ بہتر ہے اس سے کہ چلے ہی نہیں، یا چلے اور بعد خرابی ... ... چلے؟"

ہماری کمیٹی کی کتاب روداد بہت ضخیم ہو گئی ہے۔ مگر میں نے ضروری مطالب اس میں سے اخذ کر لئے ہیں، آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جو شخص اس کمیٹی کا ممبر ہو اور صرف ممبر ہی نہیں بلکہ سکرٹری بھی، شادی بیاہ کے بارے میں اُس کے کیسے خیالات

ہونے چاہئیں. چنانچہ اسی کیٹی کی تعلیم کا اثر ہے کہ میں نے جھوٹی شرم کو بالائے طاق رکھ کر یہ عریضہ لکھا ہے، مجھ کو اس کے بھیجنے میں شرم تو مانع ہو ہی نہیں سکتی تھی مگر ہاں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ ایسا نہ ہو آپ بُرا مانیں اور بیٹھے بٹھائے آپ کو یا کسی کو رنج دینا، گو وہ رنج بے اصل اور بلا وجہ معقول ہی کیوں نہ ہو، میں جائز نہیں رکھتا لیکن آخر میں نے سوچا کہ جب میں نے فیصلہ کر لیا کہ نکاح کروں گا تو کیوں میں اپنی تجویز سے نہ کروں اس کا نتیجہ بھلا یا بُرا خود میں بھگتوں گا۔ میں ننّا بچہ نہیں کہ اپنے نیک و بد میں تمیز نہ کر سکوں ایسا بڑا ضروری کام جس پر میری آیندہ کی زندگی کا بہبالی اور ناکامیابی، خوشی اور ناخوشی موقوف ہوگی دوسروں کے سر ڈال کر میں بیٹھا تماشا دیکھا کروں تو مجھ سا احمق کون؟ اُن حالات سے جو میں نے سُنے تھے میں نے آپ ہی کے سایہ میں عافیت اور آسائش دیکھی، مجھ کو اس خط کے بھیجنے سے حقیقت میں اس بات کی ٹٹول منظور ہے کہ میں نے جیسا کچھ آپ کو سمجھا ہے اس میں غلطی تو نہیں کی اگر آپ نے میری اس جسارت کو گستاخی اور بے تمیزی اور بیہودگی اور بیحیائی خیال فرمایا تو میں سمجھوں گا کہ نہ میں آپ کے ڈھب کا اور نہ آپ میرے ڈھب کے لیکن مجھ کو امید نہیں کہ آپ ایسا خیال فرمائیں، کیا ضرورت تھی کہ میں مشاطہ کے ہاتھ رقعہ یا اسم نویسی بھیجتا پھروں؟ یہ بھی ایک قسم کا رقعہ ہی ہے. مگر ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ میں نے اپنے دلی خیالات تک اس میں ظاہر کر دیئے ہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ میں نے اپنا حال پوست کندہ بیان کرنے میں کچھ اٹھا رکھا ہے. میں اپنا فوٹو بھی اس میں ملفوف کرتا ہوں تاکہ تعلق سے پہلے میں آپ کو اپنے بارے میں ہر طرح کی معلومات بہم پہنچانے کا موقع دوں نہ کہ آپ کے حالات کی تفتیش، جب تک میں نے بخوبی نہیں کر لی اس خط کے لکھنے کے لئے قلم نہیں اٹھایا. میں آپ سے اتنی بات بھی کیوں چھپاؤں کہ میں زیادہ تر اُسی صفت کا گرویدہ ہوا ہوں جس سے لوگ بھڑکتے ہیں، عالمِ ارواح کے ساتھ ایسا قوی تعلق ایک نعمتِ خداداد ہے اور سخت افسوس کی بات ہوگی اگر کسی ناقدر دان کے پلّے پڑ سے. فقط

راقم سید صادق، از بنارس

آٹھویں فصل

صادق صادقہ کے بیاہ کے بارے میں صادقہ کے میکے والوں کی صلاحیں

میر صاحب کو بھلا کچھ نہیں تو خط پڑھنے اور سمجھنے ایک گھنٹہ تو لگا ہوگا اتنا صبر تو کیوں کر ہو سکتا تھا کہ خط کے تمام کرنے تک تصویر نہ دیکھتے۔ جب جب ص کا نام آتا تھا، کہتے تھے ہو نہ ہو اس سے مراد خود سیّد صادق ہے۔ اور اس خیال کے ساتھ ہر بار بے اختیار تصویر پر نظر کر لیتے تھے۔ سارا خط پڑھ چکے تو ایک آنکھ بند کی اور دوسری کے آگے مٹھی کی دوربین لگائی اور کبھی دور سے اور کبھی نزدیک سے کبھی اس پہلو سے کبھی اُس پہلو سے تصویر کو تا دیر بہت ہی غور سے دیکھا۔ صورت پر متانت، شرافت ذہانت پڑی برس رہی تھی اور انگریزی لباس کے سوائے کوئی چیز نہ تھی جو نظر میں کھٹکے۔ غرض میر صاحب نے تو اُسی وقت سے بیٹی کا دینا بچار لیا۔ ایک ہاتھ میں خط دوسرے میں تصویر گھر میں آئے اور بی بی سے کہا "گلوری تو تم تھوک ہی چکی ہو۔ لو اب غصہ کو بھی تھوک دو۔ میں ایک خوش خبری لایا ہوں، بنارس سے ایک شخص نے صادقہ کا پیام دیا ہے۔ اور لو یہ اُس کی تصویر ہے۔"

بی بی۔ (تصویر دیکھ کر) "اوئی یہ مردوا کیسا؟ یہ تو کوئی نگوڑا انگریز معلوم ہوتا ہے۔"

میاں۔ "بہت سے ہندوستانیوں نے انگریزی لباس اختیار کر لیا ہے اور جتنے انگریزی خواں ہیں سب کی یہی وضع ہوتی جاتی ہے۔ مگر یہ شخص مسلمان ہے اور ذات کا سیّد ہے سیّد احمد خاں کا نام تم نے سنا ہوا اُن کے مدرسے میں پڑھتا ہے۔ بی۔ اے پاس ہے۔"

بی بی۔ "سیّد احمد خاں وہ تو نہیں علی گڑھ والے؟"

میاں۔ "ہاں وہی سیّد احمد خاں وہ اصل میں ہماری دلی کے ہیں۔ انہوں نے علیگڈہ

میں بڑا بھاری مدرسہ جاری کر رکھا ہے، اور آپ بھی وہیں رہتے ہیں۔"

بی بی :"کہو۔ میں اُن کے خاندان کے بہت لوگوں سے واقف ہوں۔ لیکن وہ تو بہت بدنام ہیں۔ کہتے ہیں۔ انہوں نے اپنا مذہب بدل ڈالا ہے۔ اور مسلمانوں کو دین سے بے دین کیے ڈالتے ہیں۔"

میاں :"بس یہی بے دینی ہے۔ جو تم اس تصویر میں دیکھتی ہو۔"

بی بی :"میں نے سنا ہے انگریزوں کے ساتھ کھاتے ہیں۔"

میاں :"یہ بھی سچ ہے۔"

بی بی :"پھر تو دین آپ سے آپ بدلا۔"

میاں :"کیسی باتیں کرتی ہو۔ کہیں دین بھی کھانے پہننے سے بدلا ہے؟"

بی بی :"کھانے پہننے سے دین نہیں بدلتا تو کسی ہندو کو اپنے گھر کا پانی تو پلا دیکھو۔"

میاں :"پھر کیا تم ہندنی ہو؟"

بی بی :"خدا نہ کرے میں کیوں ہندنی ہونے لگی تھی!"

میاں :"تو بی بی بیگم ہم مسلمانوں کا دین ایسا بودا نہیں ہے کہ کھانے پہننے سے جاتا رہے۔"

بی بی :"پھر شہر میں سید احمد خاں کا اتنا غل کیوں ہے؟"

میاں :"یہ تو اُن لوگوں سے پوچھنا چاہیئے جنہوں نے غل مچا رکھا ہے۔ میں تو سید احمد خاں کو اچھا خاصہ مسلمان سمجھتا ہوں۔ اور اپنے سے بہتر، سید آلِ رسولؐ۔ مسلمانوں کے خیر خواہ۔ مسلمانوں کی بہتری چاہنے والے۔"

بی بی :"تو یہ مردوا بھی اُن ہی کے دین میں ہوگا؟"

میاں :"اُن کا دین کیا معنی، دین خدا کا، یہ شخص بھی مسلمان کے گھر پیدا ہوا۔ اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے۔ کتاب کی کتاب خط لکھا ہے۔ اس میں ایک حرف دین کے خلاف نہیں۔ جگہ جگہ قرآن کی آیتوں اور حدیثوں کے حوالے دیتا ہے۔ اور مسلمان کیسے ہوتے

ہیں مسلمانوں کے سر دل میں کچھ سینگ نہیں لگے ہوتے کہ اس کے سر میں نہیں ہیں۔ گھر کی زمینداری ہے۔ خوش حال باپ کا بیٹا ہے۔ کہ آج مڈل پاس نہیں بیٹے۔ یہ بی۔اے پاس کر چکا ہے۔ اور ابھی پڑھ رہا ہے۔ صورت دیکھو اچھی خاصی بھلے مانسوں کی سی، تمہارے دوسرے دونوں دامادوں سے زیادہ شاندار۔ کوئی عیب نہیں۔ نقصان نہیں۔ میری صلاح مانو تو آنکھ بند کر کے صادقہ کا ہاتھ پکڑا دو۔ پھر ایسی جگہ نہیں ملے گی۔ اور ایسی کے کیا معنی، ملے ہی گی نہیں۔ دیر آید درست آید، اسی کو کہتے ہیں کہ بے چاری صادقہ اتنے دنوں بیٹھی تو خدا نے اس کو بر بھی اسی کے لائق دیا۔ اور مزہ یہ کہ وہ ریجھا ہے اس کے ان ہی خوبیوں پر جن کی وجہ سے کوئی اس کو پوچھتا نہیں۔

بی بی:- دیکھو صاحب بیٹی جیسی میری ویسی تمہاری جو سمجھ میں آئے سو کرو میں تو صادقہ کے بارے میں ایسی عاجز آئی ہوں کہ کچھ کہہ ہی نہیں سکتی۔ یہ میری آنکھوں کے آگے چلتی ہے پھرتی ہے اور میں ہوں کہ اس کو دیکھ دیکھ کر سہمی چلی جاتی ہوں کہ الٰہی کیا ہوگا؟ اور کب تک بیٹھی رہے گی؟ اور اس کے دل میں آپ کیا کیا باتیں آتی ہوں گی؟ چھوٹی بہنیں اس کے دیکھتے گھر بار کی ہو گئیں۔ اور اسی کی تقدیر کھوٹی وہ تو یوں کہو کہ میری ذات ہے اور یہ بھی نیک کہ اس نے اپنی زندگی میں آج تک بات منہ سے نہیں نکالی۔ ورنہ اور کسی کی ہوتی تو ہر جلسے ہر بہانے رشتے کا منہ کھانے کو دوڑتی، پر ہاں اتنا ضرور خیال کر لینا کہ کسی کو یہ کہنے کو نہ ہو کہ بیٹی کو کہیں بر نصیب نہ ہوا تو گورستان کے گلے مڑھی۔"

میاں:- میں کیا خدانخواستہ اپنی اولاد کا دشمن ہوں یا ہم نے یہ بیٹی کہیں کوڑے پر سے پڑی پائی ہے؟ دنیا میں رہ کر ناک تھوڑی ہی کٹوانی ہے۔ پوچھوں گا تحقیق کروں گا۔ چار کی صلاح لوں گا۔ پھر بات سو بات۔ بس ذرا انگریزی وضع دیکھ کر جی ہچکچاتا ہے، ورنہ میں تو آج ہی جواب لکھ بھیجتا کہ ہم کو منظور ہے۔"

میر صاحب نے اپنے طور پر بہت چھانا۔ پیام تو سید صادق کا اور لوگ علیگڈھ کالج کا نام سنتے کے ساتھ ہی خواہی نہ خواہی ذکر نکال گھڑا کر نے سید احمد خاں کا۔ کوئی کافر بتاتا، کوئی مرتد، کوئی نیچری، کوئی لامذہب، کوئی کرسٹان، صرف سید احمد خاں ہی کو نہیں بلکہ اُن کے کالج کے مدرسوں کو، طالب العلموں کو۔ یہاں تک کالج کے سقّے دھوبی اور چوکیدار اور باورچی کو۔ مگر جو عقلِ معاش رکھتے تھے اور اپنی اولاد کو معاش پیدا کرنے کا سلیقہ سکھانا چاہتے تھے۔ وہ سید احمد خاں کی اور اُن کے کالج کی مدح ہی کرتے تھے۔ بعض کو بعض عقائد میں کلام تھا اور بعض کو وہ بھی نہیں تو میر صاحب نے اپنے جی میں سوچا کہ مجھ کو تو سید صادق کا حال دریافت کرنا منظور ہے۔ اُن کے خط سے تو کوئی بدعقیدتی ظاہر نہیں ہوتی۔ اب رہیں دو باتیں ایک علی گڈھ کالج کا پڑھنا، دوسرے انگریزی وضع، علی گڈھ کالج بے شک سید احمد خاں نے کھولا، سید احمد خاں نے جمایا۔ اور سید احمد خاں اُس کو چلا رہے ہیں۔ اور اُن کو کالج کے انتظام میں بھی بڑا دخل ہوگا۔ لیکن وہ مدرس نہیں لکچرار نہیں خدا جانے کس کے پاس کالج کی رپورٹ نظر پڑی تھی، درسی کتابیں وہی تھیں، جو دوسرے مدرسوں میں ہیں۔ تو سید احمد خاں کی وجہ سے طالب العلموں پر کیوں بدگمانی کی جائے۔ اور یوں خدا بن کر بیٹھو اور لگو بندوں سے حساب لینے تو جس کو چاہو کافر بناؤ، جس کو چاہو مرتد ٹھیراؤ۔ آدمی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے تو آپ سب سے بدتر ہے، ہم ہی ایسے کون سے عمل اچھے کر رہے ہیں کہ دوسروں پر حرف رکھیں۔ یہ تو لوگوں کی سراسر زیادتی ہے۔ ہاں انگریزی وضع دیکھ کر عورتیں ضرور بد کہیں گی۔ اور لوگوں کو بھی باتیں بنانے کا موقع ملے گا۔ سو ایسی کیا تدبیر کی جائے کہ یہ بے لطفی پیش نہ آئے۔ سید صادق سے تو مجھ کو یہ کہنے کا منصب ہی نہیں کہ تم بضرورت اس کو ہمیشہ کے لئے یا تھوڑی دیر کے لئے بھی ترک کرو۔ انھوں نے

اتفاقی طور پر خط میں اپنی کمیٹی کے پریزیڈنٹ کی ایک رائے اپنی نسبت نقل کی ہے
پریزیڈنٹ نے ایک محل پر کہا کہ "میں سید صادق کو ایسا ضابط اور مستقل مزاج
آدمی سمجھتا ہوں کہ یہ مشکل سے مشکل بات کو بھی جی میں ٹھان لیں تو چاہے دنیا ادھر کی
اُدھر ہو جائے یہ اُس کو پورا ہی کر اتاریں"۔ یہ بات ضروری ہے کہ سید صادق میرے
ساتھ فرزندانہ تعلق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور وہ مجھ سے عمر میں بھی بہت چھوٹے ہیں
مگر بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال۔ کہاں وہ بی اے پاس اور کہاں میں کہ مڈل کا
امتحان دینا چاہوں تو نہیں دے سکتا۔ خدا نے کچھ ہم لوگوں کی طبیعتیں ہی ان چیزوں
کے مناسب نہیں بنائیں۔ مدرسے کے ذرا ذرا سے لڑکے حساب کے ایسے ایسے پیچیدہ
سوال چٹکی بجانے میں حل کرتے ہیں کہ میں مہینوں غور کرتا رہوں تو نہ بتا سکوں۔
ہمارے وقتوں میں تاریخ اور جغرافیہ اور طبیعیات اور ریاضی اور ہیئات کی باتیں
کون جانتا تھا۔ فارسی میں زلیخا اور بہار دانش پڑھ لی۔ عربی میں ہدایۃ النحو۔ خاصے
مولوی بن گئے۔ بس میں جو سید صادق کو عقل سکھانی چاہوں تو میری نادانی ہے
انہوں نے انگریزی وضع اختیار کی ہے۔ تو سوچ سمجھ کر کی ہوگی۔ اور کر لی ہے تو وہ
اس کو چھوڑنے کیوں لگے۔ غرض ان سے تو ترک وضع کی امید رکھنی ہی فضول ہے اور
جیسے سید صادق سے ترک وضع کی امید نہیں۔ ویسے ہی ادھر والوں سے بھی توقع
نہیں کہ اس وضع کے آدمی کے ساتھ وصلت کو جائز رکھیں۔ کہنے والوں کا تو کچھ نہیں
ممکن ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ لیکن بیٹی ذات کا سر پر ماں موجود ایک چھوڑ
دو دو بہنیں۔ چھوٹی ہی سہی مگر ہیں تو بیاہی ہوئیں، صاحب اولاد۔ کیونکر ہو سکتا ہے
کہ ایک گھر کے بسانے کے پیچھے اتنے گھروں کو اُجاڑ بیٹھوں، اُدھر ایک تو پردیس اور
پردیس سے بڑھ کر انگریزی وضع اور ادھر صادقہ کی عمر خواہوں کی وجہ سے اُس کی
نسبت عام واہمہ عجب تردد کا مقام ہے۔ ع گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔

میر خسرو اسی سوچ میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں میاں مُشیر آنکلے۔ مشیر سے اور میر خسرو سے دُور کا رشتہ بھی تھا۔ دونوں ہم عمر اور کسی زمانے میں ہم مکتب بھی رہے تھے۔ دونوں میں گاڑھی دوستی نہ تھی تو چنداں اجنبیت بھی نہ تھی۔ صادقہ کا حال رشتہ دار تو رشتہ دار سرسری جان پہچان والوں سے بھی کسی پر چھپا نہ تھا۔ میر خسرو کو متردد دیکھ کر چھوٹتے ہی مشیر نے پوچھا "خیریت تو ہے؟ آج تو کچھ بہت ہی پریشان معلوم ہوتے ہو"

میر خسرو۔ "دیکھتے ہی ہو نہ۔ دُنیا میں خانہ داری کی بھی نسی ہی خوار ہے۔"

مشیر۔ "ماشاءاللہ چشم بد دور، ظاہر حال تو پریشانی کی کوئی وجہ ہے نہیں۔ اور یوں تو دُنیا کے رگڑے جھگڑے چلے ہی جاتے ہیں۔ اگر کوئی کارِ خدمت اس نالائق کے قابل ہو تو تم کو میرے ہی سر کی قسم فرما دینے میں ہرگز تامل نہ کرنا۔"

میر خسرو۔ "جزاک اللہ تم سے یہی توقع ہے۔ مگر بعض مواقع ایسے پیش آجاتے ہیں کہ کسی کی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ تم کو میری بڑی لڑکی کا حال تو معلوم ہی ہے علیگڈھ سے ملکہ علی گڈھ کا بھی کیوں نام لوں۔ بنارس سے اُس کا پیام آیا ہے۔ سب باتیں اچھی ہیں۔ لڑکا ذات کا سید ہے۔ بی، اے پاس ہے۔ خوش رو بھی ہے۔"

مشیر۔ (بات توڑ کر) "از برائے خدا آنکھیں میچ کر منظور کر لو۔"

میر خسرو۔ "ہاں میری بھی یہی رائے ہے۔ اور منظور نہ کروں گا تو کیا کروں گا کچھ یوں ہی سا خیال تو پردیس کا تھا۔ سو اس کو بھی میں نے جانے دیا۔ ایک بڑی مشکل یہ واقع ہوئی ہے کہ لڑکا علی گڑھ کالج میں پڑھتا ہے۔ عقیدے کی خبر تو خدا کو ہے۔ مگر ظاہری وضع بالکل وہی سید احمد خانیوں کی سی ہے۔ اس کو کیا کیا جائے؟ بھلا اور نہیں تو لڑکی کی ماں کا راضی کرنا مقدم ہے۔ سو میں یہی بیٹھا سوچ رہا تھا کہ مولویوں سے فتویٰ لوں، وعظ کہلواؤں کیا کروں؟"

مشیر۔ "مولویوں کی طرف سے تو ہاتھ دھو رکھیئے۔ یہ مولوی یوں بات بات میں

ایک دوسرے سے لڑتے بھی ہیں جھگڑتے بھی ہیں۔ یہاں تک کہ سارے شہر میں کوئی ایک مولوی بھی ایسا نہیں نکلے گا جس کی نسبت کفر کے فتوے نہ لکھے گئے ہوں مسلمانوں میں جتنے مولوی و تنے گروہ۔ ایک کے پیچھے ایک بلکہ ایک کے ساتھ ایک نماز پڑھنے تک کا روادار نہیں۔ پھوٹ تو اس قدر ہے۔ مگر سید احمد خان کو تو کوئی بھی اچھا نہیں کہتا۔ اور میری نظر میں تو ایک مولوی بھی نہیں آتا۔ جو انگریزی وضع کے جواز کا فتوے دے۔ اور کوئی مسئلہ ہوتا تو میں جیسا کہتے فتویٰ لکھوا کر لا دیتا کچھ بڑی بات نہ تھی۔ ایک وقت کی دعوت کر دو، اور مولوی صاحب کو چاہو کھلاؤ نہیں، اُن کا حصہ اُن کے گھر پہنچا دو۔ پھر جیسا چاہو فتوے لکھوا لو، اور جب اور جتنی دیر چاہو وعظ کہلوا لو۔ لیکن انگریزی کے نام سے تو سبھی مولوی بدکتے ہیں۔ جانتے ہیں نہ کہ یہی انگریزیت ایک نہ ایک دن دنیا جہان سے مولویوں کا کھوج کھو کر رہے گی۔ تو میری صلاح تو یہ ہے کہ مولویوں کا نام ہی نہ لو۔ ان سے تو کچھ ہونا ہوانا نہیں، اپنی قوتِ بیانیہ کو کام میں لاؤ۔ اور کسی قدر اپنا زور بھی دکھاؤ۔ ایسا بھی کیا ہے کہ تمہارا کہنا نہ چلے۔ یا ہاں خوب خیال آیا۔ فریقِ ثانی سے شرط کر لو کہ نکاح کے لئے اپنے ملکی لباس میں آئیں۔ آخر سمجھدار لوگ ہیں۔ اتنی دیر میں کیا ہوا جاتا ہے۔ پھر نکاح ہوئے پیچھے اُن کو اختیار رہے۔"

بات معقول تھی، آخر میر خسرو کی بھی یہی رائے قرار پائی کہ دھوم دھڑکا غل، غپاڑا مہمان داری کچھ نہ کرو۔ اور چپ چپاتے نکاح کر دو۔ سید صادق آدمی ہے معقول پسند ضرور رضامند ہو جائے گا۔ بڑی رضامندی تو صادقہ کی ماں کا ہے وہ ہاں کر لیں تو میں سید صادق کو خط لکھے بھیجتا ہوں۔ ایک دن کے لئے چلے آئیں اور نکاح پڑھا کر چاہے بی بی کو ساتھ لے جائیں اور چاہے یہیں رہنے دیں جیسی اُن کی مرضی، چنانچہ ایک دن موقع پا کر میر خسرو نے بی بی سے کہا: "کیوں صاحب وہ

صادقہ کی بات کیا ٹھیری؟"

بی بی:۔ "ٹھیرتی ٹھیرانی کیا؟ کسی اس شہر والے کا پیام ہوتا تو میں سو جتن کرتی۔ اپنی آنکھوں سے لڑکے کو دیکھتی۔ گھر کا چال چلن دریافت کرتی۔ اصل حقیقت کھلتی ہی کھلتی"۔

میاں:۔ "خط سے بڑھ کر اور کیا حقیقت کھلتی؟ اُس بے چارے نے کوئی بات اٹھا نہیں رکھی۔ اس قدر حال تو برسوں کے پاس رہنے سے بھی معلوم نہیں ہو سکتا اور خط کا ذمہ میں لیتا ہوں کہ اُس میں ایک حرف کی کمی بیشی ہے نہیں۔ بس جو رُوداد ہے، سو یہ ہے۔ اب اس پر کہو کہ تمہاری کیا رائے ہے"؟

بی بی:۔ "یہ تصویر ہی دیکھ کر طبیعت رُکتی ہے۔ اور کیوں جی، اگر کہے سُننے سے لڑکا مان جائے اور ہمارے یہاں کا جوڑا پہن کر آئے"۔

میاں:۔ "ممکن نہیں ایسا تو بھول کر بھی خیال نہ کرنا۔ تم اُس کو کہتی ہو لڑکا! اجی ہم تم جیسے تو اُس کے ناخونوں میں پڑے ہیں۔ مجھ کو تو اس سے بات کرتے ہوئے بھی لحاظ آتا ہے۔ کیا بتاؤں کہ وہ کس رُتبے کا آدمی ہے۔ تمہارے شہر میں اُس کی لیاقت کے شاید دس آدمی بھی نہ ہوں گے"۔

بی بی:۔ "خیر تم آپ نہ لکھو تو کسی سے لکھوا بھیجو دیکھو تو کیا جواب آتا ہے"۔

میاں:۔ "تم ان لوگوں کے دستور قاعدے سے واقف نہیں ہو۔ یہ انگریزی مزاج کے لوگ ہیں۔ اپنی عقل کے آگے کسی کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے، ہمارے دیس کے مسلمانوں میں سب سے پہلے یہ وضع سید احمد خاں نے اختیار کی، ساری دنیا ہی نے تو اُن کو چھیڑا، ڈرایا، دھمکایا، ملامت کی، مگر آدمی ارادے کا اتنا تو پکا ہو لے تب کسی کام کا بیڑا اُٹھائے۔ انھوں نے جو قدم بڑھایا تھا اُسی پہ جمے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں کو اپنی وردی پہنا دی۔ اور یہ صاحب بھی اُسی جتھے کے ہیں۔ اِن سے

ترک وضع کو کہنا ان کو چڑانا ہے۔"

بی بی: "تم تو کچھ ایسے ڈرتے ہو کہ خدا کی پناہ۔ داماد صاحب کیا آتے ہیں گویا ہمارے حاکم بن کر آتے ہیں۔ اچھا میں اپنی طرف سے لکھوانی ہوں۔"

میاں: "خواہ مخواہ بھی میں آج ہی انکار لکھ بھیجتا ہوں۔ تم بیٹی لکھوایا کرنا۔"

بی بی: "میری کیا جوتی کو غرض پڑی ہے۔ کرسٹان کو بیٹی دے کر کون اپنی ناک کٹوائے اس مردوے کو یہ نہ سوجھا کہ میں کس منہ سے ایک بھلے مانس کے گھر پیغام دیتا ہوں اس کی لیاقت کو لگاؤں جھلسا، نگوڑا بے دین، انگریزوں کا جھوٹا کھانے والا۔ اپنی صادقہ کے بائیں پاؤں پر اس کو وار کے پھینک دوں، پادریوں کے یہاں بہتیری چڑیاں بھری پڑی ہیں۔ ان میں گیا ہوتا جیسی روح ویسے فرشتے۔"

میاں: "تم ایک مرد آدمی کو اس کے پیٹھ پیچھے ناحق اتنا کیوں نضیحت کرتی ہو جس کے گھر میں بیری ہوتی ہے پتھر آیا ہی کرتے ہیں نہیں کرنا منظور سیدھا جواب دیدیا۔"

بی بی: "مرد آدمی، ایسے ہی مرد آدمی ہوتے ہونگے؟ تمہارا بس چلے تو کنواں دیکھو نہ کھائی، بیٹی کو آنکھ بند کرکے دھکا دے دو۔"

میاں: "ہاں جی ہاں، میں تو اولاد کا ایسا ہی دشمن ہوں۔"

بی بی: "کیا دشمن کے سر میں سینگ ہوتے ہیں، اور تم بے چارے کیا دشمنی کروگے؟ میں جیتی بیٹھی ہوں۔ تمہاری دشمنی کو کب چلنے دیتی ہوں بس آج سے اس کی بات میں دخل دیا تو تم جانو گے۔"

سیدانی کو جلال آیا۔ تو کون رو کے آخر بے چارے میر صاحب طرح دیکر ٹل گئے۔

نویں فصل

ماں صادقہ کی جدائی کے خیال سے کڑھتی اور میاں بی بی کو تسلی دیتے ہیں

ادھر تو یہ جھگڑے پڑے ہوئے تھے، اُدھر جس رات صادقہ نے پہلا خواب دیکھا اس کے اگلے ہی دن سے ماں کو سامانِ خانہ داری سنبھالنا سمجھانا شروع کر دیا تھا۔ بلکہ ماں نے پوچھا بھی کہ کیا ہوا بات تو کہو، میں نے تو تمہیں کبھی بھول کر بھی آدھی بات نہیں کہی اور کہتی کیوں؟ کیا میرا سر پھرا تھا؟ تم ایسا کوئی کام ہی نہیں کرتیں۔ سارا گھر تم پر چھوڑ کر مہمان داخل دوروٹیاں میں بھی کھا لیتی ہوں۔ کبھی کچھ دخل دیا ہو تو تم ہی بتاؤ۔ رہے بھائی بہن۔ مجھ سے تو لڑ بھی لیں جھگڑ بھی لیں تم نے کچھ ایسا سدا رکھا ہے کہ کوئی تمہارے حکم سے باہر نہیں۔ تم اٹھاؤ تو اٹھیں اور بٹھاؤ تو بیٹھیں۔ باپ کا حال تم دیکھ ہی رہی ہو کہ بے تمہاری صلاح کے تنکا نہیں توڑتے۔ اور میری ان کی تو افتاد کچھ اسی طرح کی پڑ گئی ہے کہ بات بات میں ردّوکد ہوتی رہتی ہے۔ اور یہ اللہ بخشے تمہاری نانی کے ڈھنگ ڈالے ہوئے ہیں۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ جہاں تک ہو سکے مرد سے دبے ہی نہیں سو تمہارے باپ ایسے ٹھنڈے مزاج کے آدمی ہیں کہ ان کو کچھ ہی کہو لوٹ کر جواب دینا نہیں جانتے۔ اور تم ہو تو بیٹی مگر خاص کر تمہارا اتنا لحاظ کرتے ہیں کہ تمہارے ہاتھ سے پانی تک پینے کے روادار نہیں۔ تو بیٹی ایسا کیا قصور ہوا کہ تم گھر کی چیز بست مجھ کو دکھاتی سمجھاتی ہو؟"

صادقہ:" اماں جان نہیں یہ بات نہیں۔ میں تو بال بال تم سب کی احسان مند ہوں، اور اس گھر میں ایسی لالوں کی لال بن کر رہی ہوں کہ کیا کوئی بیٹی میکے میں رہے گی۔ مگر اماں جان اچھی بات ہے۔ تم کو بھی ہر ایک چیز کا حال معلوم رہے

خدا جانے کیا اتفاق پیش آئے۔ کوئی چیز درکار ہوئی، وقت پر جا کر نکال تو لاؤ گی اب تو تم اتنا بھی نہیں جانتیں کہ نمک کس کلھڑے میں ہے۔ اور ہے بھی یا نہیں؟"

صادقہ کا جہیز تو برسوں سے بنا ہوا تیار رکھا تھا۔ اور صندوق اور کوٹھڑیوں کی کنجیاں اسی کے پاس تھیں اور یہی سارے گھر کی مالک و مختار تھی۔ ہمراز نے بہت دنوں سے اس کی جھولنیاں نمونے کے لئے منگوا بھیجی تھیں۔ اب صادقہ نے واپس طلب کیں تو ہمراز نے جواب دیا کہ کمبخت سنار ایسے وعدہ خلاف ہوتے ہیں کہ ہر روز آج کل کرتا ہے۔ اب تک تو دیں نہیں۔ اب کل سے میں اس کے سر پر ایک آدمی بٹھاؤں گی۔ اور اگلے جمعے تک ضرور ضرور آپ جھولنیاں لے کر آؤں گی۔ میری جھولنیاں آلیں اُن سے ملاؤں تب واپس کروں۔ جمعے کے دن صادقہ سب کو دے دلا کر کھانا کھانے بیٹھی تھی کہ ہمراز جھولنیاں لئے ہوئے آپہونچی، وہ بہتیرا عذر کرتی رہی، صادقہ نے زبردستی ہاتھ پکڑ کر کھانے پر بٹھا لیا۔ کھانے کے بعد ہمراز نے دونوں جوڑیاں نکال صادقہ کے آگے ڈال دیں کہ لو اپنی پہچان لو۔ ہرچند صادقہ نے دیکھا کوئی تمیز نہیں ہوتی تھی۔ آخر ہلکی جوڑی کو کہا کہ یہ ہمارے یہاں کی ہوگی ہمراز بولی نہیں بھاری جوڑی تو تمہاری ہی ہے۔ بنواتی تو میں بھی اتنی ہی بھاری مگر اس وقت ہاتھ تلے روپے نہ تھے۔"

صادقہ: "پھر تم بھاری جوڑی رہنے دو۔"

ہمراز: "آگ لگے مجھ بہنتی کو، تمہاری تم کو مبارک۔ الٰہی چھپکے کے بالے پہنے کبھی وہ دن بھی ہوگا کہ میں تم کو دولہن بنی دیکھوں گی۔"

صادقہ: "تم نے آخر دعائیں مانگ مانگ کر اس دن کو بلا یا ہی بلایا!"

ہمراز: "سچ کہو؟ کہیں بات ٹھہر گئی کیا؟"

صادقہ: "ٹھیری ٹھیرائی تو نہیں، مگر میں نے اوپر تلے تین خواب دیکھے ہیں۔ اس کے

بعد صادقہ نے اپنے خواب، اُن کی تعبیر، بنارس سے خط کا آنا، ماں باپ کی تکرار سارا قصہ ہمراز کو کہہ سُنایا کہ تم چلتے ہوئے اماں سے کہتی جانا اور اُن کو سمجھا دینا کہ جہاں خدا کو منظور تھا میری تقدیر کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ ابا جان سے لڑیں جھگڑیں نہیں۔ اور مذہب کے شبہے کو بھی دل سے نکال ڈالیں کہ یہ بات ہے بے اصل، جو لوگ ایسی تہمت رکھتے ہیں ناحق ایک مسلمان کا گناہ سمیٹتے ہیں۔"

آدمی کی طبیعت کا بھی عجب حال ہے، ذرا سے میں خوش ذرا سے میں آزردہ صادقہ کی ماں یا تو صادقہ کے بیاہ کی دعائیں مانگتی تھی یا اب جو ہمراز نے صادقہ کا پیام جاکر دیا تو سنتے کے ساتھ ہی منہ فق ہی تو ہو گیا۔ اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ اس سے پہلے ایک چھوڑ دو دو بیٹیاں بیاہ چکی تھیں اور وہ خیر بہت آرام میں نہ تھیں تو چنداں تکلیف میں بھی نہ تھیں۔ جیسی رسمی خانہ داریاں ہوتی ہیں اُن کی بھی تھیں۔ مگر صادقہ کا بیاہا جانا تھا۔ ماں کو حقیقت میں معلوم نہ تھا کہ اس بیٹی کے ساتھ اس کو کیسا تعلق ہے۔ یہ بیٹی اس کی بائیس برس کی رفیق تھی کہ ایک دن کو ماں سے جدا نہیں ہوئی، اور رفیق بھی ایسی کہ جب سے ہوش سنبھالا ماں کو پلنگ سے اُترنے نہیں دیا، دایہ گری یہ کرے، ماماگری یہ کرے، منغلانیوں کا کام یہ دے۔ بال بچوں کو نہلا دُھلا کے کپڑے بدلوائے، ان کی دوا درمن کھانے پینے کی خبر رکھے۔ گری پڑی چیز سینتے اٹھائے، بیٹی کی بیٹی مصاحب کی مصاحب، پھر اس کے بیاہ کے اکاوے سے ماں کو بڑی بڑی ایذائیں پہنچی تھیں۔ اس کے لئے ماں کا دل ایسا ہو گیا تھا جیسا پکا پھوڑا آم جاتا ہے، اب جو خدا خدا کر کے پیام بھی آیا تو پردیس کا نہیں معلوم بنارس لے جائے گا یا ساتھ ساتھ لئے پھرے گا اور انگریزیت کا ٹپتا الگ۔ کون جانے کہ دین پر بھی قائم رہے یا نہیں، غرض یہ روداد ماں کے رو دینے کو بس کرتی تھی۔ آخر میر صاحب کو باہر سے بلوایا۔ بی بی کو روتے

دیکھ کر پوچھا "خیریت تو ہے؟"

بی بی۔ "ہاں خیریت ہی ہے۔ مگر میری صادقہ مجھ سے چُھٹی۔ یہ بنارس کا جو پیغام آیا ہے اس کے آنے سے پہلے صادقہ اسی مردوے کو خواب میں دیکھ چکی ہے اور اس کا نام تک معلوم ہوگیا ہے۔ اور اس نے یہ بھی خواب دیکھا ہے کہ گو اس کا ظاہر انگریزوں کا سا ہے مگر حقیقت میں مسلمان ہیں صرف انگریزی کپڑے پہن رکھے ہیں۔ بس تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔"

میاں۔ "دیکھو میں تو تم سے کہتا تھا کہ تم ہی نے شبہہ کیا۔ پھر اپنا دل کیوں تھوڑا کرتی ہو؟ اس دن کے لئے تو میں نے اور تم نے مدتوں ناک رگڑی ہے، اب خدا نے غیب سے سامان کیا ہے۔ تو ہنسی خوشی اس کو رخصت کرو۔"

بی بی۔ "ہے ہے! صادقہ کو ہنسی خوشی رخصت کروں! میرا تو کلیجہ منہ کو چلا آتا ہے جس وقت سے ہمراز نے آکر کہا ہے بس ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے دل کو کوئی مسوسے ڈالتا ہے۔ صادقہ بیٹی! تو پوتوں پھلے دودوں نہائے اور تو بوڑھ سہاگن ہوئے جیسے جیسے آرام تو نے مجھ کو دیئے ہیں، ایک ایک بدلے ہزار ہزار سکھ دیکھے۔ خدا حافظ خوش رہو آباد رہو۔ مگر ماں کو اپنی جدائی کا داغ دے چلیں۔ اب میں تمہاری صورت کو پڑی ترسا کروں گی۔ برسوں سے تمہارے برتنے پر میں نے یہ بھی تو نہیں جانا کہ گھر کدھر ہے۔ اور میں کدھر ہوں، اب تمہارے گئے پیچھے اس کھٹراگ کو کون سنبھالیگا؟"

غرض بیٹی کی جدائی کے خیال سے ماں کا دل بھر آیا تو کوئی آدھ گھنٹہ میں جاکر سنبھلا۔ تب میر صاحب نے کہا کہ "تم نے ابھی سے صادقہ کو گیا ہوا کیوں فرض کر لیا ہے؟ کیا معلوم کہ طرف ثانی کا کیا ارادہ ہے۔ اس سے کہ انہوں نے خود پیام دیا ہے۔ عجب نہیں کہ بنارس میں رہنے کی مرضی نہ ہو اور ابھی پڑھ رہے ہیں۔ تو علی گڈھ میں رہنے کا بھی کوئی موقع نہیں۔ اور ما نا کہ بنارس ہی جانا ہو تو یہاں

سے وہاں تک برابر ریل ہے، آج شام کو سوار ہو کر کل نماز عصر بنارس جا پڑھو۔ اور میں تو ایک سیدھی بات جانتا ہوں کہ جب آدمی اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں تو جیسا ٹکے ڈولی ویسا پردیس، سچ کہا ہے۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ اب تمہاری ہی دونوں لڑکیاں اسی شہر میں موجود ہیں۔ ہماری طرف سے شہر میں ہوئیں تو اور باہر ہوئیں تو۔ رہا آنا جانا، خط پتر تو ریل اور ڈاک اور تار کی بدولت ہم تو سارے ہندوستان کو اپنا ہی شہر سمجھتے ہیں۔ اور پھر تو یہ دنیا ہے۔ کون کس کے ساتھ رہا ہے اور کون کس کے ساتھ رہ جائے گا۔ اس کی مثال ناؤ سنجوگ کی سی ہے کہ جب تک ناؤ دریا میں چل رہی ہے۔ مسافر ایک جگہ ملے بیٹھے ہیں۔ ناؤ کنارے لگی اور ہر ایک نے اُتر اُتر کر اپنا اپنا رستہ لیا۔ ناؤ کے مسافر ایک دوسرے سے بچھڑتے وقت نہ روتے اور نہ رنج کرتے، اس واسطے کہ وہ پہلے سے سمجھے ہوئے تھے کہ یہ سنگ ساتھ پار ہونے تک کا ہے۔ ہم لوگ واویلا کرتے اور فریاد مچاتے، اس لئے کہ غلطی سے ہم نے ناؤ کو گھر فرض کر لیا ہے۔ اور گھر بھی ہمیشہ ہمیشہ کا گھر۔ میرے ایک دوست ہیں۔ اُن کو فقیروں سے بڑی ارادت ہے۔ وہ اپنی ایک نقل بیان کرتے تھے کہ مجھ کو فقیروں سے ملنے کی ہمیشہ سے دھت رہتی ہے۔ سالک ہو۔ مجذوب ہو، کسی رنگ میں ہو مجھے ایک بار اس سے ملنا ضرور۔ ہزاروں قسم کے فقیر نظر سے گذرے جو بات میں ڈھونڈھتا تھا کہ بھلا اور کچھ نہ ہو تو فقیر سے مل کر تھوڑی دیر کے لئے دل تو گداز ہو۔ کسی میں نہ پائی۔ بارے ایک دن خاکی شاہ ہمارے مکان کے تلے سے جا رہے تھے۔ دو باتیں ان میں بھی بڑی ہی عمدہ ہیں۔ ایک تو جمعے جمعے جنگل سے مسواکیں کاٹ لاتے ہیں۔ نماز کے بعد جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جا بیٹھے۔ جس کو ضرورت ہوئی اُس نے مسواک اٹھالی۔ کسی نے از خود کچھ دیدیا تو خیر ورنہ منہ سے نہیں مانگتے۔ بس یہی ان کی معاش ہے۔ اور یوں کسی نے کچھ دینا چاہا تو کہہ دیتے کسی اپاہج کو دو۔ میں تو کما تا ہوں اور کما سکتا ہوں۔

دوسرے یہ کہ آندھی ہو، مینہ ہو اندھیرا ہو اُجالا ہو پانچوں وقت جامع مسجد کی اوّل جماعت میں موجود۔ خیر تو ہمارے مکان کے تلے سے نکلے تو میں نے سلام علیک کی لگے پوچھنے "کیوں صاحب کوئی درویش ملا؟" میں نے کہا "تم کسی کو بتاتے ہی نہیں۔ اور مجھے خدا نے ایسی آنکھیں نہیں دیں کہ دیکھوں اور پہچان لوں۔" آہستہ سے لگے کہنے "ان دنوں ایک شخص آیا ہوا ہے۔ سقوں کے بھیس میں ہے۔ لاہوری دروازے کے باہر نہر کے پُل پہ سبیل پلایا کرتا ہے۔ اُس سے تو ملو" خاکی شاہ تو اتنا کہہ کر چلتے ہوئے اور میں سیدھا نہر کے پل پر پہنچا۔ دیکھا تو واقع میں ایک ادھیڑ سا شخص لوگوں کو کھڑا پانی پلا رہا ہے اور اس کا انداز کہے دیتا ہے کہ یہ سقا نہیں ہے۔ آس پاس کے سقوں سے پوچھا تو سب نے انکار کیا کہ ہم تو اس سے واقف نہیں۔ غرض میں اس کی ٹوہ میں لگا رہا تو معلوم ہوا کہ آٹے کی مشین میں ہر دھیلا مشک کے حساب سے ہر روز ہزار ڈیڑھ ہزار مشکیں بھروائی جاتی ہیں۔ وہاں یہ بھی ڈھائی تین آنے کا پانی بھر آتے ہیں۔ رات کو یہ کام کرتے اور دن بھر سبیل پلاتے ہیں۔ اور سبیل بھی پنج کوئیوں کے پانی کی۔ میں نے اس شخص سے لگاوٹ کرنی چاہی تو ہاتھ نہ دھرنے دے۔ آخر میں نے ایک دن پنج کوئیوں میں جالیا اور تخلیہ پاکر کہا کہ اگر تم کو کچھ خدا کا رستہ معلوم ہے تو اتنا مضائقہ کیوں کرتے ہو۔ پانی پلانے میں فیاضی اور خدا کا رستہ بتانے میں بخل۔ یہ سُن کر مشک تو کندھے پر سے اُتار کر رکھ دی اور ہم دونوں زمین میں بیٹھ گئے تو کہنے کیا ہیں۔ "تمہارے پاس رسول نہیں آیا؟ کیا تم پر قرآن نہیں اُترا؟ اب کون سے رستہ بتانے والے کے منتظر ہو؟ خدا کا رستہ کھلا پڑا ہے۔ اور سب کو معلوم ہے اور تم کو بھی معلوم ہے۔ تم آپ تو رستہ پر چلنا نہ چاہو اور رستہ بتانے والے کا یقین نہ کرو۔ تو تم صرف بہانہ ڈھونڈھتے ہو۔ کیا تم نے قرآن میں دوزخ کا حال نہیں پڑھا۔ کلما القی فیھا فوج

سالھم خزنتھا الم یاتکم نذیر قالوا بلیٰ قد جاءنا نذیر فکذبنا وقلنا ما نزل اللہ من شئی ان انتم الا فی ضلال کبیر" (ترجمہ جب اس میں کافروں کی کوئی ٹولی جھونکی جائے گی۔ تو دوزخ کے پہرے چوکی والے ان سے پوچھیں گے کہ کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں گیا۔" تو جواب دیں گے کہ ڈرانے والا آیا تو سہی مگر ہم نے اس کو جھٹلایا۔ اور خدا نے تو کوئی چیز اتاری نہیں تم ہی گمراہی میں پڑے ہو) تم جو خدا کا رستہ پوچھتے پھرتے ہو تو اس کے یہی معنی ہیں کہ تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں پہنچا یا پہنچا مگر تم کو اس کے ڈرانے پر قناعت نہیں اور چاہتے ہو کہ اس سے بہتر کوئی ڈرانے والا ہو۔ تو عزیز من یہ تو بہت ہی برا خیال ہے۔ اور کوئی مولوی سن پائے تو ابھی کفر کا فتوے لکھ مارے۔ یہ سب شیطان کے دھوکے ہیں۔ ظالم نے کہاں دین کی آڑ میں جا کر غلہ مارا ہے۔ پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جو وحی نازل ہوتی تھی بلا کم و کاست سب کو پڑھ کر سنا دیتے تھے۔ اور لکھوا دیتے تھے۔ چنانچہ اس کا مجموعہ قرآن میں موجود ہے۔ اس میں سے ایک لفظ بلکہ ایک حرف بلکہ ایک شوشہ گھٹا نہیں اور گھٹے گا بھی نہیں۔ ایک لفظ بلکہ ایک حرف بلکہ ایک شوشہ اس میں بڑھا نہیں۔ اور بڑھے گا بھی نہیں۔ کیونکہ خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا اور فرمایا ہے۔ وانا لہ لحافظون۔ قرآن میں ہمارے لئے روز قیامت تک پوری اور مکمل اور کافی ہدایت موجود ہے۔" میرے دوست کہتے تھے کہ ستے کی یہ تقریر سن کر میں تو دنگ ہو گیا۔ اور میں نے اپنے جی میں کہا کہ اللہ اکبر یہ تو کوئی بڑا شخص ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی کیا درویشی کرے گا۔ یہ تو علمی لیاقت ہے اور یوں اس شخص نے اپنے تئیں مٹی میں ملا رکھا ہے۔ آخر میں نے کہا "تو پھر پیری مریدی کوئی چیز نہیں؟" تو اس کا ایسا معقول جواب دیا کہ بس تسلی کر دی۔ کہا کہ "ظاہر اور باطن دونوں کی اصلاح کا نام ہے دین۔ مثلاً طہارت ایک تو ظاہر کی ہے۔

کہ آدمی کے جسم پر، لباس پر، اس کے بیٹھنے کھڑے ہونے کی جگہ پر گندگی، غلاظت گھن کی کوئی چیز نہ ہو۔ اگر کسی نے غسل کیا، وضو کیا، صاف ستھرے کپڑے پہنے پاک جگہ کھڑا ہوا۔ اس کا ظاہر درست ہو گیا۔ مگر خدا کی نظر میں وہ اتنا کرنے سے درست نہیں ہوا۔ جب تک اپنے دل کو غصے اور لالچ اور غرور حسد کی گندگی سے پاک نہ کرے تائب ہو کر قسم نہ کھائے۔ جھوٹ نہ بولے، فحش نہ بکے کسی کی غیبت نہ کرے۔ غرض دین کے یہ دو بڑے رکن ہیں۔ ظاہر کی اصلاح اور باطن کی صفائی۔ قرآن میں دونوں کی تاکید ہے اور ایک ساتھ دونوں کی تعلیم اور تعمیل ہونی چاہیے۔ لوگوں نے غلطی یہ کی کہ دونوں شاخوں میں جدائی قائم کر دی۔ مولویوں نے تو لیا ظاہر اور اس پر اتنا زور دیا کہ لوگ باطن کو بھول گئے۔ مشائخ نے باطن پکڑا اور ظاہر سے کی غفلت نماز کے متعلق مولوی ان باتوں میں تو اختلاف کرتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدی فاتحہ پڑھے یا نہ پڑھے۔ آمین پکار کر کہی جائے یا آہستہ، رفع یدین ہو یا نہ ہو لیکن حضور قلب سے ان کے یہاں بحث ہی نہیں اور اگر اس کو شرط قرار دیا ہوتا تو عربی کی یوں مٹی ہی کیوں خوار ہوتی کہ کوئی دن کو عنقا شاید ڈھونڈے سے کہیں مل بھی جائے مگر عربی دان دوا کو بھی میسر نہیں آئے گا۔ خیر یہ تو مولویانہ نماز ہے کہ سمجھو یا نہ سمجھو کھڑے ہوئے رکوع میں گئے، سجدہ کیا، تشہد پڑھا، سلام پھیرا، نماز ہو گئی۔ مشائخ کہتے ہیں۔ نماز نام ہے حضور قلب کا اور وہ اس سے نہیں ہوتا کہ قبلہ کی طرف منہ کیا، نیت باندھی، خیال جم گیا۔ اس کے لئے چاہیے برسوں کی ریاضت تاکہ آدمی کو خیال جمانے کی عادت پڑے۔ مگر ظاہر کی اصلاح ہو یا باطن کی صفائی، دونوں کا اصل الاصول اول درجے میں قرآن دوسرے درجے میں حدیث بلکہ قرآن اور حدیث کو بھی یوں سمجھو قرآن متن ہے اور حدیث اس کی تفسیر۔ مولوی باطن پہ زور نہ دیں مگر ان کی تعلیم یہی دو چیزیں ہیں۔ جن کے ذریعہ سے خدا اور رسولؐ ہم

تک پہونچا ہے۔ مشائخ چپکے چپکے کچھ ایسا کلھیا میں گڑ پھوڑتے ہیں کہ ان کا کچھ بھید ہی نہیں کھلتا۔ اور انہوں نے سینہ بسینہ ایک تعلیم ایجاد کی ہے۔ مولویوں کی تعلیم سے الگ اور اس کو انہوں نے اپنے گروہ کے ساتھ خاص کر رکھا ہے۔ گویا وہ راز ہے جس کو خدا نے عام مسلمانوں پر ظاہر نہیں کرنا چاہا۔ سو بھائی اپنی سمجھ میں تو آتا نہیں کہ خدا ایک، رسول ایک، قرآن ایک، دین ایک، پھر یہ میر نیر کیسی؟ نتیجہ یہ ہے اور اس کے سوائے ہونا بھی کیا تھا کہ جو لوگ مولویوں سے ہدایت پاتے اکثروں کے معاملات اچھے نہیں اس لئے کہ اُن کے دلوں میں نیکی کا بیج نہیں بویا گیا۔ دین کے ساتھ اُن کی نسبت ایسی ہے۔ جیسے قانون کے ساتھ وکیل کی کہ مقنن کی اصل غرض سے تو اس کو مطلب نہیں۔ وہ جس طرح بن پڑتا ہے اپنے مؤکل کو قانون کے لفظوں کی گرفت سے بچانا چاہتا ہے۔ دوسری طرف مشائخ کا گروہ رعایتی ہے، جیسے بادشاہی چیلے کہ وہ خدا کے ساتھ ایک طرح کی خصوصیت جتاتے ہیں، اور ان کے یہاں احکام شرع ظاہر معطّل نہیں تو بے قدر ضرور ہیں۔" اس پر میں نے پوچھا" تو آپ تو کسی سے بیعت نہیں"، کہا " ہے نہیں، اور ہو گی بھی نہیں، اور میں اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھتا۔ تم کو میرے بارے میں دھوکا ہوا ہے۔ مختصر طور پر اپنا حال بیان کئے دیتا ہوں۔ اس سے تم سمجھ لوگے کہ میں کیا ہوں۔ میں نے دیوبند کے مدرسے میں مدتوں طالب العلمی کی ہے اور درسی کتابیں سب میری نظر سے گذری ہیں۔ مگر میری طبیعت واقع ہوئی تھی غیور۔ مولویت کی شان سے معاش پیدا کرنے کو میں پسند نہیں کرتا تھا۔ اور مولویت کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا مجبور میں نے ریلوے سے کنکر کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ اس میں ایسی ناجائز کارروائی کرنی پڑتی تھی کہ کرتا ہوں تو طبیعت گوارا نہیں کرتی اور نہیں کرتا تو الٹا نقصان ہوتا ہے ایک دن بڑے سویرے نماز صبح پڑھ کر میں کنکر کے ڈھیروں کو دیکھتا پھرتا تھا کہ

اتنے میں معمول کے مطابق ریل تیار ہوئی۔ اسٹیشن پر جیسا دستور ہے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ چہل پہل رہی، یہاں تک کہ ریل روانہ ہوگئی۔ اس کا چلنا تھا کہ مجھے خیال آیا جس طرح اس ریل کی ابتدا اور انتہا ہے۔ اسی طرح دنیا کا آغاز و انجام ہے۔ جس طرح ریل کے اسٹیشنوں پر لوگ چڑھتے اترتے ہیں اسی طرح دنیا میں لوگ پیدا ہوتے اور مرتے ہیں جس طرح ریل کی گاڑیوں کے درجے ہیں۔ فرسٹ کلاس۔ سکنڈ کلاس۔ انٹرمڈیٹ کلاس، تھرڈ کلاس، اسی طرح کیا دنیا کیا دین کل باتوں میں لوگوں کے مدارج ہیں کوئی امیر ہے۔ کوئی غریب، کوئی بد ہے کوئی نیک، جس طرح اسٹیشنوں پر روانگی سے پہلے ٹکٹ دیئے جاتے ہیں جن میں ایک مقام خاص تک ان کو سفر کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ اسی طرح لوگوں کی تقدیریں ہیں۔ عمر کے اعتبار سے رزق کے اعتبار سے اولاد کے اعتبار سے اور سب چیزوں کے اعتبار سے جیسی نسبت سٹیم کو ریل کے انجن سے ہے ویسی ہی یا اسی کے قریب قریب انسان کی روح کو اس کے جسم سے ہے۔ جس طرح کوئی مسافر بیچ میں ریل پر سے اترنے اور اپنی حد سے بڑھنے نہیں پاتا، اسی طرح ہم سے جبراً اذا جاء اجلهم لا يستاخرون ساعة ولا يستقدمون۔ کی تعلیم کرائی جاتی ہے۔ غرض ان خیالات نے میرے دل پر ایسا ہجوم کیا کہ جہاں کھڑا تھا دوپہر تک وہیں کھڑا رہ گیا۔ پھر اپنی حالت پر آیا تو طلب دنیا کو جی نہ چاہا۔ اور اب میں اس حال میں ہوں جو تم دیکھتے ہو، چاہے اس کو فقیری سمجھو اور چاہے جنون۔ نہ مجھ کو خرق عادت ہے نہ کرامت اور نہ اس حال میں رہنے سے میں اپنے تئیں کسی مدح کا مستحق سمجھتا ہوں۔ میں نے دنیا کو ایسا ہی سمجھا جیسی وہ ہے۔ اگر میں دنیا سے کسی قدر الگ ہو گیا ہوں تو یہ میری کمزوری ہے اور میں اس نشان کو مدلنے ہی والا ہوں۔ تاکہ تمہاری طرح دوسروں کو دھوکا نہ دے سکوں"۔

ﻟﻪ وعدہ سے زیادہ نہ کم۔ ۱۲ منہ

دسویں فصل

صادقہ کا بیاہ

یہ حکایت تمام کر کے میر خسرو نے بی بی سے کہا کہ مجھ کو یہ بات ناؤ سنجوگ پہ یاد آگئی اور تمہاری سمع خراشی تو ہوئی مگر میں امید کرتا ہوں کہ تمہارے دل کو اس سے کسی قدر تسکین بھی ہوئی ہوگی۔ کیونکہ آدمی کو خدا نے ایسا ہی بنایا ہے کہ خیال کو اس کے رنج و راحت میں بڑا دخل ہے۔ تو آج میں سید صادق کو منظوری لکھے بھیجتا ہوں اور ہاں میری یہ بھی رائے ہے کہ تم دو بیٹیوں کو دنیا کے دستور کے مطابق بیاہ چکی ہو اب وہ سب بکھیڑا کرنا کیا ضرور ہے۔ صادقہ تو ایسی سمجھ دار بیٹی ہے کہ وہ بھی اسی کو پسند کرے گی اور سید صادق تو یقیناً حد سے زیادہ خوش ہوں گے۔"

بی بی "بکھیڑا کرنے والا ہی کون ہے؟ کرتیں تو صادقہ ہی کرتیں۔ اور آخر دونوں بہنوں کے بیاہ میں اندر باہر سارا انتظام انہوں نے ہی کیا تھا۔ مجھ سے تو کچھ ہوتا ہواتا نہیں اور اب تو میرا دل ہی ٹھکانے نہیں۔ بیٹی کو سرسے ٹالنا اور دھکے دے کر گھر سے نکالنا ہے دن کے بدلے رات کو چپ چپاتے ہو تو اور اچھا ہے۔"

غرض میر صاحب نے سید صادق کو لکھ بھیجا کہ ہم نے آپ کی درخواست بخوشی منظور کی۔ آپ نے اپنے خط میں ایک مقام پر کسی کو رنج دینا گو وہ رنج بے اصل اور بلا وجہ معقول ہی کیوں نہ ہو، جائز نہیں لکھا۔ آپ کی اس سلامت روی کے بھروسے پر مستورات کی یہ تمنا ہے کہ حتی الامکان لوگوں کو آپ اس کا موقع نہ دیں کہ آپ کی وضع ظاہر کی وجہ سے ہم کو رنج پہنچائیں۔ اور جو خیالات آپ نے خط میں ظاہر کئے ہیں، اُن ہی سے ملتی ہوئی یہ بات بھی ہے کہ ہم شرعی بیاہ چاہتے ہیں اور اس کے

لئے ہمہ وقت تیار ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ کو پانچ ہزار مہر مثل کے قبول کرنے میں کچھ عذر ہوگا۔" راقم میر خسرو۔ از دہلی

اس کے جواب میں سید صادق نے جیسے اُن کی عادت تھی پھر اپنے حیکمانہ خیال ظاہر کئے کہ "میں نے دیدہ و دانستہ انگریزی لباس میں اپنی تصویر کھچوا کر آپ کی خدمت میں بھیجی اور مقصود یہ تھا کہ انگریزی وضع اور تصویر کے بارے میں میرا خیال آپ پر ظاہر ہو اور یہ نمونہ ہو میرے عام خیالات کا۔ اب تو بہت کچھ فرو ہو گیا ہوگا۔ اور جیسا کہ وقت کا تقاضا ہے لوگ خود بخود انگریزی وضع اختیار کرتے چلے جاتے ہیں لیکن شروع شروع میں اس پر ایسا غل مچا نا صرف عوام میں بلکہ عوام سے بڑھ کر خواص میں گویا انگریزی کپڑے پہن لینا یا انگریزوں کی طرح یا ان کے ساتھ میز پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا کفر وار تداد ہے اور اس کے نمونے لکھے ہوئے موجود ہیں۔ زمانہ جو سب کی غلطیوں کو ٹھیک بنا دیتا ہے۔ اس غلطی کی بھی اصلاح کرتا اور ہم دیکھتے ہیں کہ کر رہا ہے اور کسی قدر کر بھی چکا ہے تو کیا سید احمد خاں کو باؤلے کتے نے کاٹا تھا کہ ناحق بیٹھے بٹھائے اپنے تئیں انگشت نما کر لیا؟ نہیں نہیں۔ لیکن سید احمد خاں کے درد کو ہر شخص نہیں پا سکتا۔ اُن میں بڑی صفت یہ ہے کہ ہم سب سے پہلے زمانے کی رفتار کو سمجھتے اور مسلمانوں کو آگاہ کر دیتے۔ ان کی مثال مسلمانوں کے ساتھ ایسی ہے کہ گرمی کے دنوں میں ہمارے ہندوستان کے بعض مقامات میں ایسی سخت لو چلتی ہے کہ خدانخواستہ آدمی کو لگ جائے تو ہچکا نہ کھائے۔ ایسی ہی جگہ ایک شخص نے مئی جون کی ساری رات لغویات میں بسر کی صبح ہوتے سو یا۔ دن چڑھتا چلا آتا ہے۔ اور وہ دھوپ میں کھلی چھت پر غفلت کی نیند پڑا سوتا ہے۔ اور لو کوئی دم میں چلی کی چلی۔ اس کا ایک رفیق دردمند اس کو جھنجھوڑتا اور چلاتا کہ خدا کے لئے کیا غضب کرتا ہے۔ اٹھ بھاگ اور یہ شخص ہے کہ الٹا اس رفیق پر جھنجھلاتا کہ کیوں میری نیند خراب کرتا ہے معلوم ہے کہ دھوپ

کی تیزی اس کو سونے نہیں دے گی۔ اور یہ جاگے اور اس کا اچھا جاگے مگر اس کا بھی تو ڈر ہے کہ کہیں سونے کا سوتا ہی نہ رہ جائے۔ اسی طرح جو کچھ سیّد احمد خاں کہتے ہیں مسلمان اگر دنیا میں رہنا چاہیں گے تو کریں گے اور اس سے بڑھ کر کریں گے مگر ابھی نہیں۔ اچھی طرح سٹ لیں گے۔ پیٹ بھر کر خراب ہولیں گے تب کہیں جاکر سمجھیں تو سمجھیں۔ میں جانتا ہوں اور افسوس کرتا ہوں کہ سب لوگ کیوں نہیں جانتے کہ سیدا حمد خاں کے دل میں انگریزی وضع کی ذرا بھی وقعت نہیں اور وہ سب سے بڑھ کر سمجھتے ہیں کہ یہ وضع ہماری ملکی حالت کے بھی مناسب نہیں۔ مگر ان کو اس وضع کے اختیار کرنے اور دوسروں کو اس کے اختیار کرنے کی ترغیب دینے پر مجبور کیا ہے۔ دو چیزوں نے۔ اوّل یہ کہ انگریز ٹھیرے حکام وقت اُن کی نسبت سے اُن کی کل چیزوں میں وقار آ گیا ہے۔ ازاں جملہ وضع میں بھی۔ تو مسلمان وہ وقار کیوں پیدا نہ کریں؟ دوسرے یہ کہ دنیاوی ترقی کے لئے جہاں تک ممکن ہو ہم کو چار و نا چار انگریزوں کے ساتھ سازگاری رکھنی اور اُن کی پیروی کرنی ضرور ہے۔ اور اس کی جہاں اور بہت سی تدبیریں ہیں ایک یہ بھی ہے کہ ہم ان کے ساتھ ان ہی کی زبان میں گفتگو کر سکیں، انہیں کے طور پر رہیں کہ اس اختلاط میں آسانی ہوتی ہے۔ اور ان دو غرضوں کے علاوہ ایک اہم مطلب اور ہے کہ مسلمانوں نے جو اپنے مذہب کو ہندوؤں کے دھرم کی طرح چھوئی موئی بنا رکھا ہے ذرا ٹھیس لگی اور کملایا اور یہ خیال اُن کو پنپنے اور اُبھرنے نہیں دیتا۔ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ جو شخص لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ منہ سے کہتا۔ اور دل سے اس کا عقیدہ نہ رکھے گا تو اس آزادی کے زمانے میں منہ سے کہنے ہی کیوں لگا؟ کوٹ پتلون پہنے ہے اور مسلمان ہے۔ میز پر چھُری کانٹے سے کھا رہا ہے اور مسلمان ہے۔ انگریزی زبان بول رہا ہے اور مسلمان ہے۔ غرض اس کا سارا ظاہر انگریزوں کا سا ہے اور مسلمان ہے۔ میں

بھی ذاتی آسائش کے اعتبار سے تو انگریزی وضع کو پسند کرتا نہیں مگر مصلحتوں کے خیال سے نہ صرف پسند کرتا ہوں، بلکہ جن کی نسبت بخیر ہے اُن کو تحسین کا مستحق جانتا ہوں مجھ کو معلوم ہے کہ اس وضع کے لوگ نفرت سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور مذہبی خیالات کے تزکئے کو ابھی مدتیں چاہئیں۔ اور میرا مطلب اُنس پیدا کرنا ہے نہ وحشت دلانا تو آپ پورا اطمینان رکھیں کہ سوائے اس زیب و زینت کے جو مردوں کے شایاں نہیں آپ مجھ کو اُسی شان میں دیکھیں گے جس شان میں آپ مجھے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ جو خوشی مجھ کو اپنی درخواست کے منظور کئے جانے سے ہوئی اُس سے دوچند بلکہ زیادہ اس بات سے ہوئی کہ آپ شرعی طور سے اس کام کا سرانجام کریں گے۔ میں ان بیہودہ اور لغو اور لایعنی مصارف کا جو ایسے مواقع پر کئے جاتے ہیں سخت مخالف ہوں اور اس دستور کو من جملہ اسباب اِفلاسِ مسلمانان سمجھتا ہوں۔ اور اگر میں کسی اجنبی محض مسلمان کے ہاں بھی سُن پاتا ہوں تو مجھ کو قریب قریب ویسی ہی ایذا ہوتی ہے جو اپنے ذاتی سرمائے کے نقصان سے ہوتی۔ افسوس ہے کہ مسلمان جو ان دنوں سب سے زیادہ محتاج ہیں۔ ایک پیسہ بھی جھوٹی شیخی اور نمود میں اگر ضائع کریں۔ مہر کے بارے میں میری یہ رائے ہے کہ اگر مسلمان مرد اور عورت میں نسبت مساوات کو قائم رکھیں جو شارع اسلام کو وللرجال علیھن درجۃ[1] کے لحاظ سے ان میں قائم رکھنی منظور تھی تو مہر جتنا کم ہو بہتر لیکن ہم لوگوں نے اُس نسبت کو قائم نہیں رہنے دیا۔ اور ملکی دستورات نے عورتوں کے بہت سے حقوق چھین لئے ہیں اور سوائے اس کے کہ مہر زیادہ کئے جائیں۔ عورتوں کے باقی ماندہ حقوق کی حفاظت کی اور کوئی تدبیر نہیں۔ پانچ ہزار روپیہ اگرچہ میری حیثیت موجودہ سے زیادہ ہے مگر مجھ کو اُس کے قبول کر لینے میں کچھ بھی عذر نہیں۔ بات یہ ہے کہ میں نے آج تک اپنے والدین کی

[1] مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے ۱۲

نافرمانی نہیں کی، بلکہ میں نے اُن کے ہوتے اپنا کوئی ارادہ ہی نہیں رکھا کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ والدین میرے سچے خیر خواہ ہیں۔ اور جو کچھ کرتے ہیں، میری بہتری کے لئے۔ تو میں نے اپنا دستور یہ رکھا کہ جو فرمایا تعمیل سے سروکار رکھا کبھی یہ بھی تو نہ پوچھا کہ اس سے کیا غرض ہے۔ اب جو میں نے اس تعلق کا خیال کیا تو ساتھ ہی جی میں یہ بات بھی ٹھہرالی کہ میں یہ کام اپنی ہی پسند اور اپنی ہی تجویز سے کروں گا۔ اور میں اس کو اپنا حق انسانیت سمجھتا ہوں۔ معلوم نہیں کہ والدین اس سے اتفاق رائے کریں یا نہ کریں۔ لیکن اگر کریں بھی تاہم میں اس آزادی کے عمل میں لانے کو نافرمانی ہی سمجھتا ہوں۔ اور میں نے اپنے لئے اس جرم کی یہ سزا تجویز کی ہے کہ اپنے تئیں تمام حقوق فرزندی سے محروم رکھوں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت میری حیثیت کچھ بھی نہیں۔ مجھ کو کالج سے اسکالرشپ ملتا ہے اور وہ اتنا ہے کہ میں اس سے اپنی مختصر خانہ داری کو بخوبی چلا سکوں گا۔ نوکریاں مجھ کو اب بھی ملتی ہیں۔ جب تک امتحان کے مرحلے طے نہ کرلوں کوئی سی نوکری بھی اختیار نہیں کر سکتا اور معلوم نہیں کہ آئندہ کیسے اتفاقات پیش آئیں گے مگر دنیا بامید قائم۔ میں نے اسی غرض سے انگریزی پڑھی ہو کہ مجھ کو معاش کی طرف سے فارغ البالی ہو۔ اور انشاء اللہ ہو گی۔ اور ضرور ہو گی۔ پس اگر پانچ ہزار میری حیثیت موجودہ سے بہت زیادہ ہے۔ میری حیثیت آئندہ سے کم اور بہت کم ہے اور چونکہ میں اس خیال کا آدمی ہوں کہ برابر کے درجے میں مرد کو عورت کا عورت کو مرد کا پابند رہنا چاہیئے۔ عجب نہیں مجھ کو مقدار مہر کے زیادہ کر دینے کا موقع ملے۔ اب میں نہیں سمجھتا کہ اس بارے میں زیادہ مراسلت کی ضرورت ہو اور میں آج کے پندرھویں دن اپنے چند دوستوں کے ساتھ حاضر خدمت ہوں گا اور شرعی معاہدہ ہو جانے کے بعد ایک ہفتہ رہ کر تنہا کالج کو واپس آؤنگا اور جب تک امتحان سے فارغ ہونے کے بعد میرا معاملہ یکسو نہ ہو اس انتظام کو جاری رکھوں گا۔" راقم سید صادق از بنارس

ایسا ہی ہوا کہ روز مقررہ پر سید صادق اور اُن کے دوست ہندوستانی بھلے مانسوں کے لباس میں شام کو آئے؛ نکاح ہوا۔ دونوں دوست اُسی رات نو بجے کی گاڑی میں واپس گئے۔ سید صادق ایک ہفتے تک ٹھیرے رہے۔ ان میاں بی بی کے حالات شروع سے آخر تک بڑے ہی بکار آمد اور دلچسپ ہیں۔ دونوں اچھی خاصی پکی عمر میں بیاہے گئے۔ جب کہ دونوں سمجھتے تھے کہ بیاہ ہے کیا چیز؟ صادق کے خیالات اس کی تعلیم کی وجہ سے اور صادقہ کے اُس کی جبلّی افتادِ مزاج کے سبب ایسے ایک دوسرے سے ملتے ہوئے تھے کہ وہ جو ایک جان دو قالب کہتے ہیں بس ان دونوں پر صادق آتا تھا۔ دونوں کی غرض و غایت یہی تھی کہ جہاں تک ہو سکے ایک دوسرے کو خوش رکھیں۔ بھلا پھر ان میں سازگاری نہ ہو تو اور کن میں ہو؟ ایسا نہیں ہوا کہ راہ چلتے ایک کا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں پکڑا دیا گیا ہو جیسا کہ عموماً ہوتا ہے بلکہ دونوں نے ایک دوسرے کو بقدرِ امکان جانا سمجھا اور جانے سمجھے پیچھے میاں بی بی بننے پر راضی ہوئے بس حقیقت میں ان کا ایجاب و قبول البتہ ایجاب و قبول تھا۔ وقت پر تو اعلان نہ ہوا۔ مگر چھپانے کی چیز نہ تھی اور چھپاتے ہی کیوں آخر لوگوں کو معلوم ہوا اور معلوم ہوا تو گھر گھر اس کا چرچا تھا۔

گیارھویں فصل

دلّی کے مسلمانوں کی سوسائٹی

میر خسرو معمولی طور پر بیٹی کو بیاہتے تو شہر میں ان کے عزیز و اقارب دوست آشنا جان پہچان اُڑ کر ہزار دو ہزار آدمی جانتے یا اب گلی گلی کوچے کوچے ایک ڈھونڈرا سا مچ گیا مولوی تو ایسی باتوں کی ٹوہ ہی میں لگے رہتے ہیں، ان کو رسالوں کے واسطے مضمون فتوؤں کے مسئلے، وعظ میں بیان کرنے کو قصہ ہاتھ آیا۔ سید صادق شروع سے اپنے

پڑھنے لکھنے میں لگے رہے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ان کو مسلمانوں کے مذہبی خیالات سے آگاہی نہ تھی۔ تھی اور بہت کچھ تھی مگر وہ اتنا ہی جانتے تھے کہ مذہبی تعصب مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کا مانع ہے۔ اب جو انہوں نے دلّی سے ایک تعلق پیدا کیا اور یہاں کے لوگوں سے زبردستی سر ہو ہو کر اپنے تئیں پہچنوایا تو انہوں نے جانا کہ شاید روئے زمین پر کہیں کے مسلمانوں کی مذہبی حالت ایسی ردّی نہ ہوگی جیسی دلّی کے مسلمانوں کی انہوں نے دیکھا کہ اس بدنصیب، شہر کے بدنصیب مسلمانوں کو محاربات سلطنت اور ضعف سلطنت اور زوال سلطنت اور آخر کار ۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے جیسے جیسے صدمے پہنچے وہ ان کو سینکڑوں برس پنپنے نہ دیتے مگر یوں کہو خدا کی کچھ ایسی مہر کی نظر تھی کہ انگریز حاکم وقت ہوئے اور ماں باپ اولاد کی کیا پرداخت کریں گے جو انہوں نے رعیت کی پرداخت کی۔ اور ان کی عملداری میں رعیت اس قدر آسودہ ہوئی کہ کبھی کسی وقت میں نہ ہوئی ہوگی لیکن مسلمانوں کی کچھ ایسی مت ماری پڑی کہ یہ لگے انگریزوں سے بدگمانی رکھنے نتیجہ یہ ہوا اور اس کے سوائے ہونا بھی کیا تھا کہ دوسرے لوگ بازی لے گئے اور یہ منہ دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے، بھلا کہیں خدا سے بندے کی ضد چلتی سنی ہے؟ مٹ گئے، برباد ہوگئے، چلیے پھر بھی سب نہیں، ہزاروں میں ایک آدھ، وہ بھی دلّی میں نہیں کہ یہ اپنی اسی پرانی لکیر کے فقیر بنے بیٹھے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے مسلمانوں پر خدا کا خاص غصہ ہے نعوذ باللہ من غضب اللہ اور وہ ابھی پورا نہیں ہوا۔ بلا سے یہ کہیں غارت ہو چکیں کہ مسلمانوں کے سر سے بلا ٹلے۔ خس کم جہاں پاک، مصیبت یہ ہے کہ آپ بگڑے سو بگڑے یہ ناداں دوست دوسرے مسلمانوں کو بھی سنورنے نہیں دیتے مصرع: میں تو ڈوبا ہوں مگر تم کو بھی لے ڈوبوں گا۔ یہ سچ ہے کہ بننا بگڑنا سب کچھ خدا کی طرف سے اور اسی کے حکم سے ہے لیکن خدا بھیڑیا یا شیر بن کر آدمیوں کو نہیں پھاڑتا پھرتا۔ اور نہ سانپ کے جون

میں آکر ڈستا۔ بلکہ عادات الٰہی یوں جاری ہے۔ کہ جو کچھ اس کو کرنا ہوتا ہے ہمارے دل میں ویسے ہی خیال ڈال دیتا ہے۔ اور ہم ہی اپنے ہاتھوں سے اپنا فائدہ یا نقصان یا بھلائی یا بُرائی، بہتری یا بدتری سب کچھ کر لیتے ہیں اور اپنے ہی تعلق سے تحسین یا ملامت کے مستحق ٹھیرتے ہیں۔ اور پھر انسان نرا پتھر بھی نہیں کہ جگہ سے سرکاؤ تو سرکے اور اُٹھاؤ تو اٹھے۔ بلکہ ایک حد تک فاعل مختار ہے۔ اور خدا نے کسی کو اس حد کا علم نہیں دیا تو خواہی نخواہی سارا بوجھ انسان ہی کو اٹھانا پڑتا اور ہر صورت سے وہی ملزم ٹھیرتا ہے تم ہی بتاؤ مسلمانوں کو بگڑا دیکھ کر مسلمانوں سے نہ کہیں تو اور کس سے کہیں۔ طالب العلمی کی وجہ سے سید صادق کے مزاج میں تو ایک طرح کی عزلت پسندی آگئی تھی۔ اور حقیقت میں وہ ملاقات کا چور تھا۔ لوگوں کی جیسی عادت ہے طرح طرح کی اس کی توجیہات کرتے۔ کوئی کہتا مغرور ہیں، کوئی کہتا انگریزیت چڑ گئی ہے ہندوستانیوں سے نفرت رکھتے ہیں۔ کوئی خیال کرتا عقائد بگڑ گئے ہیں۔ کیا منہ لے کر مسلمانوں میں بیٹھیں لیکن چاہیئے کہ اس خیال سے اس کی ملاقات سے کنارہ کشی کریں کیا مذکور۔

دلّی میں کتنے لوگ ایسے بے کار پڑے پھرتے ہیں جن کو دنیا اور دین کا کوئی کام کرنے کو نہیں۔ صبح ہوئی یہ خدا جانے کہاں رہے کوئی ڈیڑھ پہر رات جاتے جاتے بیوی کے ڈر سے گھر آئے۔ چھینکے پر سے روٹی اتار، مونڈھے تلے سے سالن کی پتیلی نکال، بچا کھچا کھا پی منہ لپیٹ پڑ رہے۔ سویرے آنکھ کھلے کیا خاک غرض جیسے دیر کر کے سوئے تھے، ویسے ہی دیر کر اٹھے۔ منہ ہاتھ دھویا بالوں میں کنگھی کی تیل ڈالا سرمہ لگایا۔ پان کھا چھڑی رومال ہاتھ میں لے چلتے ہوئے کسی کام سے نہیں، کسی خاص شخص کی ملاقات کو نہیں، جس کسی جان پہچان کے گھر جی چاہا جا موجود ہوئے۔ بلکہ جان پہچان کی بھی کیا ضرورت ہے یہ معلوم ہونا کافی ہے کہ مردانی بیٹھک ہے۔ تقریب ملاقات کو اتنا بس کرتا ہے کہ بندہ بہت دنوں سے آپ کی ثنا و صفت

سُن سُن کر مشتاق ملاقات تھا مگر کُلّ امرٍ مرھونٌ باوقاتہٖ یہ مسرت تو آج حاصل ہونی لکھی تھی ہر چند ارادہ کیا نہ بن پڑا اس وقت اتفاق سے ادھر گذر ہوا تو طبیعت بے اختیار ہو گئی۔ اسم شریف؟"

صاحب خانہ: "کمترین کا اصل نام تو میر خورم علی خاں ہے۔ بچپن میں پیار سے چھٹن صاحب کہتے تھے۔ اور جہاں بیٹھا ہوں یہ میری سسرال ہے، اور جب سے یہ تعلق ہوا ہے۔ یہیں رہنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ یہاں لوگ مجھ کو شاہنشاہ دولھا پکارتے ہیں۔ اور چونکہ اپنی بولی میں کچھ ٹیک سُئے تک بھی ملا لیتا ہوں میر موزوں کے نام سے مشہور ہوں۔"

نئے ملاقاتی۔ (جن کا نام خواجہ سلطان تھا) "ماشاء اللہ جیسا سنتے تھے اُس کا ہزار چند پایا۔ ہائے ہائے زمانہ ہی قدر ہنر کا نہیں ورنہ آپ جیسے باکمال آدمی کے دروازے پر تو ہاتھی جھومتے ہوتے۔ کیوں حضرت وجہ معیشت تو یہی کرایہ وغیرہ سے ہو گی۔ آخر کتنے ایک کی آمدنی ہے؟"

شاہنشاہ دولھا میر خورم علی خاں موزوں: "اے جناب کیا آمدنی ہے یوں تو نئی سڑک کے نکڑ سے لے کر چھوٹے دریبے تک لین کی لین یہ سب اپنی ہی جائداد تھی اور متفرقات علاوہ۔ لیکن طبیعت واقع ہوئی تھی لااُبالی، روپے کو کبھی روپیہ سمجھا نہیں۔ وہ جائداد تو ہاتھ سے نکل گئی۔ اب گھر کے لوگوں کے نام چند دکانیں قاضی کے حوض پر ہیں۔ اور سبزی منڈی میں چار ہزاری آپ نے سُنا ہوگا ایک باغ ہے۔ بس یہ کل کائنات ہے۔ کچھ خدا کی برکت سے گذر ہوئے چلا جاتا ہے۔ بزرگوں کے وقت سے مہاجن لگا ہوا ہے، جو ضرورت ہوئی کہلا بھیجا آدمی ہے بھلا مانس کسی بات میں آج تک تو عذر کیا نہیں ورنہ میں تو اس

لے ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے ۱۲

ریوڑی کے چکّر میں آکر سڑی ہو گیا ہوتا۔"

خواجہ سلطان۔" نصیب اعدا۔ آپ کی تقدیر میں جو پلاؤ کی رکابی لکھی ہے سو ملے ہی گی۔ قسمت پر شاکر رہئے۔ اور آخر آج تک ایک شان سے گزری ہے۔ ان شاء اللہ اسی طرح گذرے جائے گی۔"

موزوں۔" جی ہاں میں تو فکر کو پاس نہیں آنے دیتا۔ دوست آشناؤں میں ہنس بول کر اپنا وقت گذار دیتا ہوں۔ مجھ کو خبر نہیں ہوتی کہ کس وقت صبح ہوئی اور کب شام ہوئی۔"

خواجہ سلطان۔" بس کیا عرض کروں بجنسہ میری بھی یہی خصلت ہے سرِ مو تفاوت نہیں۔ گویا ہم دونوں کے مزاج ایک سانچے میں ڈھلے ہیں۔ اور تعجب ہے کہ ہم دونوں میں آج تک معرفت کیوں نہ ہوئی۔"

موزوں۔" آپ صورت آشنا تو ہیں۔ بارہا چلتے پھرتے آپ کو دیکھا ہے۔ طبیعت تو میری بھی آپ سے اُنس کرتی تھی، مگر وہی آپ کا فرمانا۔ کل امیا مرھون باوقاتہ۔ حضرت کا نام نامی۔"

خواجہ سلطان۔" فقیر کو خواجہ سلطان کہتے ہیں۔ اور آپ کی پشت پر جو یہ کمبخت ہیجڑوں کی گلی کہلاتی ہے، اسی میں غریب خانہ ہے۔ میں تو پہلے میر عاشق کے کوچے میں رہتا تھا۔ مالک مکان کمبخت ایسا بے مروّت ہے کہ صرف سوا با ڈیڑھ سال کا کرایہ اتفاق سے چڑھ گیا تھا۔ لگا سخت تقاضا کرنے، مجھ کو ہوا ناگوار بھری برسات مکان چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔ وقت پر اور کوئی مکان اپنے ڈھب کا ملا نہیں، آخر اسی مکان میں آرہا۔ خانہ داری خدا کے فضل سے ذرا زیادہ ہے۔ مکان ہونا چاہیے گنجائش کا۔ اور یہ آسائش تو اس میں خاصی ہے۔"

موزوں۔" آپ نے کچھ خیال ہی نہ کیا ہوگا۔ ورنہ چاہتے تو بہتیرے مکان اپنی

ذات کے کرلئے ہوتے۔"

خواجہ: "جناب بزرگ تو کچھ ایسے قناعت والے لوگ تھے کہ جو ملا کھالیا، جو میسر آیا پہن لیا۔ انہوں نے دنیا میں بہت پاؤں پھیلانے چاہے ہی نہیں۔ رہا یہ عاجز، تو والد مرحوم نے اپنے اوپر تکلیف سہی، مگر میری آنکھ پر کسی طرح کا میل نہیں آنے دیا۔ اور میں نے اُن کی بدولت وہ عیش کئے کہ جب کبھی یاد آجاتے ہیں۔ روئیں روئیں سے دُعا نکلتی ہے۔ اور اب بھی اُن ہی کی بدولت عیش نہیں تو خیر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ تکلیف بھی نہیں۔ ہم دو ہی بھائی بہن تھے۔ ہمشیر کو انہوں نے ایسی اچھی جگہ دیکھ کر دیا کہ اُن کی سسرال سے بہت کچھ مدد ملتی ہے اور ادھر میرے ایک برادر نسبتی رجواڑے میں نوکر ہیں، وہ اپنی بہن کی خبر لیتے رہتے ہیں اور نہ کیوں لیں۔ اپنے اسی دن کے لئے ہوتے ہیں۔ قیامت میں تو کوئی کسی کو بخشوانے ہی کا نہیں۔ غرض آپ کی دعا سے مجھ کو تو کسی طرح کا تردد کرنا پڑتا نہیں۔ دونوں وقت گھر میں گئے اور کھانا کھالیا۔ خانہ داری کے جھگڑوں سے میری طبیعت الجھتی ہے۔ اور میں نے گھر میں کہہ رکھا ہے۔ کچھ بھی کرو میں جس وقت آؤں کھانا تیار پاؤں۔ سو وہ نیک بخت اس کا اہتمام رکھتی ہے۔ جب تک والدہ زندہ رہیں وہ میری ضرورتوں کی خبر لیتی رہیں۔ اب اُن کی جگہ یہ عورت ہے۔ بندۂ درگاہ نے نہ کبھی ہاتھ پاؤں ہلایا اور نہ جیتے جی ہلائیں۔"

موزول: "بس تو ہماری اور آپ کی صحبت خوب نبھے گی"

نہیں جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

اس کے بعد دونوں میں اور بہت سے سوال و جواب ہوئے اور پہلی ملاقات میں ایک دوسرے سے اتنے کھلے کہ سارا کچا حال انہوں نے اُن کا اور انہوں نے ان کا کھود کھود کر دریافت کر لیا۔ بس ایک عورتوں کے نام پوچھنے کی نوبت تو نہیں

آئی اور وہ بھی شاید اس سبب سے کہ موزوں کے گھر سے کھانے کے لئے بلاوے پر بلاوا چلا آتا تھا۔ بارے روزانہ دو دفعہ ملاقات کی قسما قسمی ہو کر دن کے ایک بجتے بجتے بمجبوری خواجہ سلطان رخصت ہوئے۔ گھر گئے اور وہی ٹھنڈی روٹی جما ہوا سالن جو اُن کی تقدیر کا تھا کھا توے کا حقہ پی پھر جو سوئے تو دو گھڑی دن رہے کی خبر لی۔ جاگے اور پڑے پڑے سر اٹھا کر چندھی چندھی آنکھوں سے دھوپ کو دیکھا تو گھبرا کر اُٹھے اور یہ اُن کے نصیبوں کی دوسری صبح ہوئی۔ اٹھتے کے ساتھ پہلے گھر کی ماما پر خفا ہوئے کہ "صبح کا نکلا نکلا دوپہر پیچھے گھر آیا۔ تم کیا جانو کس کام میں تھا۔ ذرا کی ذرا لیٹا، بندہ بشر ہے آنکھ لگ گئی تو تم سے اتنا نہ ہو سکا کہ جگا دیتیں مگر تم کو تو سوائے کھانا پکانے کے اور کسی کام کو ہاتھ لگانے کی قسم ہے، آواز دینے میں بھی کچھ زبان گھِسی جاتی ہے۔"

ماما تو میاں کے پیچھے جھاڑو ہو کر چمٹتی مگر بی بی لقمہ توڑ بول پڑیں کہ "خیر ہے خواہی نخواہی، خدا واسطے ماما کے سر کیوں ہوئے؟ بچوں نے اتنی اودھم مچائی تو تمہارے فرشتوں کو خبر تک نہ ہوئی۔ ماما کیا تمہارے کان میں جا کر ڈھول بجاتی؟"

میاں: "پھر تم نے میری بات میں دخل دیا؟"

بی بی: "ہاں ہاں دیا اور سو دفعہ دیں گے۔ ہزار دفعہ دیں گے۔ تم ہمارے آدمی سے بولنے والے کون ہوتے ہو؟ منہ لگائی ڈومنی گائے آل تپال۔ ماماؤں کو نکالنا ہی جانتے ہو یا کبھی اتنی عمر میں کوئی ماما بلوا کر بھی دی ہے؟ ماما نہیں ہوتی تو مصیبت تو ہمارے دم پر پڑتی ہے، تمہارا کیا ہے آئے اور پکی پکائی نگلنے کو بیٹھ گئے۔"

میاں: "میں نے نکالنے کو تو نہیں کہا، ماما تم ہی خدا لگتی بات کہنا۔ ہاں اب کیوں بولو گی۔ مگر یہ بی بی شہ دے دے کر تم کو کسی اور کے کام کا تو رکھنے کی نہیں۔"

بی بی: "چلو جب تمہارے گھر واہے میں نوکری کرنے کو جائے گی تو تم نہ رکھنا اور تم

یوں بھی کیوں رکھنے لگے تھے۔ تم اللہ رکھے رکھو گے غلام، رکھو گے باندیاں۔"
میاں "۔ کچھ تم اپنے بھائی کے برتے پر اتراتی ہوگی تو میں کسی کا دیل نہیں لبتا۔ وہ کچھ دیتے ہوں گے تو تم کو دیتے ہوں گے، مجھ کو تو خدا نے تمہارے یا اُن کے نمک کا کبھی شرمندہ نہیں کیا اور نہ کرے گا۔ خدا میرے دولھا بھائی کو سلامت رکھے جن کی بدولت میں چاہوں تو تم جیسی چار اور کر لاؤں۔"
بی بی۔ "نگوڑے بے غیرت! بہنوئی کے کھونٹے پر کودتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"
وہ تو مامابی بی کو ٹال کے کوٹھے پرلے گئی نہیں تو خوجم صاحب کے پٹھے بی بی کے ہاتھ میں ہوتے۔ اور بی بی کی چٹیا خوجم صاحب کے ہاتھ میں۔ مگر ہے یہ کہ خوجم صاحب تھے بھی دل کے بہت ہی صاف اُن کا غصہ پانی کی سی ایک لہر ہوتی تھی، ادھر آئی، اُدھر اتری۔ بی بی کوٹھے تک پہنچی بھی نہ ہوں گی کہ انہوں نے منہ ہاتھ دھویا، کنگھی کی، شام کی سیر کے کپڑے بدلے، پٹاری کھول پان بنایا اور بن ٹھن کر باہر کو چلے چلتے چلتے پکار کر کہتے گئے کہ "شام کو ٹکے کے کباب اور ایک آنے کی ملائی منگا رکھنا دیکھنا بھولنا مت۔"

اور دن تو نئے بانس سے لے کر قاضی کے حوض ہوتے ہوئے چاوڑی اور وہاں سے بڑے دریبے کے تین تو ضرور اور کبھی چار پھیرے بھی ہو جاتے تھے آج جو کسی قدر دیر ہو گئی تھی تو دو ہی پھیروں میں جھٹپٹا ہو گیا۔ اور بازار کے چلنے والوں کو کوٹھے پر کا آدمی اچھی طرح دکھائی نہیں دیتا تھا۔ خوجم صاحب کو خیال تو آیا کہ میر موزدل سے وعدہ کیا ہے جیسیں اُن ہی کے سر ہوں، مگر گنجفے شطرنج کے پرانے ٹھکانے بندھے ہوئے تھے ان کا معمول ناغہ کرنے سے اپنی بھی ایک طرح کی ہیٹی ہوتی تھی کہ کل برابر باتیں کھائیں، "سفو پر نادری چڑھائی" "آج بھاگ کھڑے ہوئے"، ناچار اپنے قدیم اکھاڑے پر جا موجود ہوئے۔ خوجم صاحب کا

بیٹھ پچھیا ہے۔ یہ بے چارے اپنی طرف سے بہتیری ہی جلدی کرتے تھے مگر بازی پر تو کسی کا بس نہیں چلتا، اڑی تو اڑی۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ جو ہارا وہ پیچھا نہیں چھوڑتا کہ اب کے بازی لے جاؤ تو جانوں بھُتنے کی چڑھی تو نہیں ہے کہ دینی آئی تو اب نہیں کھیلتے۔ غرض ہر چند قصد کرتے تھے۔ بارہ بجے سے ادھر کبھی چھٹکارا ہوا ہی نہیں اور بی بی کے ساتھ اور بگاڑ ہی کاہے کا تھا، مرد ہو کر نکھٹو، اور اس پر گھر کے رہنے سہنے کا یہ حال کہ مسافر بھی بھٹیاری کی سرائے میں شام سے آ پڑتا ہے اور سویرے لوٹے تو آدھی بجے اور نہیں تو ایک بجے۔ لیکن ہم کو تو موقع نہیں ورنہ اس نیک بخت کو ضرور سمجھا دیتے کہ کیوں اس غم میں گھُلی جاتی ہو۔ یہ شخص گھر ہی پڑا پڑا کیا کرے گا۔ سینے کا یہ نہیں، پرونے کا یہ نہیں۔ ہاں دن بھر اس کو گڑگڑانے کو حُقہ اور چبانے کو پان دیئے جاؤ تو تم جاننا پان تماکو ہی کا خرچ بچا۔ اور ہر وقت کے پاس رہنے سے دو برتن ہوتے ہیں تو وہ بھی کبھی نہ کبھی کھڑکھڑا ہی اٹھتے ہیں، ایسے آدمی سے تو جتنی دیر الگ رہو اتنی دیر کوفت سے بچو آنکھوں دیکھتے تو صبر نہیں ہو سکتا کہ ایک آدمی ہٹا کٹا، لنگڑا نہیں، لولا نہیں، اپاہج معذور نہیں، اندھا نہیں، بہرا نہیں، اور کمانے کے نام موئی مُٹی کا منہ نیلے ہاتھ پاؤں۔

خواجہ سلطان کے طور کے احدی بندے شہر میں بہتیرے ہی بھرے پڑے تھے اور یہ لوگ اگرچہ اور سب باتوں میں تو احدی ہوتے ہیں مگر چل پھر کر اپنے ڈھب کے آدمی ڈھونڈ نکالنے میں بڑے چالاک۔ سید صادق کو تازہ وارد سن کر دھر لپکے۔ لیکن سید صادق میں اور اُن میں کوئی وجہ مناسبت تھی ہی نہیں، کسی کی دال نہ گلی اور پہلی ہی ملاقات میں اپنا مُنہ لے کر بیٹھ رہے۔ ان کے جلسوں میں ذکر تذکرے تو ہر طرح کے رہتے ہی ہیں سید صادق کے بارے میں ان لوگوں کی یہ رائے تھی کہ آدمی ہے تو قابل ملاقات مگر خدا جانے علی گڈھ کے نیچری نے کیا پڑھ کے کان میں پھونک دیا ہے کہ یار لوگوں کے ہتھے پر چڑھنے والا نہیں میر خسرو بھی اس کا ظاہر حال دیکھ کر گرے ہیں نہ اب پچتائیں گے۔ یہ عمر اور ایسا مُردہ دل

کہ کتنی ہی گدگدی کرو خبر نہیں۔ اس نے تو ملّانوں کو بھی مات کیا ہے۔ آدمی کی صورت سے جھینپتا ہے۔ اس سے نوکری چاکری کیا خاک ہو سکے گی۔ وہ تو ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتا ورنہ ہم تو دو تین ملاقاتوں میں اس کو اپنے طور کا کر لیتے۔ اس کی جھجک دور کرتے۔ اس کو علم مجلس سکھاتے کہ اس کے دروازہ پر ایک جمگھٹا رہتا۔ عجب کوڑ مغز آدمی ہے۔ کسی چیز کا مذاق نہیں، گنجفہ، شطرنج، چوسر، پتنگ، بٹیر، مرغ، ستار، شعر و سخن، سیر و تماشے۔ ایسے ہیاں ہیں نے اس کو ہر طرح سے ٹٹولا اس عزیز کے کان پر جوں بھی تو نہ چلی۔ خدا جانے کس ملک کا جانگلو پکڑ کر آیا ہے۔ ہاں صورت شکل تو ایسی پائی ہے کہ ہزاروں میں ایک، جی چاہتا ہے کہ بیٹھے دیکھا کیجیے۔ مگر تمہارا سر قرآن کی جگہ ہے بس دیوالی کی مورت جان نہیں منہ میں زبان نہیں۔

خیران بلاؤں سے تو خدا نے سید صادق کا پیچھا چھڑایا اور آج کیا چھڑایا اس کا پیچھا اس دن سے چھوٹا ہوا تھا جب سے یہ علی گڈھ کالج میں داخل ہوا۔ کھیل تو لڑکوں کو وہاں بھی کھلائے جاتے ہیں اور ایسی تاکید سے کہ جیسا پڑھنے کا اہتمام ویسا بلکہ اس سے بڑھ کر کھیلنے کا۔ مگر کھیل کھیل میں فرق ہے۔ ایک تو ہمارے یہاں کے کھیل ہیں، جن میں سے اکثر بے سود اور بے سود ہوں تو خیر، اُلٹے مضر۔ بد اخلاقی کی تمہید، کاہلی کی تعلیم۔ اور بعض ہیں جو کچھ دماغی فائدے نکل سکتے ہیں مثلاً گنجفہ ہیں حافظے کی ترقی، چوسر اور شطرنج ہیں غور اور خوض کی عادت، تو ان میں بڑی قباحت یہ ہے کہ دنیاوی معاملات میں ان سے مطلق مدد نہیں ملتی۔ اگر کوئی شخص گنجفہ اچھا کھیلتا ہے تو اس کے یہ معنی کہ اس کو پتوں کی یادداشت اچھی ہے لیکن بازیوں کے ورق یاد رکھنے سے کتابوں کے ورق تو کیا صفحہ بلکہ دو چار سطریں بھی یاد نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح بڑے سے بڑا شاطر شطرنج کے نقشے میں خوب طبیعت لڑاتا ہے مگر ایک سیدھا سا مقدمہ اس کے سامنے بیان کرو تو سمجھ نہیں سکتا۔ تدبیر سوچے گا کیا اپنا سر۔ غرض ہندوستانیوں کے جتنے کھیل ہیں سب نکمّے، موجب تضیع وقت

اب مدرسے کے کھیلوں پر نظر کرو تو نری جسمانی ریاضت اور تفریح طبع کے علاوہ دماغی
زحمت کا کچھ دخل نہیں کیونکہ اوقات درس میں جتنی دیر پڑھنے میں مصروف رہے بس
دماغی محنت بہتیری ہولی۔ اب کھیل میں بھی شطرنج کی طرح سوچنا پڑے تو دماغ کہاں
تک اس فشار کو وفا کر سکتا ہے۔ اور اگر جسم سے بالکل کام نہ لیا جائے تو جس طرح
گھوڑا تھان پر بندھے بندھے ہڈے موترے نکال لاتا، بادی میں بھر جاتا، دانہ
گھاس اچھی طرح ہضم نہیں کر سکتا، تھوڑی دور چلنے سے ہانپنے لگتا، کوس دو کوس دوڑانا
چاہو تو دوڑ نہیں سکتا۔ یہی حال آدمی کا ہے کہ اگر وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے کام نہیں لیتا
تو اگر اور کوئی بیماری اس کو نہ بھی ستائے یہ کیا تھوڑی بیماری ہے کہ وہ اپاہج ہو جاتا ہی۔
اسی آرام طلبی کے نتیجے ہیں کہ ہماری عمروں کے اوسط گھٹتے اور ہماری نسلیں کمزور ہوتی
چلی جاتی ہیں۔ خیر کابل کے پٹھانوں اور لوگوں کے ساتھ تو ہم ہندوستانی گرد ہیں کیا
مقابلہ کریں گے اپنے ہی ملک کے دیہاتی کبھی شہر میں آ نکلتے ہیں تو ان کو دیکھ کر عقل
حیران ہو جاتی ہے کہ الٰہی یہ بھی آدمی ہیں جن کی کاٹھیاں لوہے کی اور ہاتھ پاؤں پتھر
کے ہیں۔ معلوم ہے کہ ساگ بھاجی اور جوار باجرے کی روٹی کے سوائے اور کچھ میسّر
نہیں آتا۔ مگر یہ آنکھوں دیکھی بات ہے کہ ایک دیہاتی سو سوا سو من کی چوبلدی گاڑی
ہانکے لئے چلا جا رہا تھا۔ شہر کی بھیڑ دیکھ کر بیل بدکے، گاڑی کا ایک پیا نالی میں جاتا
رہا۔ بیلوں نے بہتیرا زور مارا پہیہ جگہ سے نہ کھسکا۔ گاڑی بان نے اتر کر کمر کا سہارا
لگا بات کی بات میں گاڑی کو ایسا دھکا دیا کہ بیچ سڑک میں۔ نہ دیہاتیوں کا پانی نہ شہریوں
کا ماء اللحم۔ نہ ان کا چینا اور نہ ہمارے بادام پستے۔ بیشک شہر اور دیہات کی آب و ہوا میں
بھی بہت بڑا فرق ہی۔ مگر دیہاتیوں کی توانائی اور ان کا ٹانٹا پن ہی محنت کی وجہ سے
شہر کی ایک تو کثرت آبادی کی وجہ سے آب و ہوا خراب اس پر محنت و مشقت ندارد،

نہیں لگتی اور مارے ہوگے کچھ بے اشتہا کھالیتا ہی تو ہضم نہیں ہوتا اور جو ہم میں پہلوان کہلاتے ہیں، سینہ اُبھرا ہوا ہے، قبضے چڑھے ہیں، دیکھنے کو موٹے تازے، داؤ پیچ بھی خواب رواں، مگر اصل میں بل بوتا توان میں بھی نہیں۔

اس پر ایک حکایت یاد آئی ہے کہ جن دنوں قلعہ آباد تھا تو سلاطین کو سوائے اوقات گزاری اور کوئی کام نہ تھا نکمے بیٹھے بیٹھے ان کو ایسے ہی مشغلے سوجھتے تھے کہ ستار بجا رہے ہیں یا بٹیریں لڑا رہے ہیں یا شطرنج کھیل رہے ہیں یا اس کی دُھن ہے کہ کوئی ایسی قسم کا کھانا پکوائیے کہ کوئی پہچان نہ سکے۔ چنانچہ ایک صاحب عالم کو پہلوانوں کی کشتی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ بہت سے پہلوانوں کے راتب بندھے تھے اور انہوں نے ایسی ایسی جوڑیں طیار کی تھیں کہ رجواڑوں میں جا جا کر کشتیاں مارتے تھے۔ ایک مصاحب کو یہ سوجھی کہ ان دنوں ولائتی میوہ فروش آئے ہوئے ہیں کسی ولائتی کو ایک پہلوان سے لڑوایا جائے صاحب عالم اس ایجاد کو سن کر پھڑک گئے اور فرمایا "بھائی واللہ تخت کی قسم ہے۔ کیا بات پیدا کی ہے! معمولی کشتیاں دیکھتے دیکھتے جی اُکتا گیا۔ ولائتی کی کشتی میں مزہ تو خوب آئے گا۔ دیکھیں وہ پیچ کا کیا توڑ کرتا ہے۔ داروغہ جی دینا ان کو ایک دوشالہ اور بھائی تم ہی اس کشتی کا اہتمام بھی کرنا۔ اور میں حضور میں بھی عرض کروں گا۔ سرفراز فرمائیں گے"۔

مصاحب "پیر و مرشد سرفراز فرمانا کیسا بہت محظوظ ہوں گے اور خانہ زاد نے جو کچھ عرض کیا ہے حرف بحرف اس کی تصدیق ہو جائے گی۔ سرکار کو تو معلوم ہے کہ جناب عالیہ کے آب خاصہ کی خدمت غلام کی خالہ جان کو ہے۔ وہ کل بھی کہتی تھیں کہ جناب بیگم صاحب بیٹھی تاش کھیل رہی تھیں دیکھتے کیا ہیں کہ حضور والا تشریف لئے چلے آ رہے ہیں جناب عالیہ کے ساتھ تخلیہ ہوا تو خالہ جان نے اپنے کانوں حضور کو سرکار کا نام لے کر فرماتے سُنا کہ ساری ادائیں اور رنگ زیب کی سی ہیں۔ سپاہیانہ مزاج واقع ہوا ہے اور شوق بھی ہیں تو اس قسم کے

اگر موقع ملا تو [illegible]

اتنا کہنا تھا کہ صاحب عالم نے بڑے دنگل کی طیاری کا حکم دیا اور مصاحبوں کی بن آئی، نہیں معلوم ظالموں نے کیا تدبیر کی ایک اکھڑ وحشی ولائتی کو کچھ دے کر شاہی پہلوان کے ساتھ لڑنے کو راضی کر لیا۔ ولائتی کو ہم نے بھی دیکھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مارے دہشت کے نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ آدمی کاہے کو تھا ایک دیو تھا۔ بالوں کی لٹیں کندھوں تک لٹکی ہوئیں۔ میلے کثیف کپڑے چار چار پانچ پانچ گز سے مست دنبے کی سی بو، ایسی سخت کہ ناک نہ دیجائے پیٹھ پر ہینگ کا مشکیزہ۔ ادھر جوتیوں سے اور اُدھر مشکیزہ سے چر چر کی آواز چلی آئے۔ خونخوار آنکھیں ڈراؤنی صورت۔ لوگ جو اُس کو بہلا پھسلا کر لائے تھے اُس کے گرداگرد ایسے معلوم ہوں جیسے بڑے آدمی کے آگے بچے۔ اور یہاں اکھاڑے میں پہلوان پڑے جھوم رہے تھے۔ کوئی ڈنڑ پیل رہا ہے، اور کوئی تین سو تین کی جوڑی کے رومالی ہاتھ اس خوبصورتی اور صفائی سے ہلا رہا ہے کہ سارے تماشائیوں کی ٹکٹکی اُس پر بندھی ہے، کوئی لیزم کی کثرت کر رہا ہے، کوئی بنیٹھی کے کرتب دکھا رہا ہے۔ اتنے میں غل ہوا کہ وہ پٹھان آیا۔ جوں اُس کو لا کے اکھاڑے کے پاس کھڑا کیا اُس کا پھیلاؤ دیکھ کر پہلوانوں کا رنگ فق ہوا۔ اب کسی کی ہمت نہیں پڑتی کہ موت کے منہ میں جائے۔ اور ولائتی ہے کہ زمین میں آلتی پالتی مارے ہینگ کے مشکیزہ کا گاؤ تکیہ بنائے نظر حیرت و تعجب سے سب کو بیٹھا دیکھ رہا ہے اور ان پہلوانوں کو سمجھتا ہے کہ نٹوں کا تماشا کر رہے ہیں۔ اکھاڑے کا اُستاد اگرچہ تھا تو عمر سے اُترا ہوا مگر اس کا بدن ایسا مرتب تھا اور اس کو ایسے ایسے داؤ گھات یاد تھے کہ یکایک کوئی اس سے لڑنے کی حامی نہیں بھرتا تھا مگر وہ خوب جانتا تھا ع فربہی چیزے دگر آماس چیزے دگیر ست ؂ اُس نے چپکے سے صاحب عالم کے پاس جا کر عرض کیا کہ آج تک آپ کے اکھاڑے نے کسی سے نیچا نہیں دیکھا اور اُستاد کی برکت سے ہمارے یہاں کے پٹھے بھی اپنے وقت کے رستم و اسفندیار ہیں، لیکن سرکار راجرس چاقو کو قسائی کے بغدے سے بھڑاتے ہیں۔ ساری عمر ہم نے

ملاحظہ کیجئے کہ کلائی دونوں ہاتھوں میں سمانی مشکل ہے۔ سرکار کو جان ہی لینی منظور ہے تو بسم اللہ۔ اس کا دبوچا ہوا آدمی پھڑکا بھی تو نہیں کھانے کا اونٹ کی پکڑ کو اسکی پکڑ سے کیا نسبت؛"

صاحب عالم سمجھے تو سہی مگر سارے میں غل مچ چکے تھے کس طرح کشتی کو ملتوی کر دیتے؟ بارے لوگوں نے ولائتی سے کہا کہ آغا ان لوگوں میں سے جسکے ساتھ تمہارا جی چاہے کشتی لڑو۔

آغا: "ہم سب کے ساتھ لڑے گا"

اب تو پہلوانوں کے دم میں دم آیا کہ خیر ایک کی وارو دو۔ اُستاد اور شاگرد سارے کا سارا اکھاڑا اکیلے کو لپٹ پڑا۔ جو جو داؤ پیچ یاد تھے سب ہی نے تو چلائے۔ آغا ہیں کہ قطب از جا نجنبد، لوہے کی لاٹ کی طرح گڑے ہوئے کھڑے ہیں۔ ان لوگوں نے نادانی یہ کی کہ آغا سے گُتھ گئے۔ اس نے موقع پا ایک تو اس بغل میں دابا اور دوسرے کو دوسری بغل میں اس نے تو اپنے نزدیک آہستہ ہی سے دابایا تھا مگر اُن میں کا ایک آج تک کوب لئے پھرتا ہے، اور دوسرا مدتوں خون تھوکتا رہا۔ اب سُنا اچھا تو ہو گیا ہے مگر جاڑے کے دنوں میں مارے پسلیوں کے درد کے بے چارے سے سانس نہیں لیا جاتا۔

خیر بنی آدم میں یہ ولائتی پٹھان تو اور ہی نسل کے ہیں اور اُن کی سی بات حاصل کرنی تو مشکل بلکہ محال ہے مگر اس کی عقلی دلائل موجود ہیں کہ اگر ہم اپنے طرز تمدن میں صفائی کے قاعدوں کی پوری پوری رعایت کریں اور جسمانی ریاضت کی عادت ڈالیں تو آئندہ کی نسلیں بہت بہتر ہو سکتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم لوگ گرم ملک کے رہنے والے ٹھیرے ہم کو خدا نے محنت کے لئے پیدا نہیں کیا اور نہ ہم سے محنت کا تحمل ہو سکتا ہے لیکن اگر شاقہ محنت نہ ہو تو جس قدر برداشت کی جا سکتی ہے وہ بھی سو دوا کی ایک دوا ہے اور پھر نہ ہلدی لگے نہ پھٹکری۔ اور علی گڑھ کالج میں جو لڑکوں سے محنت لی جاتی ہے تو خدانخواستہ کچھ پتھر تھوڑا ہی ڈھلوائے جاتے یا لکڑیاں تھوڑا ہی چِروائی جاتی ہیں۔ یہی کود پھاند، دوڑ دھوپ جس میں اُن کے اعضا چست و چالاک رہیں۔ جس کو عادت نہیں اُس کو شروع شروع میں ذری

سی محنت بھی ناگوار گزرتی ہی۔ لیکن آہستہ آہستہ ایک حدِ اعتدال تک عادت ڈالی جائے تو آرام سے زیادہ اُس میں راحت ملتی ہی جس کو یقین نہ ہو ہماری خاطر سے زیادہ نہیں ایک چلّہ اس صلاح پر عمل کر کے دیکھے کچھ فائدہ معلوم نہ ہو تبھی اُلاہنا دینا لیکن لوگوں نے اس کو کچھ ایسا عیب سمجھ رکھا ہی کہ جہاں تک ہو سکتا ہی کوئی ہل کر اپنے ہاتھ سے پانی نہیں پینا چاہتا۔ اور طالب العلموں کے حق میں تو ایسی سختی ہے کہ گویا پڑھنے اور لکھنے میں بیر ہا اور اتنا نہیں سمجھتے جس کے بدن میں توانائی نہیں اُس کے دماغ میں طاقت نہیں، دل میں قوت نہیں، عقل میں تیزی نہیں، ذہن میں رسائی نہیں کبھی دیکھا ہے روگی ماں باپ کی اولاد چونچال تندرست؟ کہیں سُنا ہی مُرجھائی ہوئی ٹہنی کے پتّے ہرے بھرے شاداب؟

غرض سیّد صادق علی نے کھیل بھی کھیلے تھے مگر وہی کھیل جن سے مقصود تھی ریاضت اور تفریح اور وہ بھی قاعدے سے اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ، استادوں کے ساتھ، سرکاری عہدہ داروں کے ساتھ۔ اس کو نہ یہاں کے کھیل آتے تھے اور نہ وہ ایسے جلسوں کو پسند کر سکتا تھا پس حقیقت میں، نہ وہ ہندوستانی سوسائٹی کے قابل تھا اور نہ ہندوستانی سوسائٹی اُس کے لائق۔ اس کی طبیعت ڈھونڈھتی تھی وہی کالج کی صحبتیں کہ پڑھنا ہی تو، اور باتیں ہیں تو، اور کھیل ہی تو، تمام وقت کسی نہ کسی شغل میں مصروف ہی۔ اور شغل بھی مفید اور دلچسپ، تعلیم کی تعلیم اور تفریح کی تفریح۔ ہندوستانیوں میں اگر ایسے مذاق ہوتے تو یہ روز بد ہی کیوں پیش آتا۔ سید صادق کو معلوم تھا کہ طالب العلمی کے بعد ہندوستانی سوسائٹی کو اوڑھنا بچھونا بنانا پڑے گا اور اسی غرض سے اُس نے خانہ داری کا تعلق پیدا کیا تھا۔ مگر یہ ایک تعلق سوسائٹی کا کام تو نہیں دے سکتا۔ بلکہ اس کے ہوتے سوسائٹی کی ضرورت اور بڑھ جاتی ہے پس چاروناچار اس کو لوگوں سے ملنا پڑتا تھا۔ آدمی کہاں تک کتاب دیکھے۔ اور کب تک عورتوں کی طرح گھر کی

چار دیواری ... دلّی جیسے شہر میں سیّد صادق کو معدودے چند لیے ہیں

ہم خیال بھی کیوں نہیں مل سکتے تھے آخر برسوں سے انگریزی تعلیم ہو رہی ہے اور یہ تو ممکن ہی نہیں کہ آدمی مشن اسکول میں نہ سہی کہیں بھی انگریزی پڑھے اور اس کے خیالات بالکل ویسے کے ویسے ہی رہیں جیسے فی زمانا عام مسلمانوں کے ہیں۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ بعض اپنے خیالات کو ظاہر نہیں کرتے یا ان کو ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملتا، اور بعض بھڑ بھڑیا ہوتے ہیں کہ جو اُن کے دل میں ہے وہی اُن کی زبان پر ہے لیکن اتفاق سے سید صادق کو آتے کے ساتھ اُن ہی لوگوں سے سابقہ پڑا جن کو اس کے سے خیالات چُھو بھی نہیں گئے تھے۔ یہ تو کیوں کر کہیں کہ سید صادق کو ہندوستانی سوسائٹی کا حال معلوم نہ تھا۔ وہ ہندوستانی سوسائٹی میں پیدا ہوا۔ ہندوستانی سوسائٹی میں اس نے پرورش پائی اور وہ بھی ہندوستانیوں ہی کا ایک ہندوستانی تھا۔ مگر اس نے ہوش سنبھالا علی گڑھ کالج میں پس سوسائٹی کے متعلق اس کی معلومات بیشتر کتابی تھی کہ وہ اخباروں کتابوں میں ہندوستانیوں کے حالات پڑھتا رہتا تھا۔ اب جو لوگوں سے ملا جلا تو جانا کہ جو کچھ جانتا تھا اس کو واقعات سے اتنی بھی تو نسبت نہیں جتنی چھٹانک کو من سے، اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ مسلمانوں نے مذہب کا یہ حال کر رکھا ہے کہ اس میں اور دنیا میں اس طرح کا بیر ہے کہ دونوں جمع ہو ہی نہیں سکتے خصوصاً انگریزی عملداری میں خدا نے تو بندوں کی مصلحت اس میں سمجھی کہ انگریزوں کو وقت کا بادشاہ کر کے دنیاوی عزت اور دنیاوی دولت کی کنجیاں اُن کے حوالے کر دیں کہ جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں اور مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ باوجودیکہ نصاریٰ اہل کتاب بھی ہیں ان کے ساتھ کھانا پینا، عیسائی مذہب کی عورتوں سے نکاح کرنا کہ دنیا میں میل جول اور دوستی ملاقات کے یہی طریقے ہیں۔ قرآن میں ان سب باتوں کی اجازت صاف صاف موجود ہے نصاریٰ کی مدح بھی ہے اور یہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ امن اور انصاف اور آسائش اور آزادی غرض ہر طرح کی راحت جیسی ان کی عملداری میں ہے نہ کبھی ہوئی اور نہ اب کسی

دوسری عمل داری میں ہے۔ باوجود ان سب باتوں کے مسلمان ہیں کہ ان کے سائے سے بھاگتے ہیں۔ ان کی زبان سے نفرت، ان کے علوم سے نفرت، ان کی وضع سے نفرت، ان کی طرز روش سے نفرت، جس کا ضروری نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان روز بروز مفلس اور ذلیل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جتنے ذریعے معاش کے دنیا میں ہیں اور ہو سکتے ہیں سبھی میں تو مسلمان دوسری قوموں سے ہٹے ہیں۔ کیا نوکری کیا تجارت کیا زمینداری کیا دستکاری کیا کچھ کیا کچھ۔ اور جو دو چار نے اس علم کو سمجھا ہے اور اب پچھتاتے اور اپنی دنیاوی حالت درست کرنا چاہتے ہیں ان کو اپنے ہی بھائی بند چین نہیں لینے دیتے کہ دنیا کے پیچھے دین کو چھوڑ بیٹھے۔ عاقبت خراب کی، ان کا پانی پینا روا نہیں، ان سے رشتہ ناطہ کرنا درست نہیں اور جو لوگ اس طرح منہ بھر بھر کے دوسروں کو برا کہتے ہیں وہ اگر اپنے نفس کا احتساب کریں تو پائیں گے کہ ان ہی کے خیال کے مطابق دوسروں کی آنکھ میں ناخنہ ہے تو ان کی اپنی آنکھ میں ٹینٹ، دوسروں کو خارش ہے تو ان کو کوڑھ، دوسروں کو خفقان ہے تو ان کو جنون اور جنون بھی مطبق۔ مگر خدا نے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ ان کو دوسروں کے عیب دیکھنے سے فرصت نہیں کہ اپنے عیوب پر نظر کریں اپنی نجات سے ایسے مطمئن ہیں کہ عشرۂ مبشرہ کو بھی ایسا اطمینان نصیب نہ ہوا ہوگا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود بشارت کے بھی وہ لوگ مرتے دم تک خدا کی بے نیازی سے ڈرتے ہی رہے۔ اور ان کو شاید کبھی بھول کر بھی خیال نہیں آتا کہ ہم کو بھی خدا کے یہاں چل کر کچھ جواب دہی کرنی ہے۔ اصل میں تو کبر یا حسد یا طمع دنیا یا حب جاہ یا اسی طرح کی کوئی اور خباثت باعث ہوتی ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حیلہ بنا رکھا ہے، گویا تمام بندگان خدا کے اعمال کی باز پرس ان ہی سے ہوتی ہے اور یہ خود مرفوع القلم ہیں نفسی نفسی کی بستی سے نکل مارے شیخی کے اتنی اتنی کی معراج پر جا دھمکے اور یہ نہ سمجھے کہ یہاں سے پاؤں پھسلا تو پھر اسفل السافلین سے ورے کہیں آدمی کا ٹھکانا ہی نہیں۔

اور اگر خدا نے دل ہی ایسا دیا ہے کہ پیغمبری نہیں، مجتبی کی خدمت نہیں ہے مسلمان بھائی کی غلطی دیکھی نہیں جاتی تو خشونت کیوں اور دل آزاری کس لئے۔ اور صاف صاف بات تو یہ ہے کہ جب اس کو پیشہ ٹھیرالیں اور معاش کے لئے اسی پر دھرنا دے کر بیٹھیں تو بدگمانی نہ ہوتی ہو تو ہو۔ دوسروں پر اثر ڈالنے کے لئے ضرور ہے خلوص۔ اور شائبہ غرض کے ہوتے اوّل تو خلوص ہو ہی کیوں۔ اور ہو تو آدمی فرشتہ ہو، ورنہ نیکی برباد گناہ لازم۔ غرض مذہب بھی عجب تماشے کی چیز ہے اس کی عینک آنکھوں سے لگا لو تو دوسروں کے لتّ اُلٹے اور شہتیر دکھائی دینے لگیں۔ اور اپنے پہاڑ، اوّل تو دکھائی نہیں دیں گے اور دکھائی دیں گے بھی تو رائی یا خشخاش یا بہت غور سے دیکھو تو جیسے تل۔ کبر اور خود پسندی کو اگر درخت فرض کریں تو مذہب سے بہتر اس کے لئے کوئی کھاد نہیں۔ ادھر ڈالا اور اُدھر بھان متی کے درخت کی طرح پتے پھول پھل سب کچھ تیار موجود، مذہب ایجاد تو ہوا بدی کی بیخ کنی کے لئے۔ افسوس ہے کہ اُس کو بدی کا پردہ دار بنایا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ پولیس چوروں کا ٹھا ئگی مگر انسان کی سرشت ہی اس طرح واقع ہوئی ہے کہ وہ اپنی بدی سے نہیں چوکتا۔ یہاں تک کہ مذہب میں بھی۔ مگر ایک دن آئے گا کہ اس کی ساری شرارتیں اس پر اور جن کو اپنے زعم میں دھوکا دے رہا ہے۔ اُن پر ظاہر ہوں گی۔ یُخٰدِعُونَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ آدمی بھی ایک طرح کا سر بند لفافہ ہے اور خدا نے اس کو ایسی مضبوطی سے بند کیا ہے کہ دوسرے اس کے اندر کا حال کیا جان سکتے ہیں یہ خود بھی اپنے دل کے کونے کھدروں سے اچھی طرح واقف نہیں۔ مرے پیچھے یہ لفافہ کھولا جائے گا اور اس وقت معلوم ہو گا کہ خط میں کیا لکھا ہے۔ اب تو جس کا جی چاہے لفافے کو خوشنما بنا کر لوگوں کو گرویدہ کرے۔ مگر یہ لفافہ ہے کئے دن کا کفن کے میلے ہوتے دیر بھی لگتی ہے اور یہ تو آج قبر میں رکھا اور تیسرے دن بھانڈا پھوٹا۔

لہ اپنے نزدیک اللہ کو اور مسلمانوں کو دھوکہ دیتے ہیں اور نہیں دھوکا دیتے مگر اپنے تئیں اور اتنی بات بھی نہیں سمجھتے

بارھویں فصل

صادق اور مذہب

سید صادق کا خیال یہ تھا کہ جو لوگ دنیا میں پھنسے ہیں وہ تو خیر مگر جو دین کے پیشوا کہلاتے ہیں اُن کے مذہبی خیالات ضرور اونچے اور عمدہ اور پاکیزہ ہونگے اور اس کا ارادہ بھی تھا کہ طالب العلمی کو اس کی حد تک پہنچا کر جب میں سوسائٹی میں آؤں گا تو ایسے ہی لوگوں سے صحبت رکھوں گا۔ اگرچہ ہم اس کی بات کو پسند نہیں کرتے کہ اس نے طلب دین کو دنیا کے بعد رکھا کیوں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے نزدیک دنیا اور دین کو دو سمجھ رکھا تھا۔ حالانکہ اسلام کا بڑا اصول یہ ہے کہ دین اور دنیا میں بُو اور گُل کی نسبت ہے۔ دین کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے، دنیا کو نیکی کے ساتھ برتنے کا نام دین ہے اور بس۔ لیکن وہ ایک نوجوان آدمی تھا اُس کی دینی معلومات بہت محدود تھی ہم نے بوڑھے ہو کر اتنی بات سمجھی اور اگر اس کے کان میں کسی نے ڈالی ہوتی تو وہ بھی سمجھتا مگر ڈالنے والا ہی کون تھا؟ سو میں ننانوے آدمی تو اس خیال کے ہیں کہ دنیا اور دین ایک دوسرے کی ضد ہیں جیسے آگ اور پانی۔ بہرکیف سید صادق کو ابھی مذہب سے ایک طور پر قطع نظر ہی سا تھا کہ دلی کے لوگوں نے زبردستی اس کے ساتھ مذہبی چھیڑ چھاڑ شروع کی وہ اس کے پاس آتے ہی اسی غرض سے تھے۔ اس کو جو آداب مجلس سکھائے گئے تھے وہ یہ تھے کہ بے تقریب کسی سے ملومت اور ملاقات میں اس کا ضرور لحاظ رکھو کہ جس سے ملنے جاؤ اس کی فرصت کا وقت تاک کر جاؤ کہ اُس کا کسی طرح کا حرج نہ ہو، اور ضرورت سے زیادہ اُس کے وقت کو مشغول نہ کرو، اور کسی کے ذاتی اور خانگی معاملات میں جیسے عقائد مذہبی وغیرہ گو وہ تمہارا کیسا ہی دوست کیوں نہ ہو ہرگز بھول کر بھی دخل نہ دو۔ مگر جو لوگ اس سے ملنے کو آتے تھے وہ

کسی تقریب کے محتاج نہ تھے، جس وقت جی چاہا آیا بے تکلف آموجود ہوئے۔ کنڈی کھڑکھڑائی یا نام لےکر پکارا اور پھر ڈٹے تو ایسے ڈٹے کہ اٹھنے کا نام نہیں لیتے اور پہلی ہی ملاقات میں مارے سوالوں کے اتو کر دیا۔ کوئی راز نہ تھا جس کی بہندی کی چندی نہیں پوچھی یہ بہت ہی زچ ہوتا تھا اور باوجود ضبط کرنے کے کسی کسی وقت ناخوشی بشرے سے بھی ظاہر ہو ہو جاتی تھی مگر ملنے والوں کی دُور بلا۔ وہ اس کی کھسیانی ہنسی کو مذاق میں اُڑا دیتے تھے اور مصیبت یہ تھی کہ آپ ہی تو کھود کھود کر کرید کر اس کی رائے دریافت کرتے اور اگر ایک حرف بھی ان کے خلاف اس کے منہ سے نکل جاتا تو کافر بناتے، مرتد ٹھیراتے، اور سارے شہر میں اس کا ڈھونڈرا پیٹتے سو الگ۔ اور اُس وقت تک اُس کو اپنی دینی معلومات بھی کچھ ایسی اعلیٰ درجہ کی نہ تھی اور اعلیٰ درجہ کی ہو بھی کیسے سکتی تھی اس کی عمر ہی کیا تھی، اور جو تھی اُس میں یہ ہمہ تن کالج کی پڑھائی میں مصروف رہا، اور ہمہ تن مصروف نہ رہتا تو جیسے جیسے امتحان اُس نے پاس کئے اس کے اچھے سے بھی نہ ہوتے پس وہ ایک عقلی مذہب رکھتا تھا۔ جو بات اس سے پوچھی جاتی اپنی رائے سے کچھ نہ کچھ اُس کا جواب دیدیتا اور اُسی کی پچ کرتا۔ اُسی پر جما رہتا۔ اتنی غلطی تو اُس کی بھی تھی کہ اُس کو عقل پر زیادہ اعتماد تھا۔ بی۔ اے پاس ہو کر اُس کو یہ تو سمجھنا چاہیئے تھا کہ دنیا ہی کی باتوں میں بڑے بڑے عقلمندوں کو دیکھتے ہیں۔ ایک کہتا ہے ہست تو دوسرا کہتا ہے نیست، اس سے بڑھ کر انگریزوں کی عقل و دانش کا کون معتقد ہوگا اور ہزار عقلمندوں کا عقلمند پولٹیکل گروہ جو سلطنت کا انتظام چلا رہے ہیں سو اُن کا تو حال یہ ہے کہ ایک کہتا ہے دن تو دوسرا کہتا ہے رات، ہاؤس آف کامنز یا پارلیمنٹ کا کونسا اجلاس ہے جس میں تُو تُو میں میں نہیں ہوتی۔ آج لبرل زور پکڑتے ہیں تو کل کانسرویٹو بازی لے جاتے ہیں۔ ریڈیکل، پارنلائٹ، گلیڈسٹونین ہم کو تو کم بختوں کے نام بھی نہیں آتے، کتنے فرقے پیدا ہو پڑے ہیں کہ ایک کی ایک سے نہیں بنتی یا مثلاً ڈاکٹر جو مسیحائی خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں، بیماریوں کو تو اپنے بس میں کر ہی چکے اب موت

کے پیچھے پڑے ہیں کہ کسی طرح اس کو اپنے قابو میں لائیں، بیماریوں کو بھی دیکھا یہی پھوٹ وہی اختلاف۔ ایک کہتا ہے بعض بیماریاں اُڑ کر لگتی ہیں، انہوں نے زور دے دے کر قارنطینہ چلوایا۔ دوسرے معتقد ہیں کہ تعدیہ امراض کوئی چیز نہیں صرف واہمہ ہی واہمہ ہے۔ غرض ان عقلمندوں کے ہاتھوں جان ایک مصیبت میں ہے کس کی مانیں اور کس کی نہ مانیں تو جب دُنیا کے معاملات میں جو اکثر مشاہدے پر مبنی ہیں عقل انسانی کا یہ حال ہو تو دین کی باتوں میں جو انسان کی آیندہ زندگی سے متعلق ہیں عقل انسانی اگر غلطی کرے یا سرے سے سمجھے ہی نہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ بس سید صادق میں یہ بڑی کسر تھی کہ وہ ہر جگہ عقل دوڑانی چاہتا تھا۔ جو بات اس کی سمجھ میں نہ آتی اُس کو جھٹلانے لگتا۔ ایک طور پر اُس کا کہنا بھی سچا تھا کہ انسان جو مکلّف ہوا تو اسی عقل کی وجہ سے ہوا اگر اس میں عقل نہ ہوتی تو یہ بھی اور جانوروں کی طرح کا ایک جانور تھا، عذاب و ثواب دونوں سے بری۔ آدمی کے پیچھے جو عاقبت کا جھگڑا لگا تو اسی سے لگا کہ اس کو عقل دی گئی ہے۔ نیک بد کی تمیز رکھتا ہے تو جس عقل کی وجہ سے اتنی ساری ذمہ داری گلے پڑی اسی کو دین میں معطّل کر کے بٹھا دیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا نے تو بنایا آدمی اور ہم بنیں جانور۔ اس نے تو دیں آنکھیں اور ہم باندھ لیں اوپر سے پٹی۔ دوسرے قرآن میں یہود اور نصاریٰ اور مشرکین اور دوسرے دوسرے غلط عقائد والوں کے ساتھ مناظرے ہیں مباحثے ہیں اور خدا جگہ جگہ ان لوگوں کو بل لا یشعرون افلا یعلمون افلا یعقلون کا الزام دیتا ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دین کے لئے علم و عقل کو ہادی بنانا چاہئے۔ ادھر یہ لوگ جو اس سے ناحق تکراریں کرنے آتے تھے، وہ کہتے تھے، دین کے آگے عقل کا نام ہی نہ لو۔ اگر نری عقل سے کام چلتا تو خدا کتابیں ہی کیوں اُتارتا، پیغمبر ہی کس لئے بھیجتا؟ شیطان سے بڑھ کر بھی کوئی عالم ہو گا کہ وہ سب فرشتوں کا استاد تھا۔ خدا نے آدمؑ کو پیدا کر کے کل فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ شیطان اپنے علم کے

غُرّے میں آکر حُجّتیں کرنے لگا۔ انا خیر منہ خلقتنی من نار و خلقتہٗ من طین[1]
علم وعقل کا انجام یہ ہوا کہ ہمیشہ ہمیشہ کو راندہ گیا۔ جب دونوں کے اصول اس قدر
مختلف ہوں تو ان میں اتفاق ہو کیا خاک۔ نتیجہ یہ تھا کہ بات بات میں تکرار، بات بات
میں حجت۔ اگرچہ صادق کی ہمت مسلمانوں کے متعارف فرقوں میں سے کسی فرقہ سے ملتی ہی
نہ تھی مگر اس کو اپنے سے زیادہ مسلمانوں کا باہمی اختلافات ناگوار تھا کہ ان میں جزئیات اور
فروع اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے اختلاف کے سبب اس قدر پھوٹ تھی کہ ایک رسول کی
امت ہونا کیسا اُن کا بس چلے تو ایک خدا کے بندے ہونا بھی ان کو منظور نہیں ان ہی
اختلافات کی بدولت ایک مسجد میں نماز نہیں پڑھ سکتے۔ آئے دن دیوانی اور فوجداری کے
مقدمے دائر ہوتے رہتے ہیں آگے تو خیر بندی ہوئی سو ہوئی لگے لگائے رشتے ناطے
چھوٹتے چلے جاتے ہیں تو کیوں کر کہیں کہ ان کا مذہب ایک ہے۔ اور اگر جُدا جُدا مذہب ہوتے
تو اس سے بڑھ کر اور کیا کرتے جو اب کر رہے ہیں؟ سید صادق یہ حکایت بیان کرتے وقت تعین
جان کرتا تھا کہ رو دیا کہ ایک مسجد کا امام تھا غیر مقلد اور نمازی کھچڑی یعنی بعض مقلد بعض غیر مقلد۔
ان دونوں فریقوں میں جہاں رفع یدین اور آمین بالجہر اور الصاق السوق اور سینے پر ہاتھ
باندھنے کے اختلافات میں ایک مسئلہ مختلف فیہ یہ بھی ہے کہ غیر مقلد سجدہ کے بعد جلسۂ
استراحت کرکے دوسری رکعت میں کھڑا ہوتا ہے اور مقلد جلسۂ استراحت نہیں کرتا مقلد
مقتدیوں نے حجت نکال کھڑی کی کہ امام کی اطاعت فرض ہے نہ کرو تو نماز باطل۔ ہمارا امام
جلسۂ استراحت میں ہوتا ہے کہ ہم کھڑے ہو جاتے ہیں تو اس امام کے پیچھے ہماری نماز کیسے
ہو سکتی ہے۔ چاہا کہ امام کو معزول کریں۔ غیر مقلدوں نے کی اُس کی حمایت مقدمہ لڑا اور لڑانا ہی تھا
حاکم تھا انگریز اُس نے فہم مقدمہ کی وجہ سے نماز کی نقل کرائی اور جہر کی تعیین کے لئے زیر و بم
کی سروں میں آمین کہلوا کر سُنی۔ سید صادق کہتے تھے کہ بدقسمتی سے میں بھی گواہی میں پکڑا گیا تھا

[1] میں آدم سے بہتر ہوں آپ نے مجھ کو بنایا آگ سے اور اُس کو بنایا مٹی سے۔

مقدمہ ہر چکنے پر فریقین نے مٹھائیاں بانٹیں اور میں نے مارے رنج کے کھانا بھی نہیں کھایا۔
مجھ کو یاد تھی وہ بات کہ کسی بیہودہ تھیٹر والے نے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی نقل کرنی
چاہی مسلمانوں کو علم ہوا تو اس سرے سے اس سرے تک ایک غل سا مچ گیا۔ ملکہ کے کان تک
خبر پہنچی اور سختی کے ساتھ ممانعت کر دی گئی۔ اللہ اللہ ملکہ کو عیسائی ہو کر اسلام کا اتنا پاس اور
خود مسلمانوں کا یہ حال! کیا فرق ہو سکتا ہے پیغمبر صاحب کی نقل ہیں اور نماز کی نقل میں؟ وہ رسول
خدا ہیں تو یہ فرض خدا ہے۔ مگر مسلمان ہی اپنے دین کی ہنسی اُڑانا چاہیں تو اس کا کیا علاج۔

سید صادق مذہبی تکرار کو سخت ناپسند کرتا تھا اور اس کو معلوم تھا کہ یہ تکرار باتوں سے
شروع ہو کر بہت جلد لکوں اور لاتوں پر جا پہنچتی ہے اور خدا جانے کیا اسرار ہے کہ اور تکراریں تو
رفع ہو بھی جاویں مگر مذہبی تکرار کبھی مٹتی سنی ہی نہیں، اس کو کامل یقین تھا کہ مسلمانوں کے تنزل
کے جہاں اور اسباب ہیں اُن میں سب سے بڑا سبب مذہبی اختلاف ہے کہ یہ ان میں یکدلی اور
اتفاق کے پیدا ہونے کا مانع ہے اور چاہے مسلمان دنیاوی علم ولیاقت ایجاد و صنعت دستکاری
وحرفت استقلال و محنت تفتیش و تلاش کل صفتوں میں اہل یورپ سے بڑھ بھی جائیں۔ مگر
بدون اتفاق کے فلاح قومی ہونی نہیں تو اس نے بڑی تفریریں کیں کہ آتش اختلاف مسلمانوں
میں پہلے ہی سے سُلگ رہی تھی میں نے آکر اُسے بھڑکا دیا اس نے ملاقات میں کمی کرنی چاہی مگر
لوگ زبردستی اس کو چپٹتے تھے اور کبھی وہ یہ بھی خیال کرتا تھا کہ گو اُس وقت میں نے اختلاف کا ایک
ایک پہلو اختیار کر رکھا ہے۔ مگر میرا اصل مطلب تو رفع اختلاف ہے اور اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب
ہوا تو مسلمانوں کے رستے میں سے ایک پہاڑ ٹل جائے گا اور وہ آسانی کے ساتھ ترقی کر سکیں گے

سید صادق تو بڑی سوچ سمجھ کا آدمی تھا اُس نے دلی میں تعلق کرتے وقت اس بات کا خیال
کیا تھا کہ وطن کیا چیز ہے اور مستقل سکونت کے لئے آدمی کو کسی خاص جگہ کا پابند ہونا مناسب
بھی ہے یا نہیں۔ اور ہے تو میں کونسی جگہ کو اختیار کروں، آخر اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ
تمدن سے مقصود اصلی ہے، آسائش، اور وہ جیسی شہر میں میسر آ سکتی ہے دیہات میں ممکن

نہیں، شہروں میں ہر قسم کا آدمی موجود، ہر طرح کی چیز مہیا، بے شک دیہات میں بھی خاص خاص فائدے ہیں جو شہریوں کو نصیب نہیں جیسے آب وہوا کی عمدگی، دیہاتیوں کی سادہ اور بے تکلف زندگی، اُن کی شرافت یعنی غور سے دیکھا جائے تو انسانی فطرت کا رنگ اہلِ دیہات میں زیادہ جھلکتا ہے، بہ نسبت اہلِ شہر کے، ہیں تو دیہاتی بھی آدم ہی کی اولاد مگر پھر بھی ان لوگوں میں اتنی خرابیاں نہیں ہیں جتنی شہریوں میں، مگر ویسے ہی دیہات میں عقلی ترقی کے سامان نہیں۔ شہریوں کے ناشائستہ حالات ردّی خیالات دیکھ کر سید صادق کا دل دیہات کی طرف جھکتا تھا۔ مگر طالب العلمی کا روگ ایسا اُس کے پیچھے لگا تھا کہ یہ شوق بے شہر کے پورا نہیں ہوسکتا تھا پس اُس نے قطعی فیصلہ کرلیا کہ رہوں گا تو شہر میں۔ یوں تو وہ خود بھی شہری تھا۔ مگر اُس نے اپنی تجویز سے بیاہ کیا کہ مارے غیرت کے آپ ہی آپ بنارس کے رہنے کا بھی عہد کرلیا۔ بنارس چھوڑا تو اُس کی نظر دلی پر پڑی کہ یہ بھی بڑا اور بادشاہی شہر ہے مدتوں دارالسلطنت رہا ہے۔ شاہ جہاں نے پہلے اس کا نقشہ جمالیا اس کے بعد لوگوں کو بسنے کا حکم دیا تو اس کی آبادی بہت ہی خوش قطع واقع ہوئی ہے۔ لال قلعہ اور جامع مسجد اور چوک یہ تین چیزیں تو اپنا جواب نہیں رکھتیں اور یوں شہر سے لے کر قطب صاحب تک چھ سات کوس کے گردے میں ایسی ایسی عمارتوں کے بیشمار کھنڈر پڑے ہیں کہ دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ بڑے بڑے باکمال لوگ اس سرزمین میں ہو گزرے ہیں۔ اور اگرچہ بہار کا موسم نکل گیا۔ مگر ایسا بھی کیا ہے کہ ہوا میں ذرا سی بھی مہک باقی نہ ہو۔ زبان جیسی یہاں کی مستند ہے کہیں کی ہو نہیں سکتی، لوگوں کی وضع بھی بھلے مانسوں کی سی ہے۔ منہ پر مقطع داڑھیاں، نیچے نیچے انگرکھے تنگ مُہری کے پاجامے مگر ٹخنے کھلے ہوئے مسجدیں بکثرت اور سب آباد۔ دین کے اعتبار سے اگر دلی کو ہندوستان کا مکہ مدینہ کہیں تو بے جا نہیں۔ لُٹی کھسٹی کئی دفعہ مگر رونق وہی کی وہی

۱۸۵۷ء کے غدر کا البتہ بڑا جھکولا پہنچا مگر یہی سرسری کا شہر تھا کہ قنوج اور بیجاپور کی طرح اُجڑا نہیں۔ خیر صوبۂ پنجاب کا صدر مقام نہیں نہ سہی دلی تو ہے۔ اس سے بہتر رہنے کے لئے اور کونسی جگہ ہوگی۔ اور ابھی میرے رہنے سہنے ہی کا کیا ٹھکانا ہے میں نے نام گنوانے کے لئے تو اتنی عمر ضائع نہیں کی، محنت سے پڑھا ہے، امتحان پاس کئے ہیں تو اسی دن کے لئے کہ بڑی سے بڑی نوکری کروں امیر ہو جاؤں، خوش حالی سے زندگی بسر کروں اور لوگوں کو دکھاؤں کہ عمدہ تعلیم پانے کے یہ نتیجے ہوتے ہیں۔ تو نوکری پیشہ کی جہاں نوکری وہیں اس کا وطن مگر پھر بھی آدمی کو چاہئے کہ کسی ایک جگہ کا ہو رہے چلے پھرے اپنے ٹھکانے آلگے اور دنیا بامید قائم، آخر میں کبھی نہ کبھی پنشن ہوں ہی گا تو اگر ساری عمر اٹھاؤ چولھا بنا پڑا پھرا اس وقت بڑی دقت پیش آئے گی اور ابھی سے سامان جمع کر چلوں گا تو آسائش ملے گی۔ غرض کوئی نہ کوئی مقام مستقل سکونت کے لئے متعین کرنا ضرور ہے کہ وہاں کے لوگوں کے ساتھ خصوصیت پیدا ہو اور وقت پر اُن سے ہمدردی اور مدد کی توقع کی جائے۔

ایسے ایسے خیالات سے سید صادق نے دہلی کی بود و باش جی میں ٹھیرا لی تھی مگر وہاں کے مذہبی اختلافات دیکھ کر تو اس کو بڑی ہی وحشت ہوئی اور اس کی طبیعت دو چار دن کے لئے آ نکلنے میں مضائقہ سا کرنے لگی۔ مگر دل برداشتگی کے ساتھ ایک بڑا فائدہ بھی ہوا کہ اس کو مذہب کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ اس کی سی عمر اس کی سی لیاقت کے آدمی کو یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ مذہبی اختلافات سے بالکل بے خبر تھا۔ علی گڑھ کالج جس میں اس نے پڑھا تھا کھولا تو گیا دُنیاوی تعلیم کی غرض سے مگر مسلمانوں نے زبردستی مذہبی بدگمانیاں کر کے شروع سے اس کے ساتھ مخالفت کی اور جب تک مسلمانوں کی مذہبی ہرچول کی عادت نہیں جاتی اور کیا جائے گی۔ علی گڑھ کالج کی نسبت بدگمانیاں ہوتی ہی رہیں گی۔ پس مجرد علی گڑھ کا طالب علم ہونا دلالت کر رہا ہے کہ وہ اختلافات کے ہنگامے میں شریک نہ تھا تو تماشائی ضرور تھا، اور ویسے ہی تماشائیو کی سی اس کی توجہ بھی تھی، اب جو ہر قسم کے لوگوں سے خود اس کو سوال، جواب کرنے پڑے

تواس نے دیکھا کہ مباحثے اور مناظرے کے لئے تیار نہیں۔ اس نے دینیات کی کتابیں دیکھنی شروع کیں مطلق اسلام کی طرف سے تواس کو اطمینان تھا کہ اس سے زیادہ اور سلیس اور آسان اور قریب الفہم اور فطرت انسانی کے ٹھیک مطابق کہ یہی سب باتیں مذہب کی حقانیت کی شناخت ہیں اور کوئی مذہب نہیں۔ اسلامی فرقوں کے باہمی اور اندرونی اختلافات میں اس کی عقل البتہ چکر میں تھی کہ یہ کیا آپس میں لڑے مرتے اور ایک دوسرے کو کافر اور مرتد بتاتے ہیں۔ اس نے اپنی طرف سے بہتیرا چاہا کہ کوئی ایسا منصف مزاج آدمی ملے جو اپنی کہے اور دوسرے کی سنے اور بالمشافہ گفتگو ہو تاکہ حق معلوم کر لیا جائے لیکن کسی کو اس ڈھب کا نہ پایا دو دو باتیں بھی سیدھی طرح نہیں ہونے پاتیں کہ فریقین آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں بے فوجداری ہوئے بغیر نہیں رہتی ؎

درافتادہ باہم بمنقار و چنگ تو گوئی خروسان شاطر بجنگ

پس کتاب بینی کے سوائے اور کیا چارہ تھا۔ مگر کتابیں بھی تو اکثر ان ہی لوگوں کی لکھی ہوئی تھیں اور بعض تو ان میں اس قدر بے تہذیب کہ اگر کسی غیر مذہب والے کی نظر پڑ جائیں تو اسلام کے مقابلے میں اس کو ایک حجت ہاتھ آئے۔ اور مذہب اسلام اس قدر عمدہ مذہب ہو کر جو نہیں پھیلتا اور دوسرے مذہب والے اس کثرت سے اس کو اختیار نہیں کرتے جس کثرت کے ساتھ اُن کو اختیار کرنا چاہیئے کیا خبر ہے کہ کہیں ایسی ہی کتابوں نے اُن کو نہ بھڑکا دیا ہو۔ ایک پادری صاحب تو ہم سے کہتے تھے کہ مجھ کو دریافت کرنا منظور تھا کہ اسلام میں کہاں کہاں پانی مرتا ہے سُنی شیعوں کا اختلاف میرا سُنا ہوا تھا میں نے دونوں کی ایک ایک کتاب منگوا کر دیکھی۔ اسلام کی آدھی بُرائی شیعوں نے بتلائی تو دوسری آدھی سُنیوں نے تو صادق نے بھی یہی غلط راستہ اختیار کیا۔ اور بجائے اس کے کہ اطمینان ہو تسلی ہو، اور شکوک بڑھتے گئے۔ کیونکہ ان لوگوں کے مناظرے کا معمولی طرز یہ تھا کہ کسی نے ان میں ایک عیب نکالا تو انہوں نے اس میں ویسے ہی یا اس سے بھی سخت دو نکال کھڑے کئے تو یہ وہی بات

ہوئی کہ حامد نے محمود کو چھیڑا کہ تیری آنکھ میں ناخنہ ہے محمود کو لازم تھا کہ اپنی صاف اور بے عیب آنکھ لوگوں کو دکھا کر حامد کو جھوٹا کرتا، وہ لگا حامد کی آنکھ کا ٹینٹ دکھانے اس سے آنکھ والوں کی نظر میں محمود تو ویسا کا ویسا ہی عیب دار رہا اور حامد بھی اس کے ساتھ میں گیا مذہب میں اس طرح کی چھان بین ہی ٹھیک نہیں اس سے طبیعت تنگی ہو جاتی ہے اور شک اور مذہب میں بیر رہے۔

تیرھویں فصل

عقلی مذہب

صادق نے کتابیں تو دیکھنی شروع کیں اسلامی فرقوں کے اندرونی اور باہمی اختلافات کی وجہ سے اور وہ جا پھنسا دوسرے مذاہب کے جھگڑوں میں۔ اور اب ہم نے اس کا یہ تماشا دیکھا کہ عقل کی بھول بھلیوں میں بھٹکا بھٹکا پھرتا تھا اور نکلنے کا راستہ نہیں سوجھ پڑتا تھا۔ اس پر ایک وقت ایسا بھی گزرا کہ وہ سرے سے کسی مذہب ہی کا معتقد نہ تھا اور دل میں کہتا تھا کہ شروع سے آدمی مذہب کے خیال کے پیچھے پڑے ہیں اگر مذہب حق واقع میں کوئی چیز ہوتا تو اب تک انسان کی نظر سے مخفی نہ رہتا اور ساری دنیا میں کبھی کا ایک مذہب ہو گیا ہوتا۔ دنیا جتنی پرانی ہوتی جاتی ہے مذہبوں کا شمار بڑھتا چلا جاتا ہے تو جس چیز کو اتنی مدت تک ڈھونڈا جائے اور ڈھونڈا بھی جائے تو ایسی کاوش سے کہ کوئی فرد بشر اس کی جستجو سے فارغ نہیں۔ اور وہ نہ ملے تو اس کے یہی معنی ہیں کہ اس چیز کا وجود ہی نہیں۔ دنیا میں ہزاروں مذہب ہیں اور ایک مذہب والا اپنے ہی تئیں بر سر حق سمجھتا ہے اور حال یہ ہے کہ نیک اور بد سبھی جگہ ہیں۔ کیوں کر مان لیں کہ ایک شخص خدا سے ڈرتا اور غریبوں پر ترس کھاتا اور کسی کو ایذا نہیں دینی چاہتا۔ معاملے کا صاف، دیانتدار امانت گزار۔ مزاج میں شیخی نہیں غرور نہیں۔ وہ صرف اس سبب سے کہ خاص طور کے عقیدے نہیں

کہ ایسا شخص جہنمی ہو۔ ابدالاباد کے لئے مستوجب عذاب الہٰی۔ اور خدا کو بھی کس نے دیکھا ہے یہی نہ کہ دنیا میں کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی اور بنانے والے کون؟ ہم ہی آدمی، تو جو چیز ہم میں سے کسی نے نہیں بنائی، جس نے بنائی وہی خدا۔ یہ دلیل ظاہر میں تو بڑی مضبوط معلوم ہوتی ہے لیکن اس کو منطق کی کسوٹی پر کس کو دیکھا جائے تو ٹھیک نہیں اترتی۔ کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی اس کی جگہ یوں کہنا چاہئے کہ آدمی کے بنانے کی کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی۔ وہی لفظوں کی کمی بیشی میں بات کیا سے کیا ہو گئی۔ نہ دعویٰ رہا اور نہ دلیل اور کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی۔ اس میں تو خدا بھی آ گیا تو گویا ہم ایک ہی سانس میں خدا کو مانتے اور اس سے مکرتے بھی ہیں۔ جو شخص کسی چیز کے آپ سے آپ ہو جانے پر اچنبھا کرتا ہے بڑا اچنبھا یہ ہے کہ وہ خدا کے ہونے پر اچنبھا کیوں نہیں کرتا۔ اور دنیا میں اگر مثلاً ایک بات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا ہے تو دو سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہیں ہے ہم ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو مبتلائے مصیبت دیکھتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ مصیبت ان کی کسی بدکرداری کا نتیجہ نہیں ہے، جیسے کور مادرزاد۔ یا ایک عام مصیبت ہوتی ہی کی ہے۔ جس پر کسی کا زور نہیں چلتا تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کام خدا کے نہیں ہیں۔ اور نہیں ہونے چاہئیں اور فرض کرو کہ خدا ہے تو مجرد خدا کا ہونا چاہتا ہے کہ دین نہ ہو کیوں کہ اگر خدا ہے اور اس نے جیسا چاہا دنیا کو بنایا تو وہ دنیا کے خلاف کیوں چاہنے لگا۔ اور اگر چاہے تو اس کی ایسی مثال ہو گی کہ ایک شخص گھڑی بنائے اور بنا کر اس میں ایک کیل ٹھونک دے کہ چل نہ سکے ہم کو بے ہماری درخواست کے پیدا کیا اور چند در چند ضرورتیں اور خواہشیں ہمارے پیچھے لگا دیں پھر ہم ان سے روکنے اور باز رکھنے کے معنی کیا؟

یہ ہیں سید صادق کے چند خیالات جو اس نے عقل کی راہ نمائی سے بہم پہنچائے تھے اور جن کو ہم نے نقل کفر کفر نباشد کر کے بھر دیے بہ مجبوری ڈرتے ڈرتے

اس بات کا دکھانا ہے کہ عقل بھی کیسی پاجی چیز ہے کہ خدا ہی نے تو اس کو بنایا اور خدا ہی نے اس کو سمجھنے کی طاقت دی اگر خدا کا فضل دستگیری نہ کرے تو یہ عقل آدمی کو اوندھے منہ دوزخ میں جا گرائے۔ اور پھر جو یک بارگی پلٹا کھاتا تو سوچتا کہ چاہے خدا کے کرنے سے ہو اور چاہے آپ سے آپ ہو انسان کی ہستی ہی کیا ہے بہت سے بہت جیا تو ساٹھ ستّر برس۔ اور سینکڑوں ہزاروں میں شاذ نادر کوئی ایک سینکڑا بھی گھسیٹ لے گیا تو کس طرح کہ بے لکڑی کے سہارے کے چار قدم چلا نہیں جاتا پاؤں ڈالتا ہے کہیں اور پڑتا ہے کہیں، سر ہے کہ جھکتے جھکتے گھٹنوں میں آلگا ہے آنکھوں سے دھندلا دکھائی دیتا ہے، کانوں سے اونچا سنائی دیتا ہے، کچھ عجب طرح کی بولی بولتا ہے، کہ نہ اردو ہے نہ فارسی نہ عربی، دنیا کی زبانوں میں کسی سے نہیں ملتی، اپنے منہ سے تو سیدھی بات نہیں نکلتی اور لوگ نہیں سمجھتے تو ان پر جھنجھلاتا ہے، بات ابھی کہی اور ابھی ذہن سے اتر گئی۔ ہوکا بڑھ گیا ہے، ہر چیز کو جی چاہتا ہے کہ کھاؤں، دانت نہیں، چبائے کا ہے سے، اور گھڑیوں پلپلا پلپلا کر کوئی چیز حلق سے اتار بھی لی تو ہاضمہ نہیں۔ اب گھر والوں کا دم ناک میں ہے۔ پوتیاں پڑپوتیاں ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور پکار پکار کر دعائیں مانگتی ہیں کہ بڈھا کہیں مر چکے تو پاپ ٹلے اس پر پوت بہو بولی" نوج بوا تم اس طرح منہ بھر بھر کر بڑے میاں کو کیوں کوستی ہو؟ یہ مر جائیں گے تو قیامت کے بوریئے کون سمیٹے گا؟"

اتفاق سے نواسی آئی ہوئی تھی جہاں، آخر تو خون کا جوش ہوتا ہے، اس سے سہار نہ ہو سکی اور لگی کہنے، لوگو خدا سے ڈرو! یہ سب ان ہی کے دم قدم کا ظہور ہے اور یہ سارے اللے تللے ان ہی کی کمائی میں ہو رہے ہیں۔ باوا کو تو ایک پیسہ لانا بھی نصیب نہیں ہوا۔ تم لوگ جس ہنڈیا میں کھاؤ اسی میں چھید کرو۔ نانا آبا نے تو آپ اپنی مٹی خوار کر رکھی ... اللہ ان کو بہشت نصیب کرے ابھی تمنا ہم گئیں ہیں

بنے سینکڑوں دفعہ ہاتھ جوڑے، وہ اس گھر سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ ورنہ میں تو ان کو اپنی آنکھوں پر بٹھاؤں اور اپنے ہاتھ سے ان کی ٹہل کروں۔ لیکن ہم تو سدا کے بدقسمت ہیں، ہماری تقدیر ایسی کہاں تھی کہ بزرگوں کی خدمت کرتے؟"

"پوت بہو" ہاں بوا سچ کہتی ہو۔ ہم تو ایسی ہی نمک حرام ہیں۔ ہماری طرح آٹھ پہر گھر میں رہو تو جانو کہ بڈھے نے سارے گھر کو سر پر اٹھا رکھا ہے۔ ان کو تو دن رات کی تمیز باقی نہیں سوئے پڑے ہیں تو امن ہے۔ ادھر آنکھ کھلی اور پکارنا شروع کیا۔ کڑاکے کے جاڑے اور آدھی رات مہاوٹ برس رہا ہے اور لونڈی کی طلب ہے۔ نہ جاؤ تو تمہارے بھائی جان لڑنے کو موجود۔ تم چاہو تو شوق سے لگا دینا ہم سے تو یہ بوڑھے بچے نہیں پالے جاتے۔"

غرض بڑے میاں اپنے گھر میں ہیں تو اس قدر عزت کے ساتھ جن کو عقل سکھائی اب وہ منہ در منہ کہتے ہیں کہ تم سترے بہترے ہو گئے ہو۔ جن پر حکمرانی کی اب بات بات میں ان سے دبنا پڑتا ہے جن کی خدمتیں کیں اب وہ پانی پلاتے ہوئے بڑبڑاتے ہیں۔ اپنا پیسہ اور آپ ہی دست نگر۔ غرض زندگی ہے موت سے بدتر۔ اپنے پر عذاب دوسروں پر وبال۔ الٰہی کبھی ہو بھی چکے گی۔ اور فرض کیا کہ آدمی کی بڑی سے بڑی عمر بھی ہوئی اور اس کو بڑھاپے کی ایذائیں اور تکلیف بھی پیش نہ آئیں تو بھی ساری مزہ داریاں ایک طرف اور مرنا ایک طرف دنیا میں یہی تو سب سے زیادہ عجیب بات ہے کہ بھلی بھی گزر جاتی اور بری بھی گزر جاتی یعنی انجام سب کا ایک ہی ہے

کتنے مفلس ہو گئے کتنے تونگر ہو گئے　　　　خاک میں جب دم ملے دونوں برابر ہو گئے

پس حقیقت میں آدمی خواب سا دیکھ رہے ہیں، کوئی اچھا کوئی برا۔ آنکھ بند ہوئی جس کو کہنا چاہیے کہ آنکھ کھلی تو کچھ بھی نہ تھا ۔

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا　　　　خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

اس قسم کے خیالات ہجوم کرتے تو سید صادق کو دنیا کی طرف سے ایسی بے دلی پیدا ہوتی تھی کہ کہاں کا امتحان اور کیسی نوکری، کس کی بی بی اور کدھر کے تعلقات، سب کو ٹھینگا۔ الغرض ان دنوں سید صادق اناڑی کی ترازو بنا ہوا تھا کبھی ادھر کا پلہ جھک گیا، کبھی ادھر کا اور اس کا سبب یہ تھا کہ وہ عقل سے اس کی بساط سے زیادہ کام لینا چاہتا تھا اور خدا کو اسے یہ دکھانا منظور تھا کہ ہم نے تمہاری جتنی عقل سب کو دی (بہتیرے تم سے کم، بہتیرے تم سے زیادہ) اور نہ مذہب کے لئے اتنی عقل کی ضرورت اور جتنی کہ ضرورت ہے اس سے ہم نے مرد اور عورت اور عالم اور جاہل اور شہری اور دیہاتی کسی کو محروم نہیں رکھا اور یوں آپ نے اپنے اوپر کوئی چیز لازم کر لو تو تمہاری خوشی، پھر تم سے تو نہی ہی باز پرس ہو گی۔ تمہارے دنیاوی امتحانوں میں بھی بعض چیزیں اختیاری ہوتی ہیں چاہے ان میں امتحان دو چاہے نہ دو لیکن از خود دنیا چاہو گے تو نمبر دل میں رعایت نہ ہو گی۔ وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ[1] دین کا وہ درجہ جو ضروری ہے ایسا سہل رکھا گیا ہے کہ ہر ایک آدمی اس کو بدون کسی زحمت کے پاس کر سکتا ہے اس پر بھی لوگ فیل ہوتے ہیں۔ مذہب کا کچھ ایسا خواص ہے کہ جتنا چھانو تو بنا ہی کرکرا، جوں جوں نتھارو توں توں گدلا اور اسی واسطے حدیث شریف میں آیا ہے کہ دین ہے بڑھیوں کا اور مکتب کے بتدی بچوں کا۔ یعنی بوڑھی عورتیں اور مکتب کے بتدی بچے دل کے بھولے اور طبیعت کے صاف ہوتے ہیں جس طرح کورا کپڑا رنگ کو خوب پکڑتا ہے بھولے دل اور صاف طبیعتیں دین کی باتوں کو جلد قبول کرتی ہیں اور العلم حجاب اکبر[2] جو کہا ہے تو اس کی

---

[1] اور عیسائیوں نے ایک رہبانیت نکال کھڑی کی جو ہماری طرف سے اُن پر فرض نہ تھی رہبانیت سے اُن کی غرض خدا کی رضاجوئی تھی۔ اور بس تو اُن سے اُن کا نباہ جیسا کہ چاہئے تھا نہ ہو سکا پس جو ان میں ایمان والے تھے اُن کو اجر ملے اور اکثر تو بدکار ہیں۔ [2] علم بجائے خود بڑا پردہ ہے۔

بھی یہی وجہ ہے کہ بہت سیان پت بھی آدمی کو گمراہ کر دیتی ہے۔ غرض سید صادق پر دین کے اعتبار سے کچھ وقت اُسی طرح کا گزرا جیسے بنی اسرائیل چالیس برس جنگل میں بھٹکتے پڑے پھرے۔ بہتیری اٹکلیں دوڑاتے اور ہر روز صبح سے شام تک چلتے آخر کار پھر گرد میں اُکھڑے ہوتے جہاں سے چلتے تھے۔ مگر تھا کیا کہ طلب تھی صحیح اور تلاش تھی سچی، اس سوچ میں اس کا یہ حال ہو گیا تھا، جیسے کوئی بھوت دیکھتا ہے اور نظر نہیں آتا، سنتا ہے اور سمجھتا نہیں۔ بہتیری کوشش کی تاکہ یہ خیال سے دور ہو مگر سوتے جاگتے ہمہ وقت یہی تصور پیش نظر تھا۔ کسی چیز میں طبیعت نہیں لگتی، کسی بات سے جی نہیں بہلتا کتاب لے کر بیٹھا، ہر چند طبیعت پر زور دیتا ہے مطلب معلوم نہیں ہوتا۔ لوگ باتیں کر رہے ہیں، اس کو خبر نہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں یہاں تک کہ اس کے ستنہ ضروریہ میں خلل پڑنے لگا اور چندے اس کو خوف رہا کہ کہیں ایسا نہ ہو مجھ کو جنون ہو جائے اور سارا پڑھا لکھا غارت ہو۔ نیند تو اس کی مدتوں سے اُچٹی ہوئی سی تھی، ایک رات آخر شب اسی خیال میں پڑا کروٹیں بدل رہا تھا کہ اس نے بے قرار ہو کر دعا کی کہ اے خدا اگر واقع میں تو خدا ہے جیسا کہ تمام اہلِ مذاہب سب تجھے مانتے ہیں، تو مجھ کو اس ورطۂ حیرت سے نکال اور حق بات میرے دل میں ڈال۔ ابھی پورے لفظ بھی اس کے منہ سے نہیں نکلے تھے کہ برابر کے پلنگ پر سے صادقہ نے آواز دی "کیا تم جاگتے ہو؟"

صادق۔ "ہاں جاگتا ہوں کیوں خیر ہے؟"

صادقہ۔ "میں نے ابھی ایک بڑا لمبا سا خواب دیکھا ہے جیسے تم کسی قیمتی کپڑے کی ایک نہایت سفید شیروانی پہنے ہو ایسی کہ میں نے آج تک ایسا سفید کپڑا نہیں دیکھا۔ جابجا اس پر سیاہی گری ہوئی ہے اور تم داغوں کو چھڑانے کی فکر میں ہو اور تم کو ایک طرح کا رنج اور رنج کے ساتھ ناامیدی بھی ہے کہ ہائے کیسی عمدہ شیروانی تھی اب

اس کے دھبے کیا چھوٹیں گے۔ تم نے بہتیرے جتن کئے اور جس نے جو تدبیر بتائی آزمائی دھبے پھیلتے اور پہلے سے زیادہ بدنما ہوتے گئے یہاں تک کہ تم نے انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ کر چاہا کہ شیروانی کو اتار پھینکوں۔ اتنے میں تو ایک بزرگ نے مجھ سے کہا یہ دھبے مٹی سے چھوٹیں گے مجھ کو اس کا طریقہ معلوم ہے میں تمہارے ہی ہاتھوں سے اس کو صاف کرا دوں گا اور شیروانی جیسے اصل تھی ویسے ہی نکل آئے گی گھبراؤ نہیں اس کے بعد تو سوتے ہی میں خود بخود خواب کی تعبیر میری سمجھ میں آئی کہ شیروانی تمہارا دل ہے اور سیاہی کے دھبے تمہارے مذہبی شکوک ہیں اور مٹی سے مراد ہے خاکساری پھر کیا دیکھتی ہوں کہ جیسے تم ہیں اور اُن بزرگ میں اسی طرح کی مذہبی بحث ہونے لگی جیسی تم لوگوں سے کیا کرتے ہو۔ جوں جوں بحث ہوتی جاتی ہے شیروانی کے دھبے ہیں کہ مٹتے اور کم ہوتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ سب داغ دور ہو کر شیروانی اچھی خاصی اُجلی نکل آئی گویا اس پر سیاہی گری ہی نہ تھی اور تم اس کو پہن کر بہت ہی خوش ہوئے ہو اور کہتے ہو کہ بس اب میں اسی کو پہنے رہوں گا۔ اور جو دیکھتا ہے شیروانی کی تعریف کرتا ہے کہ سبحان اللہ کیا کپڑا ہے اور دھوبی نے کیسا اچھا دھویا ہے۔ وہ بحث جو تم میں اور اُن بزرگ میں ہوئی مجھ کو لفظ بہ لفظ یاد ہے اور میرا قاعدہ ہے کہ چاہو سمجھوں نہیں مگر خواب کی بات مجھ کو بھولا نہیں کرتی وہ بحث اتنی لمبی ہے کہ اب سے بیان کرنے بیٹھوں تو کئی دن میں ختم ہو مگر خواب میں تو یہ ماجرا جہاں تک میں خیال کرتی ہوں شروع سے آخر تک آدھ گھنٹے میں طے ہو ہوا گیا تھا۔"

صادق تو مذہب کے معاملہ میں بےچین تھا ہی سنتے کے ساتھ اٹھ بیٹھا اور چاہا کہ اسی وقت سے اپنا زہر اگل چلے اس پر صادقہ بولی کہ صبح صادق ہو چکی ہے میں نماز پڑھ لوں تم بھی ضرورتوں سے فارغ ہو تو پھر اطمینان سے باتیں کریں گے اور یہ جھگڑے ایک دن کے تو نہیں ہیں جتنی باتیں میں نے خواب میں دیکھی ہیں کئی نشستوں میں جا کر طے ہوں تو ہوں۔

واسطے کہ میں جانتی تھی کہ خدا بڑا بے نیاز اور غفور الرحیم ہے۔ اگر میں اس کا کوئی قصور کروں گی تو اُس سے معافی کی امید ہے بندے محتاج اور اسی سبب سے دل کے تنگ ہیں اگر ان کا کوئی حق میری گردن پر رہ گیا تو مجھ سے اس کا بدلہ نہیں اتارا جائے گا، ماں باپ بھائی بہن، رشتہ دار، پاس پڑوس، جان پہچان، میں امید کرتی ہوں، ان میں سے کسی کو میرا شاکی نہیں پاؤ گے کیوں کہ میں سب کو رضامند رکھنے کی کوشش میں لگی رہی ہوں جب شادی بیاہ کا چرچا ہوا میں نے اچھی طرح جی میں ٹھان لیا کہ جس طرح ہو سکے تم کو راضی رکھنا اور بے تمہاری مرضی کے تنکا نہ توڑنا۔ بارہا مجھ کو شبہ ہوا کہ میں جو بندوں کے حقوق کو خدا کے حقوق پر مقدم رکھتی ہوں، میری یہ بات کہیں خدا کو بُری نہ لگے۔ بارے رات جو میں نے خواب دیکھا اور جو میں اب تم سے بیان کرنا چاہتی ہوں اُس سے دل کو پوری تسکین ہو گئی، اور اب میں نے سمجھا کہ یہی اصل میں دین داری تھی۔ میں اُس پروردگار کے صدقے جاؤں جس نے اپنے فضل سے مجھ کو اس کی سمجھ دی۔ اب میرا خواب سُننا چاہو تو اُس کے دو رستے ہیں ایک تو یہ کہ جیسی جیسی باتیں تم میں اور اُن بزرگ میں ہوئی ہیں میں اُن کو قلم بند کر دوں یا میں بولتی جاؤں اور تم لکھتے جاؤ یا میں تمہارا پہلا سوال لکھ کر تمہارے حوالے کئے دیتی ہوں تم اس کو دیکھنا مت جب میں بیان کر دوں تو میرے لکھے ہوئے سے ملا لینا اگر مطابق پاؤ تو جاننا کہ سارا خواب سچا ہے اور جو کچھ میں کہتی ہوں اُن بزرگ سے سُنی ہوئی کہتی ہوں۔"

صادق "۔ سارا خواب لکھنے میں تو بڑی دیر لگے گی مجھ سے اتنا صبر نہیں ہو سکتا اور پہلا سوال لکھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ تمہاری نسبت ایسا شبہ نہیں ہو سکتا کہ تم اپنے دل سے بنا کر ایک بات بیان کرو گی اور جھوٹ موٹ لکھ دو گی کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے اور اس بحث میں بہت سی باتیں ایسی بھی ہوں گی جو میں جانتا ہوں کہ تمہاری سمجھ سے باہر ہیں پس مطلق جواب سے تمہارے خواب کی تصدیق ہو جائے گی۔"

صادقہ "۔ لیکن یہ چاہو کہ میں اور باتوں کی طرح خواب کو دھرا دوں یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔"

صادقہ نے اپنی معمولی نماز پڑھی، قرآن کی تلاوت کی اور خانہ داری کے متعلق جو کچھ کہنا سننا تھا کہا سنا، اور سید صادق ہیں کہ پہلے سے آکر جمے بیٹھے ہیں۔ بارے جب صادقہ سب باتوں سے فراغت پا چکی تو صادق سے مخاطب ہو کر بولی کہ "خدا کے ہزاروں لاکھوں بھید ہیں جن میں آدمی کی عقل کچھ کام نہیں کرتی ان میں سے ایک بھید خواب ہے اور خاص کر میرا خواب کہ میں بچپن سے خواب دیکھتی ہوں جیسا کہ سب دیکھتے ہیں میرے خوابوں میں تین باتیں بڑے اچنبھے کی ہیں، ایک تو میں نے آج تک جھوٹا خواب نہیں دیکھا، آگے کی خبر نہیں۔ دوسرے جو دیکھا اکثر تو خواب ہی میں اس کی تعبیر بھی دکھائی دے گئی، اور خواب میں نہ دکھائی دی تو جاگتے ہی سمجھ میں آگئی اور وہ اب تک غلط نہیں نکلی۔ آگے کی خبر نہیں۔ تیسرے یوں سینکڑوں باتیں دیکھتی ہوں سنتی ہوں اور بھول بھی جاتی ہوں مگر خواب کی ایک بات بھی آج تک مجھ کو نہیں بھولی، آگے کی خبر نہیں۔ نہ صرف میں اپنے خوابوں کے معاملہ میں حیران ہوں بلکہ جو سنتا ہے حیران ہوتا ہے بعض خیال کرتے ہیں کہ اس کے سر پر کچھ ہے حالانکہ خوابوں کے سوائے میں کوئی بات اپنے میں نہیں پاتی اور تم نے بھی کوئی بات نہیں پائی ہوگی۔ اور انشاء اللہ پاؤ گے بھی نہیں۔ میں نے ہر چند چاہا کہ مجھے خواب نہ دکھائی دیا کریں بلکہ دعا بھی کی، مگر خدا جانے کیا مصلحت ہے کہ خواب آئے بدون نہیں رہتے۔ بعض ان خوابوں کی وجہ سے مجھ کو بڑی مقدس سمجھتے ہیں اور جہاں تک میں خیال کرتی ہوں میں ایک معمولی طور کی عورت ہوں۔ ہاں نماز روزہ جیسا کچھ بن پڑتا ہے کرتی رہتی ہوں اور میں بہتیری عورتوں کو جانتی ہوں جو نماز روزہ میں مجھ سے کہیں بڑھ کر ہیں مگر خدا جانے کیا بات تھی کہ بچپن سے مجھ کو جھوٹ سے، پیٹھ پیچھے لوگوں کو برا کہنے سے، چغلی سے لڑائی جھگڑے سے، غرض کسی کو کسی طرح ستانے ایذا پہنچانے سے دلی نفرت رہی۔ میری اتنی عمر ہونے آئی میں نہیں سمجھتی کہ میں نے کسی کو ناراض کیا یا کسی کا دل دکھایا ہو۔ میں سچ کہتی ہوں کہ میں خدا سے زیادہ اس کے بندوں سے ڈرتی رہی اس

چھوٹے چھوٹے خواب تو خیر ایسے بڑے خواب جن کے بیان کرنے میں وہی لفظ نقل کرنے پڑتے ہیں جو میں نے خواب میں سنے تھے ذرا مشکل سے ادا ہوتے ہیں۔ میرے دماغ پر ایک طرح کا بوجھ پڑتا ہے جس کی کیفیت میں بیان نہیں کر سکتی اتنا بڑا نہیں مگر اسی طرح کا ایک خواب میں اپنے ماموں کے لئے دیکھ چکی ہوں، ان کا امتحان ہونے والا تھا اور بہت پریشان تھے مجھ کو خواب میں پہلے سے سوالات معلوم ہو گئے، اور میں نے اُن کو وقت سے پہلے لکھ کر بھیج بھی دیئے تو بڑی مشکل سے لکھے گئے تھے۔ پس مجھ سے زبانی بھی کہلواؤ گے تو کئی دن لگیں گے، اور میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سے زیادہ اس دماغی بوجھ کی برداشت نہیں کر سکوں گی۔"

صادق۔" یہ ہے تو زبانی بیان کرنے سے لکھنا ہی بہتر ہو گا کہ خواب کی تحریری یادداشت بھی رہے گی۔"

صادقہ۔" ہاں میں بھی لکھنے ہی کو زیادہ پسند کرتی ہوں۔ تم میرے پاس بیٹھے رہو اور میں تمہارے رو برو لکھتی جاؤں۔ تم ساتھ کے ساتھ دیکھتے جانا میرا لکھنا بیان کی جگہ ہو گا۔ اور تمہارا دیکھنا سُننے کی جگہ۔"

صادق۔" یہ ٹھیک ہے اور اس کو سوال و جواب کے طور پر لکھو یعنی جو کچھ میں نے کہا ہو سوال اور جو اُن بزرگ نے فرمایا ہو جواب۔"

اس کے بعد صادقہ نے اپنا خواب قلم بند کرنا شروع کیا وہ پہلے تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر کے اور بعض اوقات ماتھے پر ہاتھ رکھ کر یاد کرتی اور پھر اُس کو لکھتی۔

چودھویں فصل

صادقہ کا مذہبی خواب

خدا اور اُس کی وحدانیت اور صفات کا عقلی ثبوت

صادق "۔ پہلے مجھ کو اس سے مطمئن کیجئے کہ خدا ہے؟"

بزرگ :- " اطمینان کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک اطمینان تو آدمی کو اپنی آنکھوں کے دیکھے کا ہوتا ہے، ایک اطمینان دوسرے سے کہے کا ہوتا ہے، ایک اطمینان عقلی گواہی کا ہوتا ہے کہ دیکھا نہیں سُنا نہیں مگر دل ہے کہ آپ ہی آپ تسلیم کر لیتا ہو کہ ہاں یہ بات اسی طرح پر ہے۔ لوگ عید کے چاند میں اختلاف کرتے ہیں کہ ہوا یا نہیں تو اس صورت میں اطمینان کے دو ذریعے ہو سکتے ہیں، یا تو یہ کہ مطلع صاف ہو اور ہم اپنی آنکھ سے واضح طور پر چاند دیکھ لیں یا ہم آپ نہ دیکھیں تو معتبر آدمی جنہوں نے واضح طور پر چاند دیکھا ہے گواہی دیں۔ یا مثلاً دنیا میں ہزاروں شہر ہیں جن کے دیکھنے کا ہم کو اتفاق نہیں ہوا مگر تاریخ جغرافیے کی کتابوں میں ان کا بیان، نقشوں میں ان کا نام اور موقع لکھا ہوا موجود ہے اور بہت سے آدمی ان میں ہو بھی آئے ہیں تو ہم کو اطمینان ہے کہ ہاں یہ شہر اپنی جگہ روئے زمین پر ہیں تو اس طرح کا اطمینان خدا کے بارے میں نہ کسی کو ہوا اور کسی کو ہو لیکن اطمینان کا تیسرا ذریعہ یعنی عقلی گواہی ابھی باقی ہے اور اکثر صورتوں میں اس سے بھی ویسا ہی اطمینان ہو جاتا ہے اور ہونا چاہئے جیسا آنکھوں دیکھے سے مثلاً ایک گھڑی ہمارے سامنے پیش کی جائے تو اکثر ہم خیال نہیں کرتے لیکن کریں تو اس سے انکار بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ آپ سے آپ نہیں بن گئی بلکہ کسی کے بنائے سے بنی ہے۔ رہی یہ بات کہ کیوں ہمارے دل میں یہ خیال بیٹھا ہوا ہے کہ کوئی چیز بے بنائے نہیں بنتی اس کا سیدھا سا جواب ہے کہ خدا نے

ہمارے دل ایسے ہی بنائے ہیں جیسے آنکھ رنگ کو، ڈول کو، نزدیک دور کو، ناک بو کو، زبان مزے کو، کان آواز کو، جلد بدن سرد گرم کو، سخت و نرم کو پہچانتی ویسے ہی عقل چیز سے بنانے والے کو پہچانتی ہے۔ نہیں ہو سکتا کہ آنکھ صحیح و سلامت ہو اور آدمی چیزوں کا رنگ روپ نہ پہچانے۔ اسی طرح ممکن نہیں کہ انسان معمولی عقل بھی رکھے اور اس کا مقر نہ ہو کہ دُنیا کے کارخانہ کا کوئی نہ کوئی بنانے والا ہے جس کو خدا کہتے ہیں۔ ہمارے ظاہری حواس ایک حد تک کام دیتے ہیں، اور اس حد سے بڑھ کر معطل۔ آنکھ سینکڑوں کوس کی چیز نہیں دیکھتی، کان سینکڑوں کوس کی آواز نہیں سنتے۔ اسی طرح عقل کے کام دینے کی بھی ایک حد ہے۔ ہم دنیا کے کارخانے کو دیکھ کر عقل کے ذریعے سے اتنا جانتے ہیں کہ اس کا کوئی بنانے والا ہے۔ اور ایک ہے، عیب سے پاک، نقصان سے منزہ، قادر ہے، علیم ہے، حکیم ہے، رحیم ہے یعنی جتنی عمدہ سے عمدہ صفتیں خیال میں آسکتی ہیں وہ اُن سب سے متصف ہے۔ کیوں کہ ان سب باتوں کا پتہ ہم کو اسی دُنیا کے کارخانے سے ملتا ہے مثلاً اگر کئی خدا ہوں تو ایسی کیا بات ہے کہ ان میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا اور اختلاف ہوا تو لڑائی ٹھیری۔ ضرور ہے کہ ایک ہارے اور ایک جیتے تو جو ہارا تو وہ بیچارا خدائی سے معزول۔ بندوں کی لڑائی نے دُنیا کا کیا حال کر رکھا ہے۔ اگر کئی خدا ہوں اور آپس میں لڑنے لگیں تو اُن کی ٹکر کون سنبھالے۔ غرض دُنیا کے کارخانے کا انتظام دلالت کر رہا ہے کہ یہ ایک ارادے کا محکوم ہے اور یہی حال ہے خدا کی کل صفتوں کا پس عقل کے ذریعے سے ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ خدا ہونا چاہئے اور ایسا ہونا چاہئے اور وہ ہے اور ایسا ہی ہے۔ اتنی ہی معرفت انسان کو ہے اور اتنی ہی ہو سکتی ہے اور اتنی ہی اُس سے طلب کی جاتی ہے۔ انسان اس سے آگے قدم رکھنا چاہے تو وہ اس ارادے میں اس سے زیادہ کامیاب نہ ہوگا جیسے وہ آنکھ سے پس دیوار دیکھنا چاہے یا سینکڑوں کوس کی چیز کو بے مدد دوربین دیکھنا چاہے پہلی اور مکروہ غلطی جو انسان سے ہوتی ہے یہ ہے کہ وہ یا تو عقل سے بالکل کام لینا نہیں

چاہتا یا چاہتا ہے تو اس کی بساط سے بڑھ کر کام لینا چاہتا ہے۔"

صادق۔ "تو کیا سارے آدمی جو خدا کے قائل ہیں ایک ہی درجے کی معرفت رکھتے ہیں۔"

بزرگ۔ "بے شک۔ مگر یقین میں فرق ہے۔ اب دیکھو کہ مثلاً موت ہی ایک چیز ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی دوسری یقینی چیز نہیں ہو سکتی، لیکن لوگوں کا کیا حال ہے کہ اس تصور کو ذہن میں آنے ہی نہیں دیتے، اور آنے دیتے ہوتے تو دنیا کا یہ رنگ نہ ہوتا پس موت کے یقین کے معنی یہ ہیں کہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی سب آدمیوں کا حال یکساں نہیں ہے بعض شاید دن رات میں ایک لمحہ کے لئے موت کا بھی خیال نہیں کرتے اور بعض کا شاید کوئی منٹ موت کے خیال سے خالی نہ ہو۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے حال میں لکھا ہے کہ انھوں نے گھر میں ایک سرداب کھدوا رکھا تھا سلطنت کے مشاغل سے فارغ ہو کر بالالتزام ہر روز کچھ دیر کے لئے موت کا خیال تازہ رکھنے کی غرض سے سرداب میں جا کر لیٹتے۔ زیارت قبور کی بھی اصل غرض یہی ہے کہ قبروں کو دیکھ کر آدمی موت کو یاد کرے اور سمجھے کہ ایک نہ ایک دن میری بھی یہی نوبت ہونی ہے لیکن آدمی ایسا بے حیا ہے کہ عبرت کی جگہ بزرگوں کے مزاروں پر میلوں کے جمگھٹے ہوتے ہیں یا خدائے حی و قیوم کی عوض عاجز مُردوں کی پرستش کی جاتی ہے۔ قبریں تو قبریں ہم نے تو لوگوں کے جنازے کے ساتھ دیکھا ہے کہ کچھ تو رنج میں ہیں اس واسطے کہ میت مر جانے سے اُن کی کچھ غرضیں فوت ہیں، کچھ تقسیم ترکہ اور مراسم غمی کی سوچ میں ہیں، کچھ اُلاہنا اتارنے کے لئے ساتھ ہو لئے ہیں کہ کل کلاں کو کوئی یہ نہ کہہ بیٹھے کہ اتنا قریب کا رشتہ ایسی محبت ملاقات چار قدم میت کو کندھا لگاتے یا مٹی دیتے نہ بن پڑا۔ کیا مضائقہ جینا مرنا سبھی کے ساتھ ہے۔ میت کے ساتھ بھڑ بھڑ کا تو بہتیرا کچھ ہے مگر دلوں کو ٹٹولو تو کسی ایک کو بھی اس کا خیال نہیں کہ یہ ہوا تو کیا ہوا کہ ہم ہی جیسا ایک آدمی سب کچھ تھا یا ایک پھونک نکل گئی

تو کچھ بھی نہیں تھا اور یہی منزل ہم سب کو درپیش ہے نہیں معلوم کس وقت بلاوا آوے اور یہ سارا ڈھوڈا دھرا رہ جائے۔ بعینہٖ یہی حال خدا کی معرفت کا ہی کہ اس سے انکار تو نہیں ہوسکتا کیوں کہ انسان کی بناوٹ ہی اس قسم کی واقع ہوئی کہ خدا کو مانے بدون اس کو چارہ ہی نہیں مگر بعض تو ایسا ماننا مانتے ہیں کہ گویا خدا کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور بعض اس حد سے نہیں بڑھتے کہ انکار کرتے نہیں بن پڑتا اور ان دو حدوں کے درمیان بے شمار مدارج ہیں۔ کوئی ہمہ وقت مستغرق، کوئی اس سے کم، کوئی اس سے بھی کم یہانتک کہ کوئی بالکل بے فکر۔"

صادق۔" خدا کے ماننے سے اُس کا نہ ماننا زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہی جب ہم کو ایسا خدا ماننا پڑتا ہے جو آپ سے موجود ہوگیا ہے تو کیوں نہ ہم دُنیا ہی کو مان لیں کہ وہ آپ سے آپ موجود ہوگئی ہے۔

بزرگ۔" یہ اعتراض ہے انسان کے دل کی بناوٹ پر کہ کیوں دُنیا کے آپ سے آپ موجود ہونے کو قبول نہیں کرتا اور کیوں خدا کے ماننے سے اس کی تسکین ہوجاتی ہے۔"

صادق۔" تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فرد بشر خدا سے منکر نہیں اور منکر ہو نہیں سکتا۔ پھر پھر مشرک اور بُت پرست اور دہریئے یہ کیا ہیں؟"

بزرگ۔" بے شک جس طرح کوئی آدمی جانور نہیں ہوسکتا، درخت نہیں ہوسکتا، پتھر نہیں ہوسکتا اسی طرح کوئی آدمی خدا سے منکر بھی نہیں ہوسکتا۔ آدمی ہونا اور خدا کا قائل ہونا لازم و ملزوم ہیں، جب تک آدمی آدمی ہے وہ خدا کا بھی ضرور قائل ہے، ایسا ہو نہیں سکتا کہ آدمی ہو اور خدا کا قائل نہ ہو۔ تم مشرکوں کو منکر خدا سمجھتے ہو ہم لوگ تو ایک ہی خدا کو مانتے ہیں اور مشرک کئی خدا کے قائل ہیں تو اُن کو منکر خدا کیوں کر کہا جاسکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ لوگ خدا کا مصداق قرار دینے میں اور اس کی صفات میں غلطیاں کرتے ہیں، چاہیئے خدا سمجھنا کسی اور سمجھ لیتے ہیں کسی کو، چاہیئے سمجھنا کیسا

اور سمجھ لیتے ہیں کیسا! اسی وجہ سے وہ منکرِ خدا سمجھے جاتے ہیں۔ اور ایک اعتبار سے الزام ہے بھی واجبی"۔

صادق "آپ کو معلوم نہیں، ہزاروں آدمی ہیں جو سرے سے خدا ہی کے قائل نہیں"۔

بزرگ "مجھ کو معلوم نہ ہو، مگر جتنے لوگوں کو منکرِ خدا خیال کیا جاتا ہے، اُن میں سو پیچھے ایک بھی مشکل سے منکرِ خدا نکلے گا۔ اُن میں بہت سے ایسے لوگوں کو گن لیا جاتا ہے، جو سرے سے اس طرف توجہ ہی نہیں کرتے، وہ کھاتے پیتے، سورہتے اور جانوروں کی طرح اپنی زندگی کے دن تیر کر دیتے ہیں، ان میں بہت سے ایسے لوگوں کو گن لیا جاتا ہے جو اس سبب سے کہ انھوں نے اچھی طرح غور نہیں کیا، خدا کے بارے میں طرح طرح کی غلطیاں کرتے ہیں۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ لوگ خدا کے حکم کی وجہ سے بھی نکراپن اور سرکشی کرتے ہیں یعنی اگر کوئی شخص معاذاللہ منکرِ خدا ہو یا اُس کی جناب میں گستاخی کرے یا اُس کا حکم نہ مانے تو دنیا میں اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، نہ اس پر بجلی گرتی، نہ وہ ہیضہ کر کے مرتا، نہ اُس کے گھر میں آگ لگتی۔ اس سے اور بھی مغالطہ واقع ہوتا ہے۔ اور کوئی کوئی نالائق خدا کے ساتھ کھیل کرنے لگتے ہیں۔ لیکن یہاں کا خدع نفس ہے۔ جب اُن پر کوئی مصیبت نازل ہوتی تو خدا کے آگے گڑگڑانے لگتے اور اصلی فطرت کھل پڑتی ہے۔ فرعون پر کیا گزری تھی کہ وہ دنیاوی خوش حالی کے غرے میں اگر موسیٰ علیہ السلام کی ضد سے اپنے ہی تئیں خدا کہتا رہا۔ جب لگا ڈوبنے اور اپنی درماندگی اس پر ثابت ہوئی تو چار و ناچار اس کو خدا کا اقرار کرنا پڑا اور بول اٹھا۔ آمنت انہ لا الٰہ الا الذی آمنت بہ بنو اسرائیل وانا من المسلمین[1] اور ایک فرعون پر کیا موقوف ہے۔ ہر شخص بجائے خود فرعون ہے۔ اگر سوچے اور سمجھے چنانچہ انسان کی طبیعت کو خدا سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں۔ وہ انسان کے بارے میں فرماتا ہے اور یہی مضمون دوسرے لفظوں میں کئی جگہ قرآن میں آیا ہے حتیٰ اذا کنتم فی الفلک وجرین بھم[2]

---

[1] اب مجھ کو بھی یقین ہو گیا کہ جس خدا پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں وہی خدا ہے اور اب میں بھی اسکو مانتا ہوں۔ [2] یہاں تک کہ جب تم ناؤ میں ہو رہے ہو۔ (باقی صفحہ آئندہ)

اس سے زیادہ کہنے کا حق ہے، تو صادقہ ذری کی ذری رُک کر لکھ چلی) میں کہہ چکا ہوں کہ میں بُت پرستوں اور مشرکوں کو منکر خدا نہیں سمجھتا۔ اس عقیدے کے لوگ خدا کو تو مانتے ہیں مگر خدائی کے مصداق کی تعیین میں غلطی کرتے ہیں"۔

صادق "۔ اچھا پھر اس میں خدا کا کیا حرج ہے؟"

بزرگ "۔ خدا کا تو ذاتی کچھ بھی حرج نہیں، اگر ساری دُنیا اس سے منحرف ہو بیٹھے اور اُس کی خدائی کی قائل نہ ہو تو بھی وہ دنیا جہان کا خالق ہے، اور تو بھی وہ دنیا جہان کا پروردگار ہے اور تو بھی وہ علیم ہے، اور تو بھی وہ قادر ہے، مثلاً روز روشن میں آفتاب بڑا چمک رہا ہے اور اگر ساری دنیا آفتاب سے آنکھیں موند لے اور کہے کہ آفتاب نہیں اور یہ روشنی آپ سے آپ ہو رہی ہے۔ یا آفتاب کے سوائے کسی اور چیز کی ہے، تاہم آفتاب آفتاب ہے مگر ہاں ہم جو چیز بناتے ہیں، ہر ایک چیز کی کوئی نہ کوئی غرض و غایت ہوتی ہے مکان بناتے ہیں۔ رہنے کے لئے، کپڑا بناتے ہیں ستر عورت اور سردی گرمی سے بچنے کے لئے۔ اسی طرح خدا نے جو ہزاروں لاکھوں قسم کی مخلوقات دُنیا میں پیدا کی، ہر ایک مخلوق کے پیدا کرنے کی کوئی غرض و غایت ضرور ہے، بعض مخلوقات کی بعض اغراض کو انسان سمجھتا بھی ہے اور اکثر کو نہیں سمجھتا، شاید آگے کو سمجھے یا نہ سمجھے، اور دُنیا جو ترقی کر رہی ہے نئے نئے علوم ایجاد ہوتے چلے جا رہے ہیں، نئے نئے فنون، نئی نئی کلیں، نئی نئی صنعتیں۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ آدمی مخلوقات عالم کی اغراض و غایات سے واقفیت پیدا کرتا چلا جا رہا ہے معلوم نہیں خدا کو کس حد تک انسان کا واقف کرنا منظور ہے۔ انسان نے سٹیم (بھاپ)، اور الکٹریسٹی (قوت برقی) اور چیزوں کے کیمیاوی خواص اور کیا کیا معلوم کر کے کیا کیا کام نکالے ہیں۔ اور کیا سب آدمی ہم مسلمانوں کی طرح جاہل اور بدنصیب ہیں۔ اہل یورپ کو دیکھو کہ ہم کو ان کے مقابلے میں اپنے تئیں جانور کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کیا کچھ کر گزرے اور کیا کچھ کر رہے ہیں۔ اور کیا کچھ آگے کو نہ کریں گے۔ تو خدا نے جو انسان کو ایک خاص طرح کا

بریح طیبۃ وفرحوبھا جاءتھا ریح عاصف وجاءھم الموج من کل مکان وظنوا انھم احیط بھم دعوا اللہ مخلصین لہ الدین لئن انجیتنا من ھذہ لنکونن من الشاکرین فلما انجاھم اذا ھم یبغون فی الارض بغیر الحق یا ایھا الناس انما بغیکم علیٰ انفسکم متاع الحیٰوۃ الدنیا ثم الینا مرجعکم فننبئکم بما کنتم تعملون۔ سُنتے ہیں کہ جو مجرم بڑے چالاک اور سیانے ہوتے ہیں۔ اُن کو شراب پلا دیتے ہیں کہ عقل فساد پیشہ سے اُن کا اختیار اٹھ جائے اور وہ نشے کی حالت میں سارا کچا حال ظاہر کر دیا کرتے ہیں۔ تو جو شخص خدا سے انکار کرنے کا مجرم ہو اُس کی شراب ہے مصیبت کہ جب مصیبت پڑے گی۔ اور اس کو اپنا عجز معلوم ہوگا ممکن نہیں کہ وہ اقرار نہ کرنے لگے۔ اور یہ شراب کسی کو زندگی میں نہ پلائی گئی تو مرتے وقت ضرور پلائی جائے گی۔ وجاءت سکرت الموت بالحق، تو ایسا انکار کیا سند ہو سکتا ہے مصیبت پڑے اور خدا یاد نہ آئے تو جانیں اور یہی تو حکمت ہے کہ بزرگانِ دین نے تکلیف اور ایذا اور تنگ حالی میں رہنے کو پسند کیا ہے کہ اس سے بہتر کوئی تازیانہ غفلت ہو نہیں سکتا۔ آدمی ہو اور خدا سے منکر ہو، ایسا ہے جیسے پتھر ہو اور اوپر سے گرایا جائے اور زمین پر نہ گرے۔"

صادق: اگر آدمی منکرِ خدا ہو نہیں سکتا تو پھر شرکت اور بت پرستی پہ اتنا شور و شغب کیوں اور اس قدر غیظ و غضب کس لئے؟"

بزرگ: "بس یہی بی! اے پاس کیا ہے (یہ لکھ کر صادقہ جھینپی، مگر سید صادق نے کہا میں جانتا ہوں کہ یہ تم نہیں کہہ رہی ہو۔ بلکہ دوسرے کے کہنے کی نقل کر رہی ہو۔ بے شک بے تامل یہی لفظ لکھو جو ان کے منہ سے نکلا) جب ہیں بر سر غلط ہوں تو ان بزرگوں کو یہ اور

۱؎ اور وہ لوگوں کو باد موافق کے ساتھ لے کر روانہ ہوتی ہے اور لوگ خوش ہوتے ہیں۔ یکایک ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے اور ہر طرف سے لہریں آنے لگتی ہیں اور خیال ہوتا ہے کہ اب گھرے گئے تو خدا سے بڑے خلوص کے ساتھ دعائیں مانگنے لگتے ہیں کہ اگر ہم کو اس بلا سے نجات ہو تو ہم تیرا بڑا احسان مانیں پھر جب خدا ان کو نجات دیتا ہے تو خشکی میں پہنچ کر ناحق ناروا بغاوت کرنے لگتے ہیں لوگو یہ بغاوت تمہارے ہی حق میں مضر ہے، دنیا کی زندگی میں اس سے فائدہ اٹھا لو پھر آخر کار تم کو ہمارے پاس لوٹ کر آنا ہے اس وقت ہم تم کو بتا دیں گے کہ تم دنیا میں کیا کرتوت کرتے رہے ہو۔ ۱۲

مخلوق بنایا ہے۔ اس کو عقل دی، اس عقل کی بھی غرض وغایت ہونی ضرور ہے، اور وہ نہیں ہے۔ مگر علم یعنی اپنے تئیں جاننا اور اپنے سوائے اور چیزوں کو جاننا کیونکہ اگر وہ جانے گا نہیں، دنیا میں اپنے اختیارات کیونکر عمل میں لائے گا۔ دنیا کی چیزوں میں تصرفات اشرف المخلوقات کس طرح بنے گا۔ خلافت الٰہی کا بار کس برتے پر اٹھائے گا؟ پس علم انسانی کی ابجد یہ ہے کہ وہ اپنے تئیں جانے اور اپنے تئیں جاننا تو خدا کو جاننا۔ من عرفہ نفسہ فقد عرف ربہ تو جس مصلحت سے خدا نے انسان کو پیدا کیا، جس مصلحت سے اس کو عقل دی، اسی مصلحت سے خدا یہ بھی چاہتا ہے کہ انسان اپنے تئیں جانے اور اپنے تئیں جانے گا تو خدا کو جانے گا پہچانے گا۔ اگر انسان کے پیدا کرنے سے خدا کا کچھ حرج تھا تو انسان کے اپنے تئیں نہ جاننے یعنی خدا کو نہ جاننے سے بھی اس کا حرج ہو تو اس میں قباحت کیا ہے۔ خدا کو جاننا شرطِ انسانیت ہے اگر انسان نے اتنی موٹی بات بھی نہ جانی کہ میں اپنے ارادے سے پیدا نہیں ہو گیا، اپنے ارادہ سے زندہ نہیں ہوں۔ اپنے ارادہ سے مروں گا نہیں، میرے کئے سے دنیا چل نہیں رہی۔ تو اس نے جانا ہی کیا۔ اور وہ جانے ہی گا کیا؟ یعنی خدا نے اس کو بنایا انسان اور اس نے بننا چاہا جانور، اور جانوروں سے گدھا اور گدھے سے بھی بدتر، غرض جس طرح خدا نے انسان کو انسان بنایا، اس کو آنکھ دی کہ دیکھے، کان دیئے کہ سنے، ناک دی کہ سونگھے، زبان دی کہ مزہ لے، بولے۔ اسی طرح خدا نے انسان کو عقل دی کہ اس سے کام لے۔ اور عقل کا پہلا کام ہے کہ خدا کو پہچانے۔ پس اگر خدا انسان سے چاہتا ہے کہ وہ اپنے خالق کو پہچانے تو وہ حقیقت میں اپنے حکم کی تعمیل چاہتا ہے کہ میں نے اس کو انسان بنایا ہے، یہ انسان بنے، مسئلہ ہے ذرا نازک، بہت غور سے ذہن نشین ہوتا ہے۔ تین باتیں ہیں۔ ۱ خدا کو نہ ماننا۔ خدا سے غافل ہونا۔ ۳ خدا کے مصداق کی تعیین میں غلطی کرنا۔ میرے نزدیک پہلی قسم بحث سے خارج ہے۔ یعنی ممکن نہیں کہ آدمی خدا کا قائل نہ ہو۔ جیسے ممکن نہیں کہ آنکھ صحیح وسالم ہو اور نہ دیکھے، کان صحیح وسالم ہوں اور نہ سنیں، ہاں دوسری دو قسمیں

کثیر الوقوع ہیں۔ یعنی لوگ اکثر خدا سے غافل ہیں۔ اور مصداق خدا کی تعیین میں غلطی کرتے ہیں۔ بلکہ مصداق کی تعیین میں غلطی کرنا یہ بھی ایک طرح کی غفلت ہی ہے۔ ذرا بھی تامل کو کام میں لاؤ تو اس غلطی کی اصلاح ہو جاتی ہے، اور دل بولنے لگتا ہے۔ کہ یہ عناصر، یہ اجرام فلکی، یہ فرشتے یہ پیغمبر، یہ بزرگانِ دین، یہ قبریں، یہ بُت یعنی خدا کے سوائے جتنی چیزیں ہیں۔ ان میں سے کسی کو خدا بننے کی صلاحیت نہیں، اس کو دین کہو تو، فطرت اللہ کہو تو، انسان کی خاص طور کی بناوٹ سمجھو تو، بات ایک ہی ہے، وہ تنکے کی اوجھل پہاڑ سُنا ہو، بس وہی حال دین کا ہے۔ لوگوں نے بات کا بتنگڑ بنا رکھا ہے، ہے ہوائے کچھ بھی نہیں۔ اگر دو اور دو کا چار ماننا چار تسلیم کرنا، چار سمجھنا انسان کے لئے کوئی تعریف کی بات ہے، تو بے شک اُس کو خدا کا ماننا خدا کو تسلیم کرنا، خدا کو پہچاننا بھی تعریف کی بات ہونی چاہیئے۔ خدا کو ماننا تسلیم کرنا پہچاننا تو تعریف کی بات نہیں، ہاں نہ ماننا، نہ تسلیم کرنا، نہ پہچاننا یعنی بداہت کا انکار البتہ الزام کی بات ہے غرض آدمی منکر خدا تو ہو نہیں سکتا۔ مگر یہ کہ وہ دیوانہ اور مسلوب العقل ہو، اور دیوانہ و مسلوب العقل ہوا تو وہ بیچارہ معذور مرفوع القلم ہے۔ ہاں انسان سے خدا کے بارے میں غفلت ہو سکتی ہے۔ خدائی کے مصداق کی تعیین میں غلطی ہو سکتی، اور ہو سکتی کیا کثرت سے ہوتی ہے اور اسی غفلت کے دفعیے اور اسی غلطی کی اصلاح کے لئے پیغمبروں کے آنے کی ضرورت تھی، اور وقتاً فوقتاً پیغمبر آتے رہے"۔

صادق۔ "اگر یہی دین ہے، تو کچھ بھی نہیں"۔

بزرگ۔ "دین یہی ہے۔ اور یہی بہت کچھ ہے، اور یہی سب کچھ ہے"۔

صادق۔ "ہر ملک اور ہر زبان کے کتب خانوں میں دینی کتابوں کے انبار لگے پڑے ہیں، تو آپ کے نزدیک یہ سب فضول ہے، اور اختلاف دین نے جو دنیا میں ایک فساد برپا کر رکھا ہے کہ آدمی آدمی کو کھائے جاتا ہے، یہ سب بے اصل محض ہے"۔

عقل انسانی کی نارسائی

بزرگ۔ "سنو صاحب، اس طرح کی پریشان گفتگو سے تو کچھ ہوتا ہوتا نہیں، پہلے ہمارے

آپ کے درمیان دو باتوں کا قرار داد ہو جائے۔ اوّل یہ کہ انسان کی عقل اور اس کے علم کو آپ محدود سمجھتے ہیں یا نہیں؟"

صادق"۔ ذرا اس کی تصریح کیجئے"۔

بزرگ"۔ میرا مطلب یہ ہے کہ خدا نے جو انسان کو علم دیا ہے۔ اور علم حاصل کرنے کے لئے اس کو عقل عطا فرمائی ہے، یا یوں بھی نہ سہی کہ خدا نے دیا ہے، اور خدا نے عطا فرمائی ہے۔ بلکہ انسان جو عقل رکھتا ہے کیا وہ اس درجہ کی قوت ہے کہ ہر ایک بات اور ہر ایک چیز کی کنہ کو دریافت کر سکتی اور اس کا علم جامع اور شامل اور کامل ہے اور کوئی چیز کوئی واقعہ انسان کی عقل کی گرفت سے خارج نہیں"۔

"چونکہ زمانہ روز بروز ترقی کرتا۔ اور نئے نئے علوم، نئے نئے فنون ایجاد ہوتے چلے جا رہے ہیں عقل انسانی کے لئے کسی حد کا قرار دینا مشکل ہے"!

"یہ تو عین دلیل عقل انسانی کے قصور کی ہے، اور کم سے کم یہ بات تو ثابت ہوتی ہے کہ کارخانہ قدرت الٰہی کے اسرار کی کچھ انتہا نہیں، اور باوجودیکہ ابتدائے آفرینش سے انسان اس کی ٹوہ میں لگا ہے۔ اور اس نے کچھ کسی قدر دریافت بھی کیا ہے لیکن خزانہ اسرار کی معموری پر نظر کرتے گویا کچھ بھی دریافت نہیں کیا۔ سر اسحاق نیوٹن نے (نیوٹن کے نام سے صادق ذرا چونکا سا ہوا) بالکل ٹھیک کہا تھا کہ گو میں نے کشش کا مسئلہ دریافت کیا جس نے سائنس کی کایا پلٹ دی، مگر کارخانہ قدرت کے آگے میری مثال اس ناسمجھ بچے کی سی ہے جو سمندر کے کنارے بیٹھا ہوا سیپیاں سمیٹ رہا ہے۔ اور اپنے جی میں خوش ہے کہ سمندر کی غرض و غایت کو جیسا میں نے سمجھا کسی نے نہیں سمجھا۔ اور جب ہزاروں برس کے سفر کے بعد ابھی منزل کی ابتدا ہے تو انجام معلوم ؎

دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر　　ما ہم چناں در اوّل وصف تو ماندہ ایم

انسان کارخانہ قدرت کے اسرار تو کیا جانے وہ اتنا تو جان سکا ہی نہیں کہ خود

اُس کی رُوح کیا چیز ہے۔ اور جسم سے کس طرح کا تعلق رکھتی ہے۔ یہ ہیں معنی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔"

صادق۔" سمجھا اور خوب سمجھا"۔

بزرگ۔" اس وقت منہ سے اقرار کر لینے کی سند نہیں ہے۔ اس کو اپنی جگہ خوب سوچنا اور جب عقل انسانی کا عجز و قصور اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے گا تو دین کی ساری باتیں دل میں بیٹھتی چلی جائیں گی۔ دنیا میں بڑی گمراہی اسی عقل کی وجہ سے ہے۔ ہر بات میں انسان عقل کو دخل دیتا۔ اور اس سے وہ کام لینا چاہتا۔ جو اس کے بوتے کا نہیں۔ میں بتاؤں دین کے کتنی اور کیسی عقل درکار ہے"۔

صادق۔" واہ واہ نیکی اور پوچھ پوچھ"۔

بزرگ۔" حدیث شریف میں دین العجائز والکتاب کی مدح آئی یعنی دین ہے بڑھیوں کا اور مکتب کے پڑھنے والے بچوں کا جن کے دل سیدھے سادھے اور بھولے بھالے ہوتے ہیں۔ دین کے تخم کو ایسی ہی زمین درکار ہے۔ بیج ادھر پڑا اور اُدھر پھولنا پھلنا شروع ہوا۔ ہماری طرح نہیں۔ بات بات میں شک، بات بات میں میکھ بات بات میں اگر مگر طبیعت میں دوا کے قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو تو دوا بیچ کیا خاک اور اثر دکھائے اپنا سر؟ لیکن کچھ کوتے نے سیان پت سے فائدہ حاصل کر لیا ہو گا۔ کچھ ہم اتنی ساری ہوشیاری سے کریں گے۔ کیا خوب کہا ہے ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن   کہ جاہا سپر باید انداختن

غرض ایک تو دین کے بارے میں ذرا سوچ سمجھ کر کام لیا جائے عقل انسانی پر اتنا بھروسہ بھی ٹھیک نہیں کہ جو بات سمجھ میں نہ آئی لگے اس کو جھٹلانے۔ بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ ولما یاتہم تاویلہ کہیں تو آدمی اپنے اندازے کی حد میں رہ کر سمجھا کرے کہ کیا پدی اور پدی کا شوربا کیا آدمی اور کیا آدمی کی عقل۔

انسان کی بے حقیقتی

دوسری بات جو مجھ کو تم سے کہنی ہے۔ تو وہ بھی اسی کے الگ بھگ بلکہ اعتبار سے اسی میں داخل مگر چوں کہ مجھ کو اس پر زیادہ زور دینا منظور ہے میں اُس کو الگ کر کے تمھارے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں (جب صادقہ مردوں کی طرح کھڑی بولی بولتی تھی۔ تب بے اختیار جھجک جھجک جاتی تھی۔ اور اس کا جھجکنا تھا بھی جائے سر) وہ کیا ہے؟ ایاز قدرِ خود بشناس

صادق "یہ کیا؟"

بزرگ "میں اپنے مطلب کو دوسرے لفظوں میں ظاہر کردوں ؎

کارِ خود کُن کارِ بیگانہ مکُن در زمینِ دیگراں خانہ مکُن

صادق "میں تو اب بھی نہیں سمجھا"

بزرگ "اس کا یہ مطلب ہے کہ آدمی گو اشرف المخلوقات ہے۔ سب سے بڑھ کر تو خدا نے اس کو عقل دی ہے۔ جس کے بل پر وہ دنیا میں حکمرانی کرتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک مہمان عزیز ہے اور دنیا کا گھر اسی کی آسائش کے لئے سجایا گیا ہے ؎

جو خانۂ ہستی میں ہے انساں کے لئے ہے آراستہ یہ گھر اسی مہماں کے لئے ہے

یہ مخدوم ہے اور ہوا اور پانی اور حیوانات اور نباتات غرض دنیا اور جو چیز دنیا میں ہے۔ سب اس کی خادم۔ اس کی ساخت، اس کی صورت۔ دلالت کرتی ہے کہ یہ گھر ہے۔ اور دوسری مخلوقات مامور، یہ روئے زمین کا بادشاہ ہے۔ اور دوسری مخلوقات اس کی رعایا۔ دیکھتے نہیں کہ دوسرے جانور سرنگوں رہتے ہیں۔ اور یہ سربلند۔ یہ سب کچھ ہے۔ مگر پھر بھی عاجز و ناتواں ہے۔ حکومت ہے مگر کے دن کی؟ وہی مثل ہے۔ دو دن کی گو توالی اور پھر وہی کھرپا اور جالی، سارا کھیل ہوا کا ہے! پھونک نکلی اور وہی مٹی کی مٹی، وقت کے ازلی ابدی ہونے کو دیکھو اور پھر انسان کی ہستی پر نظر کرو۔ تو اس کی ہستی محض نمود بے بود معلوم ہوتی ہے۔ قطعہ

ایسی ہستی عدم میں داخل ہے نے جواں ہم نہ طفل شیر ہوئے
ایک دم تھی نمود بود اپنی یا سفیدی کی یا اخیر ہوئے
یعنی مانند صبح دنیا میں ہم جو پیدا ہوئے تو پیر ہوئے

اور پھر مختصر ہو تو خیر، مختصر ہونیکے ساتھ بے ثبات، غیر متیقن اور انسان کے اختیار سے خارج۔ یہ ہے وہ ہستی جس پر ہم لوگ بھولے اور پھولے پھرتے ہیں۔ بات تو یہ ایسی صاف ہے کہ کوئی احمق سے احمق اور ہٹ دھرم سے ہٹ دھرم بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ مگر صرف انکار نہ کرنے سے کام نہیں چلتا۔ اس خیال کو سوچ سوچ کر ایسا راسخ کرنا چاہیئے کہ ہمہ وقت نہیں تو اکثر اوقات پیش نظر رہے۔ دنیا کے واقعات اپنے طور پر ہوتے رہتے ہیں ہم مانیں یا نہ مانیں۔ تسلیم کریں یا نہ کریں۔ سمجھیں یا نہ سمجھیں، جتنا غور کرو گے، اپنا درماندہ اور بے حقیقت اور ناچیز ہونا تم پر کھلتا چلا جائے گا۔ واقعات نفس الامری کے تسلیم کرنے کے سوائے دین ہم سے کچھ اور نہیں چاہتا۔ دین کا لب لباب یہ ہے کہ ہم کو آدمی بنایا گیا ہے اور ہم آدمی بن کر دنیا میں رہیں۔"

صادق:" آپ تو کچھ اس طرح کی تقریر کرتے ہیں۔ کہ میرے شکوک اور اعتراضات کے پہلو ہی پر نہیں آنا چاہتے۔"

بزرگ:" میں تمہارے شکوک واعتراضات کے پہلو پر نہیں آنا چاہتا یا تم شک اعتراض کی گنجائش نہیں پاتے؟ بھلا اس وقت تک جو کچھ میں نے کہا، اس میں سے کوئی بات تم کو تسلیم نہ ہو تو بیان کرو کہ میں تمہارا شک رفع کروں۔

صادقہ کا مذہبی خواب، دینی خیالات کا سلسلہ

صادق:" میں تو یوں جاننا چاہتا ہوں کہ دین ہے کیا چیز؟"

بزرگ:" اگرچہ میں اس کا جواب دے چکا ہوں، مگر خیر پھر سہی۔ انسان کا جہاں تک اس کی عقل کی رسائی ہے۔ اپنی حقیقت کو جاننا اسی کا نام دین ہے۔"

صادق:" اور اگر نہ جانے؟"

بزرگ "۔ نہ جانے کیا؟ یعنی اس میں جاننے کی صلاحیت نہ ہو یا صلاحیت ہو اور جاننا نہ چاہے۔ اگر جاننے کی صلاحیت ہی نہیں تو وہ بے چارہ مرفوع القلم ہے، اور اس سے بحث نہیں۔ اور اگر جاننے کی صلاحیت ہے اور جاننا نہیں چاہتا تو اس کی مثال ایسی ہے۔ کہ آنکھیں ہیں اور دیکھنا نہیں چاہتا۔ مگر اس کے نہ دیکھنے سے دنیا تو تاریک نہیں ہوئی جاتی اور اسی لئے پیغمبر بھیجے گئے ہیں کہ جن کو آنکھیں دی گئی ہیں۔ پیغمبر اُن کو دکھائیں اور وہ دیکھیں۔"

صادق: "یہ تو اچھا دین ہے۔ جس میں خدا رسولؐ کا نام تک نہیں۔"

بزرگ: "یہ تمھاری سمجھ کا پھیر ہے۔ جب آدمی نے اپنی حقیقت کو جانا، اس نے خدا اور رسولؐ اور رسول کے احکام اور شریعت اور عاقبت، غرض دین کی سب باتوں کو جانا۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کے یہی تو معنی ہیں۔ اپنی حقیقت کو جاننا، دین کا ایسا جامع خلاصہ ہے کہ اس سے جامع تر کوئی خلاصہ ہو نہیں سکتا۔ اور باقی جو کچھ کتابوں میں اور جو کچھ لوگوں کے دلوں میں اور لوگوں کے موہنوں میں ہے، سب اسی خلاصہ کی تفصیل ہے۔"

صادق: "میں نہیں سمجھتا کہ خود شناسی کو خدا شناسی اور دینداری سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

بزرگ: "خدا شناسی اور دین داری ضروری نتیجہ ہے خود شناسی کا۔"

صادق: "یہ کیوں کر؟"

بزرگ: "ہاں یہ اس طرح پر کہ آدمی اپنے تئیں جانے گا، تو وہ اپنے میں اور دوسری مخلوقات میں فرق بھی کرے گا۔ وہ دیکھے گا کہ دنیا میں ادنیٰ درجے کی مخلوقات جمادات ہیں۔ جہاں پڑے ہیں پڑے ہیں۔ ان میں نہ بالیدگی ہے۔ نہ حرکت ہے۔ نہ کسی طرح کا احساس ہے اور نہ اپنا مثل، اپنا قائم مقام پیدا کرنے کی صلاحیت۔ ان سے اونچے درجے پر نباتات ہیں کہ وہ از خود ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا چاہیں تو نہیں جا سکتے۔ مگر ان میں نمو ہے۔ اپنا مثل پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ اور احساس بھی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی کسی قسم کی جان ہے۔ اُن سے اوپر چلو تو حیوانات ہیں کہ نمو اور اپنا مثل پیدا کرنے کی صلاحیت کے علاوہ اپنے

ارادے سے چلتے پھرتے ہیں۔ ان کا احساس بھی نباتات کے احساس سے اعلیٰ درجے کا ہے۔ یہاں تک کہ اُن کے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی ایک طرح کی عقل ہے، سب سے اوّل اور افضل درجہ حضرت انسان کا ہے جسمانی بناوٹ پر نظر کرو تو جانوروں سے بھی گئے گزرے ہوئے، زور میں، توانائی میں، چستی میں، چالاکی میں، بلکہ احساس میں بھی، مگر ایک عقل پا گئے ہیں جس نے تمام روئے زمین پر اپنا سکّہ بٹھا رکھا ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں (اس نقطہ پر صادقہ ذرا کی ذرا جھجکی) کہ جتنی مخلوقات ہم دیکھتے اور جانتے ہیں، اس میں سے کوئی خدا ہوتا تو کون ہوتا؟"

صادق: "خدا ہوتا ہی کیوں؟"

بزرگ "تم تو لگے پھر ساری بحث کو دہرانے۔"

صادق: "ہاں میں دوہراتا ہوں، اس غرض سے کہ ہر ہر پہلو سے سمجھ لوں۔"

بزرگ "بہت منطقی احتمالات نکالنے کی جگہ نہیں ہے، سمجھنا چاہو تو سیدھی سی بات ہے، نہیں معلوم کہ خدا ہے یا نہیں، ابھی اس کو رہنے دو۔ دُنیا تو ہے اور ہم بھی ہیں۔ آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے، اور عقل ہے جس سے سمجھتے ہیں۔ اس سے کہ دنیا آپ سے آپ بن گئی ہو۔ ہمارا دل نہیں ٹھکتا۔ اور خواہی نخواہی عقل تقاضا کرتی ہے کہ اس عظیم الشان کارخانے کا بنانے والا کوئی نہ کوئی تو ہے۔ اور ہے تو اسی کارخانے کا انتظام دلالت کرتا ہے کہ وہ علیم ہے، قدیر ہے، حکیم ہے، یعنی مجمع تمام صفات کمال ہے، لیکن جن چیزوں کو ہم دیکھتے اور جانتے ہیں، ان میں سے اگر ایسا کوئی ہوتا تو ہم سے کوئی ہوتا، لیکن ہم کو اپنی حقیقت تو معلوم ہے کہ باوجود اشرف المخلوقات ہونے کے عاجز و بے اختیار ہیں۔ بس چار و ناچار ماننا پڑتا ہے کہ خلاّق عالم ایک ہستی ہے جس کو نہ ہم آنکھ سے دیکھ سکتے اور نہ اس کی حقیقت کو بزور عقل دریافت کر سکتے ہیں۔ بس خداشناسی کے بارے میں انسان کی پرواز یہیں تک ہے اس سے زیادہ نہ اس نے جانا اور نہ اس کی زندگی میں اس سے زیادہ جان سکتا ہے اور اس سے زیادہ جاننے کی کوشش کو ناسعی لاحاصل بلکہ ممنوع ہے۔ چنانچہ خدا نے قرآن

میں صاف صاف فرما دیا ہے۔ ولا تقف ما لیس لک بہ علم جس چیز کا علم تم کو نہیں دیا گیا یعنی جس چیز کے جاننے اور معلوم کرنے کی تم کو صلاحیت نہیں دی گئی، اس کے پیچھے نہ پڑا کرو اور سمجھ لو کہ وہ چیز تمہارے بس کی نہیں، تو اس کے پیچھے پڑنا ناحق اپنے ایمان کو ڈانواڈول کرنا ہے۔ مگر الانسان حریص لما منع انسان کا طرز مزاج ہی کچھ اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ جس بات سے منع کرو، وہ اد بدا کر اُسے کرنا چاہتا ہے۔ کچھ تو اُس کے مزاج میں خود سری ہے۔ اور وہ نہیں چاہتا کہ کسی کا محکوم ہو کر رہے۔ اور کچھ یہ بھی ہے کہ دیکھیں خلاف حکم کرنے میں ہوتا کیا ہے۔ آدم کی یہی رکان تو شیطان کو معلوم ہو گئی تھی۔ کہ اس نے آدم کو بہلا پھسلا کر گیہوں کے کھانے پر آمادہ کیا جس کی خدا نے آدمی کو سخت منا ہی کی تھی۔ آدمی کے بچوں ہی کو دیکھو کیسے چلبلے اور بے چین ہوتے ہیں۔ کتنا ہی منع کرو کسی چیز کو چھیڑے بدوں نہیں رہتے۔ وہ چیزوں کو توڑتے پھوڑتے اور اپنے تئیں نقصان پہنچا لیتے ہیں۔ مگر باز نہیں آتے۔ خدا کے ساتھ بھی انسان کا یہی معاملہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ خدا ہے، عادت کے مطابق اس سے صبر نہیں ہو سکتا اور چاہتا ہے کہ اور چیزوں کی طرح خدا کو بھی جان لوں، مگر خدا اور چیزوں کی طرح نہیں۔ لیس کمثلہ شیٔ

صادق۔ "بس اتنی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر کسی آدمی کا ذہن اس طرف منتقل نہ ہو اور وہ سرے سے خدا کو جاننے اور ماننے ہی نہیں تو اس میں حرج کی کیا بات ہے"؟

بزرگ۔ "اس شبہے کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ تم نہ پیغمبر ہو، نہ محتسب اور نہ دنیا کے ٹھیکے دار تم کو دوسرے لوگوں کے جاننے نہ جاننے، ماننے نہ ماننے سے کیا سروکار؟ وہ جانیں اور اُن کا کام جانے۔ تم اپنی کہو کہ تم جانتے اور مانتے ہو یا نہیں۔ دوسرے یہ کہنا کہ کسی آدمی کا ذہن اس طرف منتقل نہ ہو۔ وہ سرے سے خدا کو جاننے اور ماننے ہی نہیں، فرض غلط ہے۔ نہ ہوا ہے، اور نہ ہو سکتا ہے۔ کہ آدمی ہو اور خدا کو نہ جانے اور نہ مانے۔ آدمی ہونا اور خدا کو جاننا ماننا، لازم و ملزوم ہیں۔ ہاں جاننے ماننے میں فرق ہے، کوئی تو اس طرح کا جاننا ماننا جانتا مانتا ہے کہ ہر چیز میں اُس کو خدا ہی خدا دکھائی دیتا ہے ؎

ہر چہ آید در نظر غیر تو نیست یا توئی، یا خوئے تو یا بوئے تو

اور کوئی اس طرح کا جاننا ماننا جانتا مانتا ہے کہ مصیبت پڑے پر اس کو خیال آجاتا ہے۔ کوئی ہمہ وقت اُس کی یادگاری میں لگا ہے۔ کوئی اس سے کم کوئی اس سے کم، یہاں تک کہ کوئی خدا کا بندہ ایسا بھی ہوا کہ اُس نے شاید ساری عمر میں گنتی کی دفعہ اُس کو یاد کیا ہوگا۔ مگر کیا ہوگا ضرور وللہ آخرۃ اکبر درجات و اکبر تفصیلاً کے یہی تو معنی ہیں۔"

صادق: "اگر انسان خدا کے جاننے ماننے پر مجبور ہے تو دین کا اتنا سارا غل غپاڑا کیوں ہے؟"

بزرگ: "غل غپاڑا نہیں ہے، اس لئے کہ آدمی خدا کا قائل نہیں بلکہ اس لئے کہ عالم اسباب میں رہنے کی وجہ سے خدا کے مصداق کی تعیین میں غلطی کرتا ہے۔ اور اس لئے کہ خدا کی یادگاری اُس حد تک نہیں کرتا، جس حد تک اس کی یادگاری کی ضرورت ہے۔"

مذہب کی ضرورت

صادق: "ضرورت کس کو ہے یاد کرنے والے کو یا خدا کو؟"

بزرگ: "خدا کو کیوں ضرورت ہونے لگی۔ اُس کی ذات تو بے نیاز ہے۔ ضرورت ہے یاد کرنے والے کو، ضرورت دُنیا جہان کو۔"

صادق: "اسی ضرورت کو تو میں سمجھنا چاہتا ہوں۔"

بزرگ: "بات یہ ہے کہ دنیا کو ایک طرح کی مشین (کل) سمجھو اور خدا کو بلا تشبیہ اس کا انجنیئر کہ اُسی نے وہ مشین ایجاد کی، بنائی، اور وہی اُس کو چلا رہا ہے۔ موجوداتِ عالم اس مشینیا کے پُرزے اور ساز و سامان ہیں۔ دنیا کی مشین کے پرزوں میں سے آدمی بڑا ضروری اور چلتا ہوا پُرزہ ہے۔ ظاہر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل آپ سے آپ چل رہی ہے۔ اور پُرزے از خود اپنا کام دے رہے ہیں۔ اور انجنیئر کوئی چیز نہیں، اور نہ اس کو کل میں کسی طرح کا دخل ہے۔ لیکن واقع میں انجنیئر ہی سب کچھ ہے۔ اور وہ نہ ہو تو ساری کل اینڈ اور بیکار۔ مشین میں بہت سے آدمی لگے ہیں۔ مگر انجنیئر کے سوائے کسی کو اتنا سلیقہ نہیں کہ

ایک پیچ ڈھیلا پڑ جائے، تو اسے کس کر کل کو چلتا کرے۔ آدمی جس کو ہم نے دنیا کی مشین کا ضروری اور چلتا ہوا پرزہ قرار دیا ہے، ضروری اور چلتا ہوا ہونے کے علاوہ خطرناک بھی ہے کہ بگڑے تو دوسرے پرزوں کو نقصان پہنچائے۔ اور اس کو چلتا ہوا رکھنے کے لئے ایک خاص طرح کے آئل (تیل) کی ضرورت ہوتی ہے جس کے بدون وہ کام نہیں دے سکتا۔ یہ آئل ہے یادِ الٰہی بہت لوگ دھوکا کھاتے ہیں کہ وقت کا حاکم آدمیوں کو درست رکھتا ہے۔ وہ ان کو چوری نہیں کرنے دیتا۔ خوں ریزی نہیں کرنے دیتا۔ فساد نہیں کرنے دیتا۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے نہیں دیتا۔ ورنہ دنیا میں ایک کو ایک بسنے نہ دے۔ سچ ہے، حاکم وقت کو بھی امن قائم رکھنے میں بڑا دخل ہے۔ مگر حاکم وقت کہاں تک اپنا ربط ضبط بٹھا سکتا ہے؟ مثلاً یہ تمہاری دلّی دو پونے دو لاکھ کی بستی ہے۔ حاکم وقت بہت کرے گا۔ بہت کرے گا۔ فرض کرو کنسٹیبل چوکیدار افسر، ماتحت، پیادے، سوار سب مل کر پانچ ہزار آدمی پولیس میں بھرتی کرے گا۔ حالانکہ اتنوں کی بھی گنجائش نہیں۔ اوّل تو ان ہی پانچ ہزار کا بھروسا نہیں، یہ بھی تو آخر آدمی ہیں بلکہ بعض اوقات تو پولیس والوں کی ایسی شکایتیں سُنی جاتی ہیں کہ امن قائم رکھنے کے عوض یہی لوگ خرابیوں کے باعث ہوتے۔ چوریاں کراتے، مجرموں سے سازشیں رکھتے اور طرح طرح کے ظلم کرتے ہیں۔ لیکن فرض کرو کہ یہ پانچ ہزار کے پانچ ہزار بھلے آدمی اور نمک حلال بھی ہوں تو پونے دو لاکھ پر ہمہ وقت اُن کی گرفت کیا۔ زنان خانوں میں ان کی رسائی نہیں، شہر میں ہزار پیچ در پیچ گلیاں ہیں کہ دن دہاڑے لوٹ لو تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ نہ کہ اندھیری رات اور مہاوٹ بھی برس رہا ہو تو ایسے موقع پر پولیس کی کیا پیری چلے۔ پس ہو نہ ہو یہ امن جو دنیا میں قائم ہے، کسی اور حاکم کا تصرف ہے۔ اور وہ کون ہے؟ خدا جس کے ڈر سے پتا نہیں کھڑکنے پاتا۔ علاوہ بریں، حاکم ظاہر وقوع جرم کے بعد ڈٹکٹو[1] اور مجسٹریٹ جو چاہے سو بنے۔ مگر وہ پریونٹو[2] تو کسی کام کا نہیں۔ حاکم ظاہر دریا کو منتہائے دریا پر روکنا چاہتا ہے۔ اور وہ حاکم حقیقی اس کے منبع پر جہاں سے دریا نکلا ہے یعنی حاکم

[1] DETECTIVE - سراغ رساں - خفیہ پولیس۔ [2] PREVENTIVE - مانع۔

ظاہر وقوع جرم کے بعد سزا دہی مجرم سے ایسی تدبیریں عمل میں لاتا ہے کہ عبرت اور ارتکاب جُرم پر اقدام نہ کر سکیں۔ اور وہ حاکم حقیقی ارادے کو جو ارتکاب جُرم کا محرک ہے روکتا ہے۔ اور مجرم کے خیال کی اصلاح کرتا ہے۔ جُرم ایک درخت ہے۔ گندہ خبیث، جس سے آب ہوا خراب ہوتی، اور اس کے پھولوں اور پتوں میں سمیت ہے۔ حاکم ظاہر اس کی ٹہنیوں کو کاٹتا، چھانٹتا رہتا اور اس درخت خبیث کو بڑھنے نہیں دیتا۔ مگر حاکم حقیقی اس کو جڑ سے اکھاڑتا اور معدوم کرتا ہے، اور دونوں کے نتیجوں میں جو فرق ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ خوف خدا نہ ہوتا تو ہم ہی لوگوں کے ہاتھوں سے دنیا کبھی کی معدوم ہو گئی ہوتی۔ اب سمجھے کہ خدا کو جاننے ماننے کی کیا ضرورت ہے؟ خدا کے جانے مانے بدون دنیا چل ہی نہیں سکتی۔"

صادق:۔ "لیکن ہم تو کوئی از غیبی سزا مجرم کو ہوتے نہیں دیکھتے۔"

بزرگ:۔ "اسی لئے تو خدا کو جاننے ماننے کی زیادہ ضرورت ہے۔ خدا نے آدم کی نسل کو روئے زمین پر پھیلایا۔ اور آدم کی اولاد نے عقل کے زور سے جنگل اور پہاڑ اور خشکی اور تری سب پر اپنا تسلط بٹھایا۔ دوسری مخلوقات تاب مقاومت نہ لا کر ان کی زد سے بچتی سرکتی گئیں۔ بعینہٖ وہی حالت ہوئی، جو ہندوستان کے اصلی باشندوں، گونڈوں اور بھیلوں کی ہوئی کہ اُترسے اُترے آ رہے، جوں جوں یہ بڑھتے گئے، وہ بیچارے ہٹتے اور ہلتے گئے۔ آدم کی اولاد نے بعض جانوروں کو تو مسخر کر لیا۔ چاہا ان کو مارا اور کھا گئے۔ اور چاہا ان سے خدمت لی، اور جو قابو میں نہ آسکے۔ زمین پر سے بھاگ تو نہیں گئے۔ اور بھاگ کر جاتے تو کہاں جاتے مگر ہمہ وقت آدمی سے خائف، انسان کی صورت سے ترساں اور ان کا خوف و ہراس بھی بے جا نہیں۔ آدمی کا بس چلے تو ان کی نسلوں کو معدوم کر دے۔ مگر کوئی بھاگ کر، کوئی اڑ کر اور کوئی اپنے بل بوتے پر بھی آدمی کی مار سے بچے رہتے ہیں۔ آدمی کیا دوسری مخلوقات کو تباہ دیکھ سکتا۔ نہیں اس کی طبیعت ایسی حریص اور خود غرض واقع ہوئی ہے کہ وہ اپنے ابنائے جنس

کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اگر ہر ایک آدمی کرنے پائے جو اس کے دل میں آئے۔ تو یہ سب آپس میں کٹ مریں۔ پس ضرورت واقع ہوئی، کسی ضابطہ کی، جو ان کو روکے تھامے رہے۔ اور وہ ضابطہ ہے۔ حاکم وقت، جس کی سزا کے ڈر سے کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکتا۔ مگر اس کا ربط ضبط انتظام کے لئے کافی نہ تھا۔ تو خدا نے اُس کے نقصان کی تلافی یوں کی کہ ہر ایک فرد بشر کے دل میں خیال ڈال دیا کہ حاکم حقیقی خدا ہے "اور وہ بھلائی سے خوش اور برائی سے ناراض ہوتا ہے۔ اور اگرچہ وہ اس زندگی میں بھی انسان کو سزا اور جزا کے دینے پر قادر ہے مگر کسی مصلحت سے کبھی ایسا نہیں بھی ہوتا۔ تو کچھ حرج کی بات نہیں، کیوں کہ ہر ایک آدمی کو یقین ہے کہ مرے پیچھے ایک اور طرح کی زندگی شروع ہوگی۔ اور جو کچھ اس دنیا میں کیا ہے۔ بھلا یا برا اُس زندگی میں اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ ان خیرًا فخیر وان شرًا فشر۔"

عاقبت کا یقین انسان کی فطرت میں ہے

صادق"میں سمجھتا ہوں، مذہب نے عاقبت کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا کیا۔"

بزرگ۔" اُلٹی بات، مذہب نے خیال عاقبت نہیں، بلکہ خیال عاقبت نے مذہب کو پیدا کیا۔ اگر خیال عاقبت نہ ہو تو مذہب کی ضرورت ہی نہیں۔ ایسے لوگ بھی ہو گزرے ہیں اور شاید اب بھی ہوں۔ جو عاقبت سے منکر ہیں۔ تو وہ سوسائٹی کے بڑے خطرناک ممبر ہیں کیوں کہ حاکم ظاہر کے رعب و داب کے سوائے ان پر کوئی روک نہیں، وہ جب موقع پائیں (اور ایسے موقع کا ملنا ہی کیا مشکل ہے) جس کو چاہیں جان سے مار ڈالیں جس کا چاہیں گھر لوٹ لیں جس کو چاہیں بے عزت کر دیں، غرض جس کو چاہیں دنیا سے اجاڑ دیں۔ یہ ایسے ہی لوگوں کا مقولہ ہے۔ جو قرآن میں نقل کیا گیا ہے۔ ان ھی الا حیوتنا الدنیا نموت ونحیٰی وما نحن بمبعوثین۔"

سوال۔" اگر ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں، اور ہیں، اور ہو سکتے ہیں تو معلوم ہوا کہ خیال عاقبت انسان کی فطرت میں داخل نہیں، فطرت میں داخل ہوتا تو کوئی فرد بشر اس سے خالی نہ ہوتا۔

بزرگ۔ "یہ شاید ان کے مُنہ کی کہن تھی ذٰلک قولھم بافواھھم اور ضد میں آکر انسان ایسی بہتری باتیں بک سکتا ہے۔ مگر موٹی سی موٹی سمجھ کا آدمی بھی تو عاقبت اور نہ صرف عاقبت بلکہ عاقبت کی سزا وجزا کا یقین رکھتا ہے۔ رہی یہ بات کہ کیوں رکھتا ہے اس کا وہی جواب ہے کہ انسان کے دل کی بناوٹ ہی اس طرح کی واقع ہوئی ہے۔"

صادق۔ "پھر دُنیا میں جرائم کا انسداد کُلی کیوں نہیں ہو گیا؟"

بزرگ۔ "اس واسطے کہ جس طرح انسانوں کی شکلیں مختلف ہیں کہ ایک فٹ مربع سے کم ہی کم کی کیا تو بساط اور کروڑوں آدمی روئے زمین پر اب موجود ہیں، اور خدا جانے کتنے سنکھ مہا سنکھ مر کھپ گئے، اور کروڑوں پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں، اور معلوم نہیں کب تک پیدا ہوتے چلے جائیں گے ہم نے تو دیکھا کیسا سُنا بھی نہیں کہ دو آدمی ایک ماں باپ کی اولاد بلکہ توام بھی صورت شکل میں مشابہ بہ یکدگر ہوئے ہوں کہ پہچان نہ پڑتے ہوں تو جس طرح آدمیوں کی شکلیں مختلف ہیں اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ ان کی طبیعتیں بھی مختلف واقع ہوئی ہیں کہ ایک کا مزاج دوسرے کے مزاج سے بالکل نہیں ملتا۔ اکثر تو ایسے ہیں کہ عاقبت کے خیال سے ارتکاب جُرم پر اقدام نہیں کر سکتے۔ بعض دل کے ایسے بودے اور کمزور ہیں کہ وقتی ترغیبات سے مغلوب ہو کر جُرم کو کر بیٹھتے ہیں مگر پھر اُن کو پشیمانی اور ندامت ہوتی ہے اور گناہ کا کفارہ دینے کے درپے ہوتے ہیں مظلوم کو رضامند کرنے سے، اقرارِ جرم سے، اور اپنے اوپر اس کی سزا عائد کرانے سے جب تک گناہ کا کفارہ نہ دے لیں اُن کو نفس لوامہ چین سے رہنے نہیں دیتا یہی خیال عاقبت ہے جس کو میں نے نفس لوامہ سے تعبیر کیا۔ پھر بعض دل کے ایسے سخت ہوتے ہیں کہ زندگی بھر کفارے کو ٹالتے رہتے ہیں۔ ملک الموت نے آکر ٹینٹوا دبایا تو سارا زہر اُگلنا پڑا۔ وہ کیا چیز ہے جو ایسے وقت میں ان کو اقرارِ جُرم پر مجبور کرتی ہے؟ وہی نفس لوامہ، وہی خیالِ عاقبت، وہی کانشنس جو چاہو کہہ لو۔ اس بات پر تو تمام آدمیوں کا اجماع سمجھو کہ اس ہستی کے بعد آدمی کو ایک اور ہستی ہونی ہے۔ اختلاف اگر ہے تو اس میں ہے کہ وہ ہستی کیسی ہوگی؟

کیوں کر ہو گی؟ سو یہ اختلاف فروعی ہے۔ انتظامِ دنیا کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے اس قدر ہے کہ اس ہستی کے بعد ایک اور ہستی ہے اور ہستی اس ہستی کی متمم ہے اور اس ہستی کا بننا بگڑنا موقوف ہے، ہمارے کردار پر جو ہم اس ہستی میں کریں۔"

صادق۔" تو یوں کہیے کہ آپ کے نزدیک سرے سے دین و مذہب ہی داخلِ فطرتِ انسانی ہے یعنی ہر شخص کی فطرت چاہتی ہے کہ وہ مذہب رکھتا ہو۔"

بزرگ۔" بیشک تم نے بہت ٹھیک سمجھا۔ دین اور فطرت ایک ہی چیز ہے اور میں کیا کہوں گا، اور کوئی کیا کہے گا، اور تم نے کیا سمجھا اور کوئی کیا سمجھے گا، خود خدائے تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیمہ ولکن اکثر الناس لا یعلمون (اللہ کی بناوٹ جس طرح پر لوگوں کو بنا دیا اللہ کی پیدائش کو کون بدلے یہی ہے سیدھا دین لیکن افسوس ہے کہ اکثر لوگوں کو خبر نہیں) اس آیت کے لفظوں پر نظر کرو اس سے زیادہ صراحت کیا ہو گی؟ میرا بس چلے تو اس آیت کو تختیوں پر کندہ کرا کر رکھوں مسلمان کا کوئی بچہ نہ ہو جس کے گلے میں تعویذ کی جگہ یہ تختی نہ پڑی ہو۔ اور خیر ہر مسلمان کے گلے میں نہ سہی، ہر ایک مسلمان کے دروازے دروازے ورنہ ہر ایک مسجد پر تو ضرور، بھلا کسی کی عقل جائز رکھ سکتی ہے کہ مثلاً پانی کی فطرت تو اس طرح پر واقع ہو کہ نشیب کی طرف بہے اور اس کو حکم دیا جائے الٹا بلندی کی طرف بڑھنے کا۔ پانی بلندی کی طرف چڑھتا ہے یا چڑھ سکتا ہے؟ یہی حال دین کا ہے۔ دین کی کوئی چھوٹی سی بات بھی فطرتِ انسانی کے خلاف نہ ہے اور نہ ہو سکتی۔ ان اللہ لیس بظلام للعبید اور یہی فطرت دین کے کھوٹے کھرے غلط صحیح کے شناخت کی کسوٹی ہے۔"

صادق۔" تو چاہیئے کہ لوگ دین میں اختلاف نہ کریں۔"

بزرگ۔" بیشک چاہیے تو یہی کیونکہ فطرت کے اعتبار سے آدمی آدمی سب یکساں، مگر نری فطرت ہی فطرت ہوتی تو کچھ جھگڑا نہ تھا مصیبت یہ ہے کہ انسان ایک طرف مغلوب ہے فطرت کا اور دوسری طرف مغلوب ہے گوناگوں خواہشوں کا مغلوب ہے تعلیم و تربیت کا مغلوب ہے

رسم و عادات کا، چوبائی ہوا چل رہی ہے۔ ہر طرف سے تھپیڑے لگ رہے ہیں، کنکوا سیدھا اڑے کیا خاک ؎

در میانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ   باز مے گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش"۔

صادق: "یہ تو ظلم صریح ہے"۔

بزرگ: "توبہ کرو توبہ، خدا اور ظلم!!! استغفر اللہ تعالیٰ اللہ عما یقولون علواً کبیرا۔ آدمی کے پیچھے بھوک پیاس کا لگا دینا ظلم ہوتا اگر اس کو کھانا اور پانی بہم پہنچانے کی عقل نہ دی گئی ہوتی۔ آدمی کو اس طرح کا مخلوق بنانا کہ ایک منٹ سانس لینے کو ہوا نہ ملے تو ہلاک ہو جائے ظلم تھا اگر ہوا کا ذخیرہ اُس کے لئے مہیا نہ کیا ہوتا۔ آدمی کو گرمی سردی کا احساس بخشنا ظلم تھا اگر وہ اس سے بچنے کی تدبیر نہ کر سکتا، اسی طرح اس کو فطرت اور نفسانی خواہشوں اور تعلیم و تربیت اور سوسائٹی اور رسم و عادت وغیرہ وغیرہ کا مغلوب بنایا، ظلم ہوتا اگر اس بھول بھلیاں میں سے نکلنے کا اس کو رستہ نہ دکھایا جاتا"۔

صادق: "وہی رستہ تو میں ڈھونڈتا ہوں اور نہیں ملتا"۔

بزرگ: "ڈھونڈتے ہو مگر ڈھونڈنے کے طور سے نہیں"۔

مذہب کا خلاصہ

صادق: "وہ طور کیا ہے؟"

بزرگ: "وہی طور تو میں تم کو اتنی دیر سے بتا رہا ہوں۔ دین کا حال یہ ہے کہ جتنا اس کو چھانتے جاؤ، اتنا ہی گدلا ہوتا جاتا ہے، اور زیادہ کاوش کا ضروری نتیجہ ہے لامذہبی، جس میں تم مبتلا ہو اور نہیں تو آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں، ہو گے پر ہو گے۔ اس رستہ کو چھوڑو۔ دین تو تمام آدمیوں کے لئے ایک ہی ہے اس کے لئے اتنی ساری عقل کی ضرورت نہیں جتنی تم صرف کرنی چاہتے ہو، یہ عقل تم کو ریاضی اور فلسفہ کے کام میں لانی چاہئے۔ دین تو گنتی کی چند موٹی موٹی اور سیدھی سیدھی

باتیں ہیں اور باتیں بھی ہیں تو بدیہی جن کے لئے حجت اور دلیل کی کچھ ضرورت نہیں، اور جب آدمی لگا دین میں حجت اور دلیل ڈھونڈھنے تو دین کے اعتبار سے اس کی حالت خطرناک ہو۔

صادق:۔ "عقل کے ہاتھوں سے تو مجبوری ہے"

بزرگ:۔ اگر عقل کو عقل کی حد میں رکھو اور اس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دو تو کچھ بھی مجبوری نہیں، دین میں عقل کی جولان یہیں تک ہو کہ خدا ہو اور جتنی عمدگی اور خوبی اور بڑائی کی صفتیں خیال میں آسکتی ہیں وہ سب اس میں ہیں، دُنیا کا کارخانہ اس کے ہونے اور اس طرح کے ہونے پر دلالت کرتا اور ہمارا دل از خود اس بات کو مانتا ہو اور اس میں شکوک و اشتباہات پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔ پھر انسان اس طرح کا مخلوق بے مصرف نہیں کہ اس کو دنیا سے اور دنیا کو اس سے کسی طرح کا سروکار نہ ہو، بلکہ خدا نے اس کو عقل دے کر انتظام دنیا میں بہت کچھ دخیل کر دیا ہے، خدا اور انسان اور دُنیا کی مثال زمیندار اور کارندے اور علاقہ زمینداری کی سی ہو۔ کارندہ علاقۂ زمینداری کا مالک تو نہیں مگر مالک کی رضا اور اجازت سے وہ علاقہ پر مسلط ہو چاہے آباد کرے چاہے اُجاڑے جس طرح ایک مالک چاہتا ہو کہ اس کا کارندہ بھلا مانس، خوش معاملہ، نیک نیت، دیانت دار، جفاکش ہو، اور اس کے علاقہ زمینداری کا انتظام ٹھیک رکھے۔ اسی طرح خدا بھی چاہتا ہو کہ آدمی دنیا میں جہاں تک اس سے ہو سکے امن و خوش حالی کو ترقی دے اور دنیا کی گاڑی میں جس کو ایک وقت خاص تک خدا کو چلانا منظور ہے کسی طرح پر روڑا نہ اٹکائے بس یہی دین اور یہی مذہب ہو جس کا لوگوں نے اس قدر طومار بنا کر کھڑا کیا ہے"

صادق:۔ "اتنا تو قرآن کی ایک چھوٹی سی صورت میں آسکتا تھا"

بزرگ:۔ "آسکتا کیسا آیا ہوا موجود بھی ہو۔ ورنہ من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنّۃ کے سوائے اس کے اور کیا معنی ہو سکتے ہیں کہ اصل دین خدا کا جاننا ہو اور اتنا جاننا نجات کے لئے بس کرتا ہو۔ اور قرآن کی چھوٹی سی چھوٹی صورت کی جو تم نے کہی اس سے شاید تمہارا مطلب یہ ہو کہ دین ایک چھوٹے سے جملے میں آسکتا تو اتنے بڑے قرآن کے نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

اس کو اپنے طور کی باتوں میں سمجھو کہ انلیئرس میں سطر ڈیڑھ سطر کا دعویٰ ہوتا ہے اور اس کے ثبوت ورق کے ورق۔ یا مثلاً کوئی ہم سے پوچھے کہ یہ قانون دیوانی فوجداری اور مال وغیرہ وغیرہ کیا چیز ہیں؟ تو ہم کہہ سکتے ہیں تدابیر حفظ امن۔ قرآن کا بھی یہی حال ہے کہ اس کا لب لباب لا الہ الا اللہ ہے۔ اور اس کے سوائے جو کچھ ہے وہ اسی لا الہ الا اللہ کا ثبوت ہے یا اسی قسم کی باتیں ہیں جو اسی لا الہ الا اللہ پر متفرع ہوتیں اور اسی لا الہ الا اللہ سے مستنبط کی جاتی ہیں۔ قرآن میں قصص ہیں، مواعظ ہیں، حکم ہیں، آداب ہیں، معاملات ہیں، عبادات ہیں، اوامر ہیں، نواہی ہیں، کیا چیز ہے جو قرآن میں نہیں لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو تمام افراد انسان کی معاش و معاد دونوں کی درستی کے لئے روزِ قیامت تک بس کرتی ہے بشرطیکہ اس کو ٹھیک طور پر سمجھا اور اس پر عمل کیا جائے۔"

عبادت کی لم

صادق۔" میں اس کو ذرا تفصیل کے ساتھ سمجھنا چاہتا ہوں۔"

بزرگ۔" خدا کو جاننے پہچاننے کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ بادہوائی ایک بات تھی اس کان سنی اس کان نکال دی، آدمی خدا کو جانے پہچانے گا تو وہ اس تعلق کو بھی ضرور سمجھے گا جو اُس کو خدا کے ساتھ ہے۔ اور وہ یہ بھی دیکھے گا کہ خدا نے اُس کو سراپا احتیاج پیدا کیا ہے، وہ ایک خاص طرح کی زندگی رکھتا ہے، درد اور رنج سے متاذی ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کی ضرورتیں کچھ تو خدا کی طرف سے مہیا کی گئی ہیں، جن کے لئے اُس کو کسی طرح کی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی جیسے سانس لینے کو ہوا، پینے کو پانی اور کچھ ضرورتیں ایسی ہیں کہ اُن کا سامان تو موجود ہے مگر اس کو کام میں لانے کے لئے تدبیر بھی درکار ہوتی ہے۔ سو خدا نے اُس کو اس تدبیر کا سلیقہ بھی دیا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھے گا کہ اس کو اس کثرت سے حاجتیں اور ضرورتیں لاحق ہوتی ہیں کہ اعوان و انصار کے بدون اس کا گزر نہیں، بس چار و ناچار اس کو سوسائٹی میں مل کر رہنا پڑتا ہے کہ یہ لوگوں کی اور لوگ اس کی مدد کریں۔

وہ یہ بھی دیکھے گا کہ سوسائٹی کے لوگ بھی اسی طرح کے آدمی ہیں، وہ بھی اسی کی سی حاجتیں، اسی کی سی طبیعت رکھتے ہیں، وہ بے کسی کے سکھائے آپ سے معلوم کرے گا کہ دنیا میں ہزارہا قسم کی مخلوقات ہیں منجملہ اُن کے ایک یہ بھی ہو۔ گر یہ دوسری مخلوقات سے بہت باتوں میں ممتاز ہو، اس کو ملائم سے خوشی پہنچتی ہے اور نا ملائم سے رنج، بعض مواقع پر اس کو غصہ آتا ہے اور بعض پر رحم۔ اس کی اکثر باتیں دوسرے جانوروں سے ملتی ہوئی ہیں، ان ہی کی طرح سوتا، ان ہی کی طرح جاگتا، ان ہی کی طرح اس کو بھوک پیاس لگتی۔ مگر اس کی سی عقل کسی میں نہیں۔ اس کی طبیعت میں جہاں اور باتیں ہیں ایک احسان مندی بھی ہے کہ جب اس کا کوئی مطلب اٹکے اور اس کی مدد کرے یہ اُس کا شکر گزار ہوتا ہے۔ اس صفت پر متفرع ہیں، تمام اقسام عبادات، کوئی سی بھی عبادت لو وہ ایک پیرایہ ہے اظہار احسان مندی کا، مثلاً نماز، اس کا ایک ایک رکن یعنی قیام اور رکوع اور سجود سب سے ظاہر ہوتا ہے تضرع اور ابتہال اور عجز۔ ان حرکات کے سوائے وہ جو قرأت ہی یعنی منہ سے کہنا پڑتا ہی وہ بھی خدا کی حمد و ثنا ہو، دعا ہو، استغفار ہو، اپنی عاجزی اور حاجتمندی کا اظہار ہو، عبودیت کا اقرار ہو، یوں تو بظاہر انسان کے سب کام اسی کی تدبیر سے چلتے اور بہت سی باتوں میں اس کو اپنے ابنائے جنس سے مدد ملتی ہے لیکن ذرا تامل کرو تو معلوم ہو کہ ہم سب محض خدا کے فضل کے سہارے جیتے ہیں۔ ہزارہا چیزیں ہیں جن پر انسان کی زندگی موقوف ہی اور ان میں سے ایک چیز میں بھی انسان کو دخل نہیں۔ قرآن پر نظر کرو۔ اس کا حصل یہی پاؤ گے کہ انسان کو اس کی حاجتیں اور ضرورتیں بتا کر یہ دکھایا جاتا ہی کہ اس کو خدا نے سراپا حاجت پیدا کیا ہی۔ چونکہ وہ باوجودیکہ اس کو عقل بھی دی گئی ہے اور کسی قدر اختیار بھی رکھتا ہی اپنی تمام حاجتوں کے برلانے پر خود قادر نہیں، تو جس نے اُس کو حاجت کا احساس دیا اور احساس کے ساتھ اُس کی تمام حاجتوں اور صرف یہی نہیں بلکہ آرام و آسائش کا سامان مہیا کیا وہی خدا ہی اور انسان کو اس کا بھی احسان ماننا چاہئے۔ اگرچہ سارا قرآن اسی منوال پر واقع ہوا ہے مگر میں مثال کے طور پر دو مقام کی چند آیتیں پڑھتا ہوں۔

لہ من خلق السموات والارض وانزل لکم من السماء ماء فانبتنا بہ حدائق ذات بھجۃ ما کان
لکم ان تنبتوا شجرھا ءالہ مع اللہ بل ھم قوم یعدلون ۶۱ امّن جعل الارض قرارا وجعل خلالھا
انھارا وجعل لھا رواسی وجعل بین البحرین حاجزا ءالہ مع اللہ بل اکثرھم لا یعلمون ۶۲ امّن
یجیب المضطر اذا دعاہ ویکشف السوء ویجعلکم خلفاء الارض ءالہ مع اللہ قلیلا ما تذکرون
۶۳ امّن یھدیکم فی ظلمات البر والبحر ومن یرسل الریاح بشرا بین یدی رحمتہ ءالہ مع اللہ
تعالی اللہ عما یشرکون ۶۴ امّن یبدؤا الخلق ثم یعیدہ ومن یرزقکم من السماء والارض ءالہ
مع اللہ قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صدقین دوسری جگہ فرماتے ہیں قل ۷۱ ارءیتم ان جعل علیکم اللیل
سرمدا الی یوم القیمۃ من الہ غیر اللہ یاتیکم بضیاء افلا تسمعون قل ۷۲ ارءیتم ان جعل اللہ
علیکم النھار سرمدا الی یوم القیمۃ من الہ غیر اللہ یاتیکم بلیل تسکنون فیہ افلا تبصرون و
من رحمتہ جعل لکم اللیل والنھار لتسکنوا فیہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون ۷۳ ۔ یاد رکھو
کہ یہ میں نے نمونے کے طور پر چند آیتیں پڑھ دی ہیں ورنہ سارے قرآن کی یہی ایک لے ہے ۔ غرض

۶۰ بھلا کس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسا کر ہم نے خوشنما باغیچے اگائے یہ درخت تم تو نہیں اگا سکتے کیا اس پر بھی خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے مگر یہ لوگ ہی سیدھے رستہ سے الگ ہوئے جاتے ہیں ۶۱ بھلا کس نے زمین کو ٹھیرنے کی جگہ بنایا اور اس میں دریا بہائے اور اس پر پہاڑوں کے لنگر ڈالے اور دو دریاؤں میں روک قائم کی تو کیا اس پر بھی خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے مگر ان لوگوں میں سے اکثر بے خبر ہیں ۶۲ بھلا کون ہے کہ جب کوئی بیقرار ہو کر اس کو بلائے تو وہ اس کی فریاد کو سنے اور مصیبت کو دور کر دے اور تم کو فرمانروائے روئے زمین بنائے تو کیا اس پر بھی خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے تم لوگ ایسی باتوں کو خیال کرتے ہو ۶۳ بھلا کون ہے جو خشکی اور تری کے اندھیروں میں تم کو رستہ دکھائے اور کون بارانِ رحمت سے پہلے ہوا بھیجتا ہے کہ وہ مینہ کی خوشخبری دے تو کیا اس پر بھی خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے ۔ خدا کی شان ان چیزوں سے بہت اونچی ہے جن کو اس کا شریک ٹھیراتے ہیں ۶۴ بھلا کون ہے جو پہلے پہل پیدا کر کے اس کو پھر اپنے پاس بلالے اور کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے روزی دے اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو کہ (بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵۲ پر)

سب سے پہلے انسان نے آپ کو جانا۔ اپنے آپ کو جاننے سے لازم آیا خدا کا جاننا۔ خدا کو جاننے سے لازم آیا اس کے احسانات کا ماننا یعنی اس کی عبادت کرنا۔ اس کو میں نصف دین قرار دیتا ہوں اور اس میں ہرگز کسی طرح کی پیچیدگی نہیں اور نہ اس میں کسی طرح کا شک و شبہہ ہوسکتا ہے اور ہو تو بیان کرو۔"

صادق:- "بھلا اور دین کا دوسرا نصف؟"

بزرگ:- "دوسرا نصف ہے لوگوں کے باہمی معاملات کہ ان کو ایک دوسرے کے بدون بن نہیں آتی، تو ایک قانون ہونا چاہیئے۔ جو سوسائٹی میں امن کو قائم رکھے۔ یہ ہے دوسرا نصف دین، اور اسی کا نام ہے شرع۔"

صادق:- "میں اس کا بھی ایک خلاصہ معلوم کرلینا چاہتا ہوں۔ جامع اور مانع۔"

بزرگ:- "اس کا خلاصہ ہے۔ انچہ بر خود نہ پسندی بر دیگرے مپسند۔ اس کے لئے بھی دلیل اور حجت درکار نہیں۔ آدمی کا دل ہی خدا نے اس طرح کا بنایا ہے کہ وہ فوراً اس بات کو تسلیم کرلے گا کہ اس قاعدے کے بدون دنیا میں امن قائم رہ نہیں سکتا، اور یہ بھی انصاف کی بات۔ خدا کے ہونے پر جہاں اور بے شمار دلائل ہیں اور ان میں سے ایک دلیل دنیا کا نظام بھی ہے۔ اَوَلَمۡ یَنظُرُوا فِی مَلَکُوتِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ [۱] پروردگار عالم نے دنیا کے انتظام کے لئے ایسے عمدہ اصول قرار دیئے ہیں کہ اُن سے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵۱) اپنے دعوے میں سچے ہو تو دلیل پیش کرو [۶] اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو کہ بھلا دیکھو تو اگر خدا قیامت تک ہمیشہ کے رات کو تم پر ڈھانکے رکھے تو سوائے خدا کے کوئی اور معبود ہے کہ تم کو روشنی پہنچاوے۔ کیا ایسی باتیں نہیں سنتے [۷] اے پیغمبر لوگوں سے کہو کہ اگر خدا قیامت تک ہمیشہ کے لئے تم پر دن ہی نکالے رہے تو سوائے خدا کے کوئی اور معبود ہے کہ تمہارے آرام کے لئے رات کو لائے کیا تم اس نمونۂ قدرت کو نہیں دیکھتے۔ اور یہ اسی کی مہربانی ہے کہ تمہارے لئے رات اور دن کو بنایا تاکہ رات کو آرام پاؤ اور دن کو اسی کے کرم یعنی روزی کی جستجو کرو۔ اور اس کا احسان مانو۔

[۱] کیا ان لوگوں نے آسمان و زمین کی سلطنت کے انتظام پر نظر نہیں کی۔

بہتر کسی کے خیال میں آ نہیں سکتے۔ جو کوئی ان اصول کو توڑتا ہے یہی نہیں کہ دوسرے کو نقصان پہنچاتا ہی بلکہ خود اپنے تئیں بھی۔ اس پر بھی لوگوں سے بے اعتدالیاں ہوتی ہیں اور یہ جتنے فسادات دنیا میں دیکھتے ہو انسان کی اسی کمزوری اور ناعاقبت اندیشی سے پیدا ہوتے ہیں کہ وہ انجام تو سوچتا نہیں اور خواہش نفسانی کا مغلوب ہو کر قانون الٰہی کو توڑ بیٹھتا ہی آپ بھی پریشان کرتا۔ اس قانون کے نافذ کرنے کی خدمت دو قسم کے لوگوں کے سپرد ہے۔ اول انبیاء علیہم السلام، دوسرے حکام وقت۔ ان دونوں میں انبیاء کے اختیارات زیادہ وسیع ہیں حاکم وقت صرف ظاہر پر حکمرانی کرتا ہے۔ اور پیغمبر ظاہر و باطن دونوں پر۔ حاکم وقت شاخ کو لیتا ہے اور پیغمبر جڑ کو بلکہ جڑ کی جڑ کو کیونکہ پیغمبر خدا کی معرفت سکھاتا ہی جو منبع ہے تمام نیکیوں اور محاسن اخلاق کا۔ حاکم وقت کی روک مثلاً آدمی کی زبان پر ہی کہ کسی کو گالی نہ دے۔ ہاتھ پر ہے کہ کسی کو مارے نہیں اور پیغمبر کی روک آدمی کے دل پر ہے کہ اُس میں بُرا ارادہ پیدا نہ ہو۔ شرائع ملکی اور وقتی ضرورتوں کے لحاظ سے بدلتی بھی رہتی ہیں مگر ان شرائع کی غرض و غایت نہ کبھی بدلی ہی اور نہ قیامت تک بدلے گی۔ وہ کیا ہے دنیا میں امن کا قائم رکھنا یہ جو کہا جاتا ہی کہ پیغمبروں کا دین ایک ہے اور شریعتیں مختلف اس کے یہی معنی ہیں جو میں نے بیان کئے۔

صادق:- آپ نے تو دین کا ایک ایسا انوکھا رستہ اختیار کیا ہے کہ میں اس میں کلام کرنے کی گنجائش ہی نہیں پاتا۔ اگر یہی دین ہے تو آپ کا نرالا دین ہے۔ یہ تو فرمائیے کہ دنیا میں کوئی اور بھی اس طرح کے عقیدے رکھتا ہی یا آپ پر کوئی خاص وحی نازل ہوئی ہے۔

بزرگ:- میں نے تو کوئی انوکھا رستہ اختیار نہیں کیا ہماری جمع پونجی جو کچھ سمجھو یہ تھوڑی سی عقل ہے جو خدا نے محض اپنے فضل وکرم سے عطا فرمائی ہی معلوم ہی کہ عقل جو ہم کو دی گئی ہے ادھوری ہی ناقص ہی ناتمام ہے ہزاروں باتیں ہیں جن کو انسان نہیں سمجھتا اور نہیں سمجھ سکتا مگر جتنی جس کو سمجھ دی گئی ہی اتنی ہی اس کی ذمہ داری ہی۔ لا یکلف اللّٰہ نفساً الا وسعہا سو ایک تو ہم عقل پر اس کی بساط سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے

اور بڑے شکر کی جگہ ہے کہ اس سے دل کو بڑی راحت پہنچتی اور طبیعت مطمئن رہتی ہے۔ دوسرے لوگوں کے دین مذہب سے تعلق نہیں رکھتے کہ وہ کیا سمجھتے اور کیا کرتے اس واسطے کہ ہم ان کے محتسب نہیں اور نہ ہم سے دوسروں کے مذہب کی بازپرس ہوئی ہے ہم کو اپنے ہی نفس کے احتساب سے فرصت نہیں ہم دیکھتے ہیں کہ ہم بنائے گئے آدمی اور ہم کو نیک و بد کی تمیز دی گئی اور سمجھا دیا گیا وہ رستہ جس پر ہم کو چلنا چاہیئے تھا مگر ہم نے اپنے دل کے کھوٹ اپنی طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے وہ وہ حرکتیں کیں جو ایک جانور کے لئے بھی موجب شرم ہیں۔

صادق۔ ایکی بات کا بھی کچھ ٹھکانا نہیں ابھی تھوڑی دیر ہوئی آپ انسان کو خلیفۃ اللہ، اشرف المخلوقات اور کیا اور کیا بنا رہے تھے یا اب اس کو جانوروں سے بھی گیا گزرا ہوا کہہ دیا۔

بزرگ۔ تم نے وہ قطعہ نہیں سنا ہے

آدمی زادہ طرفہ معجونے ست　　　از ملایک سرشتہ وز حیواں

گر کند میل این شود کم زین　　　در رود سوئے آں شود بہ ازاں

صادق۔" یہ دو متضاد باتیں کیسی"۔

بزرگ۔" بس یہ اللہ کی خلقت کہ آدمی کو دونوں طرح کی قابلیتیں دیں۔ اس کو فاعل مختار کیا چاہے معراج الکمال انسانیت پر ترقی کرے کہ یہی اس کا فرشتہ بننا ہے اور چاہے اسفل السافلین حیوانیت میں اوندھے منہ گر پڑے

صادق۔" انسان کو ایسی کشمکش میں ڈالنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

بزرگ۔" اب تم لگے خدائی میں دخل دینے" ع خدا کی باتیں خدا ہی جانے ہے

رموز مملکت خویش خسرواں دانند　　　گدائے گوشہ نشینے تو حافظا مخروش

یہی وہ کر باہے جو اکثروں کو بھڑکاتی اور بے چین رکھتی ہے اور جب تک یہ لت نہیں چھوٹتی کوئی آدمی دین کی طرف سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔"

صادق۔" مگر طبیعت کو کیا کیا جائے"۔

بزرگ :" یہ بالکل سچ ہے۔ ہم نے بھی اس کے ہاتھوں سے بڑی بڑی پریشانیاں اٹھائی ہیں، یہ بھی چاہا کہ اس خیال ہی کو دل میں نہ آنے دیں، وہ بھی نہ ہوسکا اور خیال آیا تو اس کے ساتھ طرح طرح خدشات۔ آخر بڑے غور کے بعد اب کہیں جا کر طبیعت ٹھکانے سے ہوئی۔

شریعت نصف دین ہے

صادق :" یہی تو میں بھی چاہتا ہوں۔"

بزرگ :" چاہتے ہو تو خدا نے چاہا ہو کر بھی رہے گا، جو ڈھونڈھتا ہے سو پاتا ہے، جو دروازہ کھٹکھٹاتا ہے وہ مکان کے اندر بھی آتا ہے۔ میرے سمجھنے میں تو اس کا رستہ یہی ہے کہ آدمی اپنی حقیقت سمجھے اور دوسروں سے سروکار نہ رکھے۔"

صادق :" یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ دوسروں سے سروکار نہ رکھے؟ دوسروں کے بدون دنیا چل بھی سکتی ہے؟"

بزرگ :" شاید یہ میرے بیان کا قصور ہے کہ تم نے میرا مطلب نہیں سمجھا۔ بیشک دنیا میں آدمی اس لئے نہیں پیدا کیا گیا کہ دوسروں سے سروکار نہ رکھے۔ دوسروں کے ساتھ سروکار رکھے بدون اس کو بن نہیں آتی بلکہ دوسروں کے ساتھ سروکار رکھنا اسی کو تو میں نے دوسرا نصف دین قرار دے رکھا ہے یعنی لوگوں کے باہمی معاملات اور ظاہر ہے کہ بے تعلقی کی صورت میں معاملات ہو ہی نہیں سکتے۔ میں نے عبادت کی علم تم کو سمجھائی تھی؟

صادق :" ہاں اور دل بھی اس کو تسلیم کرتا ہے۔ پھر؟"

بزرگ :" بات یہ ہے کہ جب ہم سراپا حاجت ہیں اور ہماری حاجتیں بعض تو ایسی ہیں جو خود خدا کی طرف سے مہیا کی گئی ہیں اور ان میں سے کسی مخلوق کو دخل نہیں جیسے ہوا اور پانی اور بعض ایسی ہیں جن میں ہماری یا ہمارے ابنائے جنس کی تدبیر کو دخل ہے تو وہ بھی حقیقت میں خدا ہی کی طرف سے ہیں، جیسے غلہ کہ آدمی اتنا تو کرتا ہے اور اتنا ہی کرتا ہے اور اتنا ہی کر سکتا ہے کہ زمین جوت کر بیج ڈال دیا۔ جب اناج تیار ہوا کاٹ کر گاہ کر گھر میں رکھ لیا۔ مگر آدمی کو جوتنے بونے کاٹنے گاہنے کا سلیقہ کس نے سکھایا؟ خدا جانے

زمین میں اناج کے پیدا کرنے کی صلاحیت کہاں سے آئی؟ خدا کے کرنے سے تو اس طور پر جتنی حاجتیں ظاہر میں ایسی دکھائی دیتی ہیں کہ اُن کو ہم اور ہمارے ابنائے جنس مہیا کرتے ہیں وہ بھی حقیقت میں خدا ہی کی طرف سے ہیں۔ پس جو کچھ ہم رکھتے ہیں، جو کچھ ہم کو ملتا ہے۔ خدا کا فضل اور اُسی کا احسان ہے۔ [1] وما بکم من نعمة فمن الله ثم اذا مسکم الضر فالیه تجئرون اور ہم اس قدر اس کے احسانات میں دبے ہوئے ہیں کہ اگر ہمہ وقت اس کی شکر گزاری میں لگے رہے ہیں تو اُس کی مہربانیوں کا ایک شمہ بھی تو ادا نہیں کر سکتے۔ شیخ سعدیؒ نے اس خیال کو کیسے عمدہ پیرائے میں ادا کیا ہے۔ "ہر نفسے کہ فرو میرود ممد حیات است و چوں برمی آید مفرح ذات پس در ہر نفس دو نعمت موجود است و بر ہر نعمت شکرے واجب" یعنی ایک ادنیٰ سی بات ہے سانس جس کی طرف کبھی ہمارا ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا لیکن ذرا رک جائے تو دیکھیے انسان کا کیا حال ہوتا ہے ضیق النفس کے بیماروں کو نہیں دیکھا گھنٹے دو گھنٹے کے دورے میں مُردے سے بدتر ہو جاتے ہیں پھانسی کیا چیز ہے؟ گلا گھونٹ کر سانس روک دیا۔ تڑپ تڑپ کر جان نکل گئی۔ اسی قسم کے اور خیال ہیں قطعہ

چار طبع مخالف و سرکش — چند روزے بوند باہم خوش
چوں یکے زیں چہار شد غالب — جان شیریں بر آید از قالب
مایۂ عیش آدمی شکم است — تا بتدریج میرود چہ غم است
گر بند و چناں کہ نکشاید — گو دل از عمر بر کند شاید
در کشاید چناں کہ نتواں بست — گو بشو از حیات دنیا دست

ایک بادشاہ کو اپنی سلطنت کا بڑا گھمنڈ تھا۔ ایک بزرگ کسی طرح پر اُس تک پہنچے اور موقع پا کر کہا کہ بھلا یہ تو فرمایئے کہ اگر خدانخواستہ آپ کا پیشاب بند ہو جائے تو آپ اس شکایت کے دور ہونے کے لئے کہاں تک خرچ کریں۔ بادشاہ نے ذرا سوچ کر کہا کہ نصف سلطنت۔ پھر اُس بزرگ نے کہا بھلا اگر خدانخواستہ جاری ہو کر بند نہ ہوا تو اُس

---

[1] اور جو نعمت تم کو حاصل ہے سب اللہ ہی کی دی ہوئی ہے۔ اور جب مصیبت پڑتی ہے تو اُسی کے آگے گڑگڑاتے ہیں

صورت میں ؟ بادشاہ نے کہا۔ دوسرا نصف سلطنت۔ بزرگ نے کہا کہ بس آپ کی سلطنت کی یہ حقیقت ہو کہ سُوت کی ایک دھار اس کی قیمت ہو۔ یہ تو اُن لوگوں کے مقولے ہیں جن کو خدا نے اپنی اور خدا کی حقیقت جاننے بوجھنے کی سمجھ دی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ انسان کے جسم میں بے شمار ہیں اور ہر مسام میں سینکڑوں طرح کے روگ پیدا ہو سکتے ہیں اور ایک روگ زندگی کے تلخ کر دینے کے لئے بس کرتا ہے اور ہم جوان تمام آفتوں سے محفوظ ہیں، تو نہ اپنی تدبیر سے؟ ہماری تدبیر ہی کیا ہے! کھالیا اور سو رہے۔ کھاتے تو کھالیا اور یہ نہ جانا کہ یہ غذا کیونکر پیدا ہوئی اور کس طرح جزو بدن بنی۔ قطعہ

ابر و باد و مہ و خورشید فلک در کارند | تا تو نانے بکف آری و بہ غفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار | شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

غرض ہزار ہا نعمتیں جن کا ہم کو شعور بھی نہیں ہوتا وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا حق شناسی اور مروت اور وفاداری اور انسانیت تو اس کی مقتضی تھی کہ ہمہ وقت اُس کی یادگاری میں لگے رہتے مگر مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ جتنا ہو سکے جتنی دیر ہو سکے عبادت کا یہ ایک پہلو ہے اس کے ذریعہ سے ہم اتنی بات ظاہر کر سکتے ہیں کہ ہم احسان فراموش نہیں الانسان عبید الاحسان لیکن ہم کو اس حد پر ٹھیرنا چاہیئے نہیں۔ دنیا کا دستور ہے کہ کوئی ہمارے ساتھ سلوک کرے تو ہم اس کے ساتھ سلوک کریں۔ ھل جزاء الاحسان الا الاحسان لیکن ہمارے اور خدا کے درمیان مشکل یہ آکر پڑی ہے کہ ہم خدا کے ساتھ کوئی احسان نہیں کر سکتے۔ اُس کو ہمارے احسان کی ضرورت نہیں۔ وہ ہے بے نیاز مستغنی لیکن ہاں ایک صورت ہے جس کو جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا کے قاعدے سے احسان کہا جا سکتا ہے، گو وہ حقیقت میں احسان نہیں ہے۔ اور ھل جزاء الاحسان الا الاحسان احسان میں آخر کے احسان سے اسی طرح کا احسان مراد ہو اب یہ تم بتاؤ کہ ہم بندے خدا کے ساتھ کیا احسان کر سکتے ہیں۔"

صادق۔ "میری سمجھ میں تو آتا نہیں۔"

بزرگ:۔ تمہاری کیا بہنوں کی سمجھ میں نہیں آتا میں اتا پتا بتاؤں تو تم پہیلی کو جلد بوجھ لو گے ایک ملکہ وکٹوریہ ہے اور ہم ہیں۔ ملکہ کے ہم پر سینکڑوں احسان ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کی عملداری میں ہم آرام سے بیٹھے ہیں۔ امن ہے، انصاف ہے، ریل ہے، تار ہے شفاخانے ہیں، مدرسے ہیں، نہریں ہیں، منی آرڈر ہیں، ویلوپے ایبل ہیں، کلبیں ہیں، دخانی جہاز ہیں، تجارت ہے۔ غرض وکٹوریہ کا عہد ہے اور ہمارے لئے ہندوستان جنت ہے۔ اب فرماؤ کہ ملکہ کے ان تمام احسانات کا بدلہ دینا یا نہ دینا؟ دینا اور ضرور دینا۔ مگر ہم اس کو کیا بدلہ دے سکتے ہیں یہی کہ ہم اس کے اطاعت گزار اور وفادار خیر خواہ احسان مند رعایا ہو کر رہیں اسی طرح کا برتاؤ ہمارا خدا کے ساتھ ہونا چاہئے کہ وکٹوریہ کے دل میں نیکی کا ڈالنا، اس کو انتظام کا سلیقہ سکھانا، اس کو رعیت پروری اور انصاف کی توفیق دینا، اس کو مملکت ہند پر مسلط کرنا یہ سب اسی کے احسانات ہیں۔ ورنہ بے خدا کی امداد کے ملکہ بیچاری کیا کرتی اور کوئی کیا کر سکتا ہے، یہ اسی کے تصرفات قدرت ہیں کہ کروڑوں دلوں کو ایک عورت ذات کے ہاتھ میں مسخر کر رکھا ہے کہ آپ ہزاروں کوس دور بیٹھی ہے اور یہاں پتہ تک نہیں کھڑکنے پاتا جس طرح ملکہ کی وفاداری کی شرط یہ ہے کہ ہم اس کے انتظام میں رخنہ انداز نہ ہوں اسی طرح ہمارے بندہ ہونے کی شرط یہ ہے کہ ہم خدا کے انتظام میں فتور نہ ڈالیں اور جہاں تک ہم سے ہو سکے اور ہم ہیں ہی کس قابل۔ مگر خیر جہاں تک ہو سکے اس کے انتظام کو رونق دیں، اس میں سہولت اور عمدگی پیدا کریں بس یہ ہے ساری شریعت کا خلاصہ شریعت کے جتنے احکام ہیں وقت کے لحاظ سے ملک کے لحاظ سے، لوگوں کی ضرورتوں ان کی طبائع اور رسم و عادات کے لحاظ سے، لوگوں کے باہمی معاملات درست رکھنے اور انتظام دنیا کو آسانی کے ساتھ چلنے دینے کی غرض سے بنائے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض کی مصلحتوں کو ہم سمجھتے اور بعض کی نہیں۔ اور یہ دنیا کے قوانین کیا ہیں یہ بھی ایک طرح کی شریعت ہے اور اس شریعت کی غرض بھی وہی ہے دنیا میں امن و عافیت کا قائم رکھنا یہی خیال ہے جس کو لوگوں نے الخلق عیال اللہ کے پیرایہ میں ظاہر کیا ہے یعنی ہندا تو جورو بچے نہیں رکھتا اور اس کی شان اس سے ارفع و اعلیٰ ہے

مگر ہم جو اس کا برتاؤ خلقت کے ساتھ دیکھتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مخلوقات کی ایسی پرداخت منظور ہے جیسی ہم میں سے کسی کو اپنے عیال کی ہوتی ہے تو ہم کو چاہیئے کہ خلق اللہ کو عیال اللہ سمجھ کر ان کا پاس کریں۔ اور دنیا میں جو مصیبت ہے ضرور اس میں کوئی مصلحت مضمر ہوگی اور عجب نہیں کہ اُس مصلحت میں یہ بھی ہو کہ ہم کو اظہار شکر کا موقع دیا جائے اور وہ نہیں ہے مگر ابنائے جنس کی مصیبت میں کام آنا اُن کی حالت کے بہتر کرنے میں کوشش کرنا۔ یہ متعارف عبادتیں جو وضع ہوئی ہیں ان کی غرض یہ ہے کہ ہم خدا کے خیال کو تازہ رکھیں مگر صرف خیال کو تازہ رکھنا کوئی چیز نہیں اس کا نتیجہ ہونا چاہیئے۔ عیال اللہ کو نفع پہنچانا۔ لوگ زینے کی پہلی سیڑھی پر اگر ٹھٹک جاتے ہیں آگے کو قدم نہیں بڑھاتے اور یہ نہیں سمجھتے کہ زینہ ٹھیرنے کی جگہ نہیں تو وہ جو میں نے کہا تھا کہ دین دار بننے کا رستہ یہ ہے کہ آدمی اپنی حقیقت کو سمجھے اور دوسروں سے سروکار نہ رکھے اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ آدمی دنیا سے بے تعلق ہو رہے بلکہ غرض یہ تھی کہ دوسروں کے دین و مذہب کے پیچھے نہ پڑے۔

عاقبت

صادق۔" اوہو۔ اس پر تو ایک بڑا سخت اعتراض وارد ہوتا ہے کہ دین کی ساری عمارت دھڑام سے گر پڑتی ہے۔ لیکن اس اعتراض کے بیان کرنے سے پہلے میں ایک اور خدشہ آپ سے رفع کرانا چاہتا ہوں کہ دنیا میں جو آدمی سے گناہ سرزد ہوتے ہیں میں مانتا ہوں کہ خود آدمی کا نفس اُن کے لئے اُس کو ملامت کرتا ہے اور جب تک وہ اس گنہ کی سزا نہ بھگت لے اس کو تسکین نہیں ہوتی۔ اور اُسی سے اس کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مرے پیچھے بھی اُس کو ایک طرح کی ہستی ہوگی اور اُس ہستی میں اُس کو اپنے کئے کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ یہ ہستی عارضی محدود چندروزہ، اور وہ ہستی ابدی، دائمی مستمر۔ سزا ہمیشہ سبب جرم تو نہ ہوئی۔ غرض وعید خالدین فیہا کے بارے میں میں بیان شافی چاہتا ہوں۔"

"بیان شافی تو یہی ہے کہ اس طرح کے خدشات کو ذہن میں نہ آنے دو اُس ہستی یعنی

عاقبت کے بارے میں ہماری ذاتی معلومات تو کچھ بھی نہیں اور کچھ ہو بھی نہیں سکتی۔ اس پر بھی دل بول رہا ہے کہ کیسی ہی ہو اور کسی طرح کی ہو مگر ہے ضرور۔ ہاں خدا نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ سے اُس ہستی کے بعض حالات جن کا ظاہر کرنا اُس نے مناسب سمجھا بیان فرمائے ہیں۔ اُن کو یقین کر لینے کے سوائے چارہ نہیں اُن حالات کی زیادہ تفتیش کرنا ہماری عقل کی رسائی سے باہر ہے اور ہمارے حق میں کچھ بھی مفید نہیں۔ ہمارے لئے اتنا بس کرتا ہے کہ عاقبت اور آخرت ہے، اور دار الجزا ہے، اور اس کو بے کسی کے بتائے سمجھائے ہم باور کرتے ہیں اور خلود اور ہمیشگی کی نسبت جو ہم کو خدشہ واقع ہوا وہ تو کچھ بات نہیں ہم دنیا میں بھی دیکھتے ہیں کہ آدمی ایک غلطی کرتا ہے اور وہ غلطی شاید اُس نے چند منٹ میں کی ہوگی مگر اُس کا خمیازہ اس کو عمر بھر بلکہ شاید اُس کی نسلوں کو بھی بھگتنا پڑتا ہے مثلاً ایک آدمی نے سنکھیا کھالی اگر وہ مرا نہیں تو جب تک جئے گا اپنے کئے کو روئے گا اور عجب نہیں سنکھیا کا اثر اس کی نسلوں میں بھی جاری اور ساری رہے۔ دنیاوی سزاؤں میں پھانسی یا دائم الحبس یا کسی مدت کی قید، یہ کیا ہے۔ اگر یہ قرینِ انصاف ہے تو خالدین فیہا کیوں قرینِ انصاف نہ ہو؟ اُس وقت پر نظر کرتے ہو جو ارتکاب جرم میں صرف ہو، نہ نفس جرم کی بدی اور اُس کے نتائج پر۔ اور وقت کی کہو تو چوری میں زیادہ دیر لگتی ہے اور آدمی کو چٹکی بجانے میں مار دیا جا سکتا ہے، تو کیا آدمی کا ہلاک کرنا چوری سے بھی گیا گزرا ہوا؟ قرار داد سزا کے لئے جرموں کا صحیح اندازہ کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ خدا جانے کتنی مصلحتوں پر نظر رکھنی ہوتی ہے جن کو مقنن ہی خوب سمجھتا ہے۔ حضرت نوحؑ جب اپنی قوم کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے تو انہوں نے یہ دعا کی رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ دَیَّارًا اِنَّکَ اِنْ تَذَرْھُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَکَ وَلَا یَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا[۱]۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اُن کی امت کا مرض علاج پذیر نہ تھا اور وہ تھے طبیب حاذق سمجھ چکے تھے کہ یہ تو کیا اچھے ہونگے ان کی جو نسلیں چلیں گی وہ بھی ان ہی کی طرح روگی ہونگی اور روگ بھی متعدی۔ اس سے بہتر ہے کہ صنف ہی معدوم کر دی جائے

---

[۱] اے میرے پروردگار (ان) کافروں میں (کسی متنفس کو بھی زندہ) نہ چھوڑ (کہ) روئے زمین پر رستا بستا (نظر آئے) کیوں کہ اگر تو ان کو رہنے دے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ ہی کریں گے اور ان سے جو نسل چلے گی وہ بھی بدکار (اور کٹے) کافر ہی ہوں گے۔

اور یہ جو دنیا میں شرافت نسب کی قدر کی جاتی ہے اور کہتے ہیں "اصل بد از خطا خطا نکند" آخر اس کی بھی کچھ نہ کچھ تو اصلیت ہی ہے۔ حیوانات اور نباتات تک میں اس قاعدے کا عمل درآمد دیکھا جاتا ہے تو آدمی میں کیوں نہ ہو۔ اگرچہ میں نے تم کو سمجھانے کے طور پر اتنا کہا مگر پھر میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ طبیعت کی یہ افتاد اچھی نہیں۔ اس خبط کو سر سے نکالو کہ یہی گمراہی کی جڑ ہے۔

مذہبی مباحثہ بڑی بری بات ہے

اچھا وہ اعتراض تو فرمائیے جس کی نسبت آپ کہتے تھے کہ دین کی ساری عمارت دھڑام سے گر پڑتی ہے۔

صادق: "ہاں آپ نے کہا تھا نہ کہ آدمی کو چاہیے دوسرے کے دین و مذہب سے سروکار نہ رکھے اوّل تو یہ ہو ہی کیسے سکتا ہے۔ آدمی، آدمی سے ملیگا۔ ایک جگہ رہے سہے گا تو کیوں کر ممکن ہے کہ ایک کے خیالات ایک پر ظاہر نہ ہوں۔ اور یہی تو دنیا میں آگہی پیدا کرنے کا بڑا ذریعہ ہے۔ اور اگر آدمی دوسروں کے خیالات سے استفادہ نہ کرے تو وہ کسی بات میں بھی ترقی نہیں کر سکتا۔ اور جو شخص اپنی منفرد رائے پر اعتماد کرتا اور دوسروں کی بات کو سننا نہیں چاہتا میں نہیں سمجھتا کہ وہ غلطیوں سے محفوظ رہ سکتا ہے"۔

بزرگ۔ "تمہارا یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے بیشک لوگوں میں جس طرح ضرورتوں کا مبادلہ ہوتا ہے خیالات کا بھی ہوتا ہے اور اغراض تمدن میں سے یہ غرض سب سے عمدہ اور سب سے ضروری ہے مگر تم نے اس خیال کو کسی قدر زیادہ وسیع کر دیا ہے۔ بہت سی معلومات اس قسم کی ہے کہ ہم کو اُس کے بارے میں لوگوں سے پوچھنے گچھنے اور اُن کی رائے دریافت کرنے کی کچھ ضرورت نہیں مثلاً روز روشن میں آفتاب چمک رہا ہے یا نہیں۔ ہم کو بھوک لگی ہے ہم کو کسی سے صلاح لینے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ بھوک ہے یا نہیں اور ہے تو اس خواہش کے پورا کرنے کی کیا تدبیر ہے دو اور دو کے چار ہونے میں ہم کو کچھ۔ رد نہیں ہوتا۔ دین و مذہب بھی میرے نزدیک اسی قسم کی ایک بات ہے جس طرح پیٹ میں بھوک کا تقاضا پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح دل میں دین و مذہب کا۔ اور جس طرح وہ شخص جس کو بھوک لگی ہے جانتا ہے کہ یہ خواہش کیوں کر پوری ہو گی۔ اسی طرح وہ شخص جس کے دل میں دین و مذہب کا تقاضا ہے، یعنی ہر فرد بشر بخوبی جانتا ہے کہ اس تقاضے کی تسکین کی

کیا تدبیر ہے۔"

صادق:"تو خدا کی طرف سے پیغمبروں کا آنا، کتابوں کا نازل ہونا سب بے کار۔"

بزرگ"۔بے کار کیوں؟ اسی بھوک کی خواہش کو لو۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ آدمی کو بھوک لگی اور بھوک کا احساس ہوتے ہی اُس کا پیٹ بھر گیا؟ نہیں اُس کو درکار ہوگی غذا۔ اور معمولی غذا کا حال یہ ہے کہ کسی شخص نے حساب کر کے ثابت کیا تھا کہ تین سو آدمی کا ہاتھ لگتا ہے۔ تب ایک دانہ میسر آتا ہے۔ خیر تین سو میں کسی قدر مبالغہ ہو تاہم قدرتی اسباب کے علاوہ کاشتکار، بڑھئی، لوہار، چمار، مزدور نلانے والے، کاٹنے والے، گاہنے والے اور آخر کو پیسنے والی، پکانے والی اتنے آدمیوں کے بدون تو غذا مہیا ہو نہیں سکتی۔ جب ایک غذا کے لئے اتنوں کی ضرورت ہو تو دین و مذہب کے لئے کتابوں اور پیغمبروں کی ضرورت کیوں نہ ہو؟ بھوک سے مضطر ہو کر انسان کھا لے سکتا ہے وہ چیز بھی جو اُس کو نقصان کرے۔ تو اس کے لئے چاہیئے طبیب۔ اسی طرح کا طبیب ہے پیغمبر۔ کیوں ہے یا نہیں؟"

صادق۔"تو پیغمبر لوگوں کے دین و مذہب سے سروکار رکھے بدون تبلیغ رسالت کیسے کر سکتا ہے۔"

بزرگ:"کیا خوب! قیاس مع الفارق ہے۔ نے تم کو منع کیا ہے کہ لوگوں کے دین و مذہب سے سروکار نہ رکھو۔ پیغمبروں کا یہاں کیا مذکور ہے وہ تو لوگوں کے دین اصلاح کرنے کے لئے آئے تھے۔"

صادق"۔ اپنے قرآن میں وہ جو ایک آیت ہے۔ ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر واولٰئک ھم المفلحون[1] یہ کون لوگ ہیں؟"

بزرگ"۔ یہ یہی ہمارے مولوی اور واعظ سو اُن کو بھی اپنے گروہ کے دین و مذہب سے ناصحانہ مشفقانہ اور معلمانہ سروکار رکھنے کا حکم ہے نہ مخالفانہ، معارضانہ، مخاصمانہ۔"

صادق۔"نصیحت بے مخالفت کے ہو ہی نہیں سکتی۔"

---

[1] اور تم میں ایک ایسا گروہ بھی ہونا چاہیئے جو (لوگوں) کو نیک کاموں کی طرف بلائیں اور اچھے کام (کرنے) کو کہیں اور برے کاموں سے منع کریں اور (آخرت میں) ایسے ہی لوگ اپنی مراد کو پہنچیں گے۔

بزرگ: "مخالفت نہیں، اختلاف کہو اختلاف۔ اور اگر ایسا ہو کہ نصیحت بے مخالفت کے نہ ہو سکتی ہو تو میں ایسی نصیحت کو روا نہیں رکھتا اس واسطے کہ مخالفت سے تفرقہ پیدا ہوتا ہی جس کی ممانعت منصوص ہے۔ ولا تفرقوا افسوس ہے کہ ہم تم ایسے امر میں بحث کر رہے ہیں جو نہ تم کو درکار ہے اور نہ مجھ کو تم مولوی نہیں واعظ نہیں میں بھی نہیں۔ اور غالباً مولوی یا واعظ بننے کا تمہارا ارادہ بھی نہیں میرا بھی نہیں تو جو مولوی اور واعظ ہوں اُن ہی کو بینہم و بین اللہ اس کا فیصلہ کرنے دو کہ ان کو کیا کرنا چاہیئے اور کیا کر رہے ہیں۔"

صادق: "بے شک میں مولوی نہیں اور واعظ نہیں اور مولوی اور واعظ بننا بھی نہیں چاہتا۔ مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آدمی دوسرے کے دین و مذہب سے سروکار کیوں نہ رکھے۔ جب تمدن کی غرض و غایت یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو فائدہ پہنچائیں تو اس سے بڑھ کر اور کون سا فائدہ ہو سکتا ہے کہ لوگوں کی دینی غلطیوں کی اصلاح کی جائے۔"

بزرگ: "اول تو کسی شخص کو اس کی دینی غلطیوں کی اصلاح کے لئے دوسرے کی مدد کی ضرورت نہیں اس کو خدا نے عقل دی ہے، سمجھ دی ہے، وہ آپ ہی غلطی کرتا اور آپ ہی اُس کی اصلاح پر قادر ہے۔ دوسرے نفوس انسانی کچھ اس طرح کے واقع ہوئے ہیں کہ دینیات میں افہام و تفہیم سے کاربراری نہیں ہوتی۔ اور اگر افہام و تفہیم سے کاربراری ہونے والی ہوتی تو کبھی کا ساری دنیا کا ایک مذہب ہو گیا ہوتا کیونکہ کسی وقت کسی مذہب میں سمجھانے والوں کا توڑا نہیں رہا۔ بلکہ سچ پوچھو تو اتنے سمجھنے والے نہیں جتنے کہ سمجھانے والے ہیں۔ اس پر بھی ہم نے تو کسی فرقے کو مباحثے اور مناظرے میں مغلوب ہو کر دنیا کے پردے سے معدوم ہوتے سُنا نہیں۔ ہاں ایسا تو ہوا بھی کہ ایک عقیدے کے معدودے چند آدمی ہوئے اور اتفاق سے اُن کی نسلیں آگے کو چلتا بند ہو گئیں۔ اب اختلاف مذہب کا یہ حال ہے کہ شاید ہی کوئی برس جاتا ہو گا کہ کوئی نہ کوئی نیا فرقہ پیدا ہوتا ہو۔ اور یہ تو میں نے بڑے بڑے نامی اور مشہور فرقوں کے اعتبار سے کہا ورنہ میرا خیال تو یہ ہے کہ کسی ایک آدمی کا عقیدہ تمام و کمال دوسرے آدمی کے عقیدے سے نہیں ملتا۔

ایک شخص نماز کا بڑا اہتمام رکھتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ نماز تو آئے دن پانچ وقت سر پر کھڑی ہے۔ روزے بیچارے کب کب آتے ہیں۔ برس میں ایک بار کچھ بھی یہ ناغہ نہ ہوں ایک حقوق اللہ کا پاس کرتا ہے دوسرا معتقد ہے کہ حقوق اللہ اگر ضائع ہو تو وہ غفور رحیم ہے بخش بھی دے گا حقوق العباد کی بڑی ٹیڑھی کھیر ہے، خدا کسی بندے کا حق تلف نہ کرائے کہ اس کی کچھ تلافی ہی نہیں۔"

صادق۔ "مگر اس کا سبب کیا ہے؟"

بزرگ۔ "جواب اس کا سبب ہے انسان کی خلقت جس طرح ایک کا چہرہ دوسرے کے چہرے سے نہیں ملتا اسی طرح ایک کے خیالات دوسرے کے خیالات سے نہیں ملتے۔ بات یہ ہے کہ انسان اس طرح کا حقوف ضعیف ہے کہ متاثر ہوتا ہے تعلیم سے، تربیت سے صحبت سے، سوسائٹی سے رسم و رواج سے، آب و ہوا سے، مزاج شخص سے، اپنی خواہشوں سے، اپنی ضرورتوں سے، اور کوئی جان نہیں سکتا کہ یہ سب باتیں جمع ہو کر کیا نتیجہ پیدا کریں گی۔ اب لوگوں کے اختلافِ مذہب کی وجہ سمجھے؟"

صادق۔ "سمجھا تو سہی مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختلاف کبھی رفع ہونے والا نہیں۔"

بزرگ۔ "بے شک نہ رفع ہوا ہے۔ اور نہ رفع ہوگا۔ ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربک ولذالک خلقھم[1]۔

صادق۔ "تو پھر پھر کر وہی بات آگئی کہ کتابوں کا نازل کرنا پیغمبروں کا بھیجنا فضول ہے۔"

بزرگ۔ "نہیں فضول ہرگز نہیں، دنیا کے قوانین بھی انسداد جرائم کی غرض سے بنائے جاتے ہیں اور پھر بھی کلی انسداد نہیں ہوتا اگر دنیا کے قوانین فضول ہوں۔ اگر دنیا کے قوانین سے کچھ فائدہ نہ ہوتا ہو تو دین کے قوانین یعنی مذہب بھی فضول اور اس کو بھی بے سود محض خیال کیا جائے مگر دنیا میں جتنا کچھ امن ہے جتنی کچھ خیر ہے سب مذہب کے طفیل سے تو مذہب فضول کیوں ہونے لگا؟ اور پھر یہ بحث لئے جاتی ہے جبر و قدر کی طرف جس میں غور و غوض کرنے کی ممانعت ہے اور ممانعت کے علاوہ انسان کی فہم سے بالاتر ہے، اور اس کے حق میں مفید بھی نہیں۔

---

[1] لیکن لوگ ہمیشہ (آپس میں) اختلاف کرتے رہیں گے مگر جن پر تمہارا پروردگار فضل کرے اور اسی لئے تو ان کو پیدا کیا ہے

صادق "۔ افسوس ہے کہ لفظوں کو بدل سدل کر اسی مضمون کو پھر دوہرانا پڑتا ہے۔ مذہب بکار آمد ہے تو اس کی اشاعت کیوں بکار آمد نہ ہو؟ اور اشاعت بے افہام و تفہیم کے ہو نہیں سکتی اور اسی کے آپ مخالف ہیں "۔

بزرگ "۔ میرے نزدیک دین کی جس قدر اشاعت کو خدا نے انسان کے حق میں مصلحت سمجھا وہ ہو چکی اور یہی نکتہ ہے ختم رسالت میں یعنی خدا نے ہمارے پیغمبر صاحب علیہ افضل الصلوٰۃ کو خاتم النبیین بنایا اور فرما دیا کہ اب ہماری طرف سے وحی کا بھیجا جانا ہمیشہ ہمیشہ کو بند۔ اس کے یہی معنی ہیں کہ دین و مذہب کے متعلق جو کچھ خدا کو سمجھانا منظور تھا سمجھا چکا اور انسان کی ہدایت کے لئے اس کو کافی اور وافی سمجھا۔ اب دین کا جتنا عمل دنیا میں رچ چکا ہے وہ قیامت تک فرو ہونے والا نہیں "۔

صادق "۔ فرو ہونے والا تو اسی سے نہیں کہ لوگ چرچا کرتے رہیں سو آپ تو چرچے کو منع کرتے ہیں "۔

بزرگ "۔ کچھ قانون کے منع کرنے سے لوگ جرموں سے باز آ گئے ہونگے کہ میرے منع کرنے سے دین و مذہب کا چرچا چھوڑ دیں گے اگر یہ تو سمجھو کہ زمانہ کا رنگ دیکھ کر مصلحت وقت کیا ہے چرچا کرنے سے اصل غرض فوت ہوتی ہے یوں تو ساری دنیا ہی عجائبات کا ایک طلسم ہے۔ انسان خود عجیب طرح کا مخلوق ہے۔ اور اس سے زیادہ عجیب ہے اس کا مذہب، مذہب نام ہے من سمجھوتے کا کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ جس کا عقیدہ ہے۔ وہ اس کو اور اُسی کو اور صرف اسی کو نجات کا رستہ سمجھتا ہے اور اپنی جگہ خوش ہے۔ سب کے من یعنی دل، یکساں نہیں سب کے مزاج یکساں نہیں سب کی عقل یکساں نہیں سب کی تعلیم و تربیت یکساں نہیں سب کی سوسائٹی یکساں نہیں سب کی خواہشیں یکساں نہیں۔ سب کی ضرورتیں یکساں نہیں۔ کہ یہی سب چیزیں انسان کی رائے پر اثر کرتی ہیں تو سب کی من سمجھوتی بھی یکساں نہیں ہونی چاہیے۔ اور واقع میں ہے بھی نہیں اور ہو سکتی بھی نہیں کیوں کہ مذہب ٹھیرا ایمان بالغیب کہ خدا کو کسی نے دیکھا نہیں بھالا نہیں۔ ایسا تو خدا ہی جس کو ماننا پڑتا ہے۔ یہ ہے مذہب کا اصل الاصول اس کے بعد کچھ اصطلاح دنیا ہے اور زیادہ تر

---

۱ جو (دین) جس (فرقے) کے پاس ہے (وہ) اسی سے خوش ہے

اصلاحِ آخرت جس کے مقابلے میں دنیا کی کچھ بھی حقیقت نہیں، کجا حیاتِ ابدی اور کجا ساٹھ ستر برس اور اس کا بھی بھروسہ نہیں۔ انسان کی معلومات کا حال یہ کہ کوئی نہیں جانتا اور کوئی جان نہیں سکتا کہ کل کیا پیش آئے گا[۱] ما تدری نفس ماذا تکسب غدا تو جس کل کی اور کل کی بھی کسی اگلے لمحے کی بھی خبر نہ ہو۔ وہ حالات بعد الممات میں رائے زنی کرے کیا خاک۔ مذہب کے بارے میں لوگوں کی ایسی مثال ہے کہ ایک کوٹھڑی تیرہ و تار رنگ۔ رات کا وقت اور رات بھی اندھیری گھٹا ٹوپ آگے سے پڑے ہوئے پردے اوپر سے ابر غلیظ[۲] او کظلمات فی بحر لجی یغشاہ موج من فوقہ موج من فوقہ سحاب ظلمات بعضہا فوق بعض اذا اخرج یدہ لم یکد یراھا ایسے وقت میں ایسی جگہ پر اندھے لاٹھیاں لے کر چلے مارنے کالی چینوٹی چینوٹی تو کیا مار کھاتی لگے آپس میں سر پھٹول کرنے۔

صادق "حقیقت میں مذہب بھی عجیب چیز ہے!"

بزرگ "بے شک۔ اور ابھی کیا ہے؟ اور سنو۔ یوں بہتیری باتوں میں لوگ آپس میں اختلاف کیا کرتے ہیں ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

اور اختلاف کسی قسم کا اور کیسا ہی خفیف کیوں نہ ہو اس میں کسی نہ کسی قدر تو مخالفت ہوتی ہی ہے مگر مذہبی اختلاف تو عجیب طرح کا اختلاف ہے کہ یہ فوراً عداوت کی طرف منجر ہو جاتا ہے اور عداوت بھی ایسی سخت کہ وہ فریقین میں التیام ہونے ہی نہیں دیتی۔ دنیا میں جتنی خونریزی ابتدا سے آخر تک ہوئی ہے اگر اس کی ایک فہرست بنانی ممکن ہو اور بنائی جائے اور ہر ایک خونریزی کے اسباب تحقیق کئے جائیں تو میرا خیال یہ ہے کہ دوسرے تمام اسباب کے نامۂ اعمال میں ایک چھٹانک

---

[۱] جو کچھ (ماؤں کے) پیٹ میں ہے وہی اس کو بھی جانتا ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ (وہ خود) کل کیا کریگا۔

[۲] یا ان کے اعمال کی مثال) جیسے گہرے دریا کے اندر جیسی اندھیروں کی سی (ہے) کہ دریا کو لہر نے ڈھانک رکھا ہے اور (لہر بھی ایک نہیں بلکہ) لہر کے اوپر لہر اس کے اوپر بادل (غرض) اندھیرے ہیں ایک کے اوپر ایک (دریا کی تہ میں کوئی آدمی) اپنا ہاتھ نکالے تو توقع نہیں کہ اس کو دیکھ سکے۔

خونریزی ہوگی تو مذہب کے نامۂ اعمال میں ایک من یا اس سے بھی زیادہ ۔ بلکہ وہ ایک چھٹانک جو دوسرے تمام اسباب کے نامۂ اعمال میں ہوگی اس میں سے بھی اکثر میں حضرت مذہب نے ضرور اپنی ٹانگ پھنسائی ہوگی کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہ بادشاہ لڑتے ہیں طمع ملک گیری سے لڑتے ہیں آپس کی ضد سے اور نام کر دیتے ہیں کروسیڈ کا، جہاد کا، مذہبی لڑائی کا، گویا لڑائی ایک رنگ ہے اور اس میں شوخی اور پختگی نہیں آتی تا وقتیکہ اس کو مذہب کا ڈوب نہ دیا جائے جس طرح سب سے زیادہ خونریزی دنیا میں مذہب کی وجہ سے ہوئی ہے اسی طرح میرا خیال یہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ گناہ مذہب کی آڑ میں ہوتے ہیں۔ خاص کر حقوق العباد کے متعلق۔ زید کو اتنا معلوم ہو جائے کہ بکر کسی فروعی مسئلہ میں سہی اُس کا ہم عقیدہ نہیں، پھر قرابت، ہمسائیگی، ہم وطنی، انسانیت، بکر کے کتنے ہی حقوق کیوں نہ ہوں زید ہے کہ اُس کی نظر میں سب ضائع۔ پھر انسانی طبیعت کو دیکھتے ہیں تو نفوسِ قدسی کے سوائے کہ وہ اس زمانے میں شاذ و نادر ہیں۔ والنادر کالمعدوم۔ کوئی نفس حسد سے خالی نہیں تھوڑا ہو یا بہت ہر شخص اپنی جگہ یہی چاہتا ہے کہ خدا کی جتنی نعمتیں ہیں سب کا وہی ٹھیکہ دار ہو تو عقل باور نہیں کرتی کہ ہمدردی تعصب مذہبی کے باعث ہو یعنی ہر شخص جو یہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا اُسی کی ہم عقیدہ ہو، کیا لوگوں کی خیر خواہی نے اُس کو اُس کو اس خواہش پر مجبور کر رکھا ہے اور اُس کو ایسا دل درد مند دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو مبتلائے عذاب الٰہی دیکھ نہیں سکتا؟ اگر ایسا ہوتا تو اُس کی فیاضی دُنیا کی باتوں میں بھی ضرور ظاہر ہوئی ہوتی۔ مگر دُنیا میں تو ہم کسی کو ایسا فیاض نہیں پاتے تو معلوم ہوا کہ عام خیر خواہی اور عام ہمدردی کے سوائے تعصب مذہبی کا کوئی اور سبب ہے اور وہ نہیں ہے مگر خود پسندی کہ انسان جب مذہب کے بارے میں ایک رائے قائم کر لیتا ہے، چاہتا ہے کہ لوگ بھی اُس کو تسلیم اور اس کی تصویب کریں۔ یہ ہے اصل الاصول اس تعصب مذہبی کی جو وبائے عام کی طرح لوگوں میں پھیلا ہوا ہے۔"

صادق: "اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا ہوتا ہے کہ دین کا چرچا بالکل موقوف ہو جائے۔"

بزرگ "موقوف ہو جانا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ چرچا ہو اور ایسی بھونڈی طرح ہو کہ دنیا سے امن و عافیت اٹھ جائے اور لوگوں میں ایسی عداوت قائم ہو کہ سازگاری کے ساتھ زندگی نہ بسر کر سکیں۔"

صادق "ہم تو اب تک یہ سمجھتے تھے کہ دین کی خدمت سے بہتر اور شریف کوئی کام نہیں اور شاید ساری دنیا کا اس پر اجماع ہو اور مذہب میں اس کے مبلغ واجب التعظیم سمجھے جاتے ہیں۔"

بزرگ "اس سے کہ لوگ کہا کرتے اور کیا سمجھتے ہیں ہم کو کوئی بحث نہیں ہم کو تو اتنی بات دیکھنی ہے کہ دین کی خدمت جس طرح پر ہو رہی ہے دین کے حق میں مفید ہے یا نہیں۔ سو سینکڑوں برس کے تجربے سے بخوبی ثابت ہو گیا کہ اس طرح کی خدمت سے فائدے کی جگہ دین کو الٹا نقصان پہنچتا ہے۔ دشمنیاں پھیلتی جاتی ہیں اور اختلافِ مذہب ہے کہ لوگوں کو متفق نہیں ہونے دیتا اور اس کا ضروری نتیجہ ہے ضعف، سو ہر جگہ ظاہر ہے۔ جو شخص بودے سے بودا اور غلط سے غلط عقیدہ بھی رکھتا ہے از بسکہ محکوم ہے، سوسائٹی کا، تربیت کا، ملکی آب ہوا کا، مزاجِ شخصی کا، کچھ نہ کچھ تاویل کر لیتا ہے اور اپنی جگہ اس کو تسلی ہے۔ اب جو اس کو اس کے خلاف سمجھایا جاتا ہے (بشرطیکہ سمجھانے کے طور پر سمجھایا جائے) اس کی ضد بڑھتی اور غلطی پر اصرار کرنے لگتا ہے۔ اگر اُس نے اُس کی عیب جوئی کی گئی ہے اس فکر میں پڑ جاتا ہے کہ اس نے میری آنکھ میں ناخنہ بتایا، لاؤ میں اس کی آنکھ میں ٹینٹ دکھا دوں۔ اور کس کی آنکھ عیب سے خالی ہے؟ یہ اُس کے نزدیک پھینگا ہے تو وہ اُسکے نزدیک کانڑا۔ آنکھ کسی کی بھی صاف نہیں۔"

صادق "یہ بالکل سچ ہے کہ اختلافاتِ مذہب کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں بڑے بگاڑ پڑ گئے ہیں مگر اس حالت میں ہم کو ضرور ہے کہ اپنے گروہ کو قوت دیں اور اس سے بڑھ کر کوئی قوت ہو نہیں سکتی کہ لوگ کثرت سے ہمارے ہم عقیدہ ہوں۔ پس میں تو سمجھتا ہوں کہ کہ ان دنوں مذہبی مناظرات کی سخت ضرورت ہے۔"

بزرگ "اگر لوگوں کو حق کی تلاش ہو تو مناظرہ بھی کام آ سکتا ہے۔ ورنہ مناظرہ مذہبی سے بدتر

کوئی چیز نہیں۔ زمانے کا رنگ یہ ہے کہ نہ کہنے والوں کو اظہارِ حق کا تقاضا اور سلیقہ اور نہ سننے والوں کو حق کی جستجو۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ جتنے مذہبی فرقے دنیا میں ہیں سب مباحثے اور مناظرے سے پیدا ہوئے ہیں اور مباحثے اور مناظرے ہی کے بل پر چل رہے ہیں؟ ایسا خیال تو صریح غلط ہے معتقداتِ مذہبی میں بہت سی باتوں کو دخل ہے جیسا کہ میں نے بار بار کہا ہے۔ ان میں ایک حق بھی ہے یعنی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی تفتیش و تحقیق کے بعد ایک عقیدے کو حق سمجھ کر اختیار کرتا ہے لیکن ایسا بہت ہی کم ہے۔ اکثر بلکہ عام یہ ہے کہ جو شخص جس عقیدے کے لوگوں میں پیدا ہوا جس عقیدے کے لوگوں میں اُس نے تربیت پائی، جس عقیدے کے لوگوں میں رہا ان ہی کا سا عقیدہ اُس کا بھی ہوتا ہے اور وہ صمیم قلب سے اسی عقیدے کو حق سمجھتا ہے اور اُس کے لئے حق ہے بھی وہی۔ تو مذہب ایک متوارث چیز ہے جیسے مال و جائداد یا جسمانی بناوٹ۔ پس ابتدائے عمر میں لوگ ایک عقیدے کے پیرو ہوتے ہیں اس واسطے کہ انہوں نے اپنے بزرگوں کو اسی عقیدے کی پیروی کرتے دیکھا ہے۔ بڑے ہو کر سَو میں ننانوے ۹۹ تو آنکھ بند کئے ہوئے اُسی عقیدے پر چلے جاتے ہیں، کوئی اکّا دکّا ایسا ہوا کہ اُس نے اُس عقیدے کی جانچ پڑتال کی، اور فرض کرو اُس کو اُس عقیدے میں کوئی نقص دکھائی دیا۔ تو اُس نے وہیں اُس کی کچھ نہ کچھ تاویل کر لی غرض عقیدہ وہ کا وہی رہا۔ کوئی شاذ و نادر ایسا بھی ہوا کہ تاویل نہ کر سکا تو اُس نے عقیدہ بدل ڈالا۔ مگر ایسے لوگ کتنے ہیں اور کس حساب میں۔"

صادق:"لیکن دنیا میں مذہبی لڑائی اس قدر پھیل گئی ہے کہ اب چُپ رہتے بھی تو نہیں بن پڑتا۔ ممکن ہے کہ ہم اپنی طرف سے چھیڑ چھاڑ نہ کریں لیکن دوسرے بھی چین سے بیٹھنے دیں؟"

بزرگ:"یہ سچ ہے لیکن پھر بھی اس کے انسداد کی کوئی تدبیر ہے تو خاموشی ہے۔"

صادق:" خاموشی کا ایک بڑا زبون نتیجہ یہ ہے کہ اس سے اپنا ضعف ظاہر ہوتا اور اپنے ہی گروہ کے لوگ شکوک اور شبہات پیدا کرنے لگتے ہیں خصوصاً وہ جن کی دینی معلومات بالکل نہیں یا ہیں اور ناقص ہیں۔ تو کم سے کم اپنے گروہ کو سمیٹے رکھنے کے لئے تو مذہبی چھیڑ چھاڑ کا جاری رکھنا پڑے ہی گا۔"

بزرگ "۔میں تو دیکھتا ہوں کہ اب اس کا بھی وقت نہیں۔ایک بڑی خرابی جو اس شان میں ہے یہ ہے کہ آدمی دوسروں کو سنوارنے میں آپ بگڑتا ہے۔اُس کو دوسروں کی آنکھ کے ناخنے تو خوب سوجھ پڑتے ہیں اور اپنی آنکھ کا ٹینٹ نظر نہیں آتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے تئیں مقبول اور دوسروں کو مردود سمجھنے لگتا ہے۔اُس کی ساری معلومات دوسروں کو ملزم ٹھیرانے کے لئے ہوتی ہے اور وہ خود پابندیٔ شریعت سے مستثنیٰ۔ لوگوں میں اپنا مذہبی وقار قائم رکھنے کے لئے اُس کو مذہبی احکام کی پابندی کرنی پڑتی ہے تو وہ پابندی نفاق اور ریاکاری میں داخل ہے، اس کی مثال اُس شخص کی سی ہے کہ محلہ میں لگی آگ، یہ دوسروں کی آگ بجھانے میں رہا اور اپنا گھر جل کر خاک سیاہ ہوگیا۔ اور چوں کہ کہتا ہے اور کرتا نہیں۔اس کی بات لوگوں کے دلوں میں جاگزیں نہیں ہوتی، یہ بنتا ہے واعظ، اور حقیقت میں ہے افسانہ خواں، لوگوں کو راہ بتاتا اور آپ اوندھے مُنہ اوندھے کوئے میں گرتا۔"

صادق "۔ تو آپ کے نزدیک جیسا مناظرہ ویسا وعظ۔"

بزرگ "۔ ہاں میرا تو ایسا ہی خیال ہے۔قباحت سے تو ایک بھی خالی نہیں۔"

صادق "۔ پھر دین سیکھیں تو کس سے سیکھیں اور کیوں کر سیکھیں؟"

بزرگ "۔ اپنے نفس سے۔"

صادق "۔ ع خفتہ را خفتہ کے کُند بیدار؟"

بزرگ "۔ نفسِ انسانی خفتہ نہیں ہے۔اس کو خدا نے جیتا جاگتا پیدا کیا ہے اور وہ ہر وقت بُرے بھلے میں امتیاز کرتا رہتا ہے۔ مگر آدمی خود اُس کو تھپک تھپک کر سُلاتا ہے اور اُس کی فریاد نہیں سننی چاہتا۔ کیا استیفن فلیٹ کا گولڈن رول ذہن سے اُتر گیا۔ کہ جب کسی بات کے اچھے یا بُرے ہونے میں تردد واقع ہوا کرے تو اپنے دل سے پوچھ لیا کرو وہ نیک و بد کے شناخت کی کسوٹی ہے۔ دنیا میں بہت سے مجرم سزا سے بچ جاتے ہیں، مگر ہر فرد بشر پر ایک قدرتی سزا دہندہ مسلط ہے۔ کانشنس یعنی نفس لوّامہ، کہ اس کے سزا سے پناہ نہیں اور وہ سزا

کیا ہی؟ انسان کا آپ اپنے تئیں ملامت کرنا۔ حاکم ظاہر جسمانی سزا دے سکتا ہی مگر وہ ایسی موذی نہیں ہوتی جیسی روحانی سزا کہ اس کی گُچی مارے ہے اور بڑے بڑے ٹرے اور بڑے بڑے ہیکڑ اس کے آگے چپ بول گئے ہیں اور مرتے دم اقرار ہی کرتے بن پڑا ہی۔ ایک دیہاتی نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ "حضرت میں ایک اَن پڑھ دیہاتی آدمی ہوں۔ نہ تو حاضرِ خدمت رہ سکتا ہوں اور نہ دنیا کے کام دھندے سے زیادہ فرصت پا سکتا ہوں۔ مجھ کو تو کوئی مختصر سی بات فرما دیجئے کہ میں اس پر کاربند رہوں اور وہ میری نجات کے لئے کافی ہو" آپ نے سورۂ زلزال اس کو پڑھ کر سنائی جس میں حادثاتِ قیامت کا بیان ہی اور آخر میں اسنفقت قلبہٗ کے مطلب سے ملتا ہوا ایک جملہ ہی فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ[1] یعنی جو شخص دنیا میں ذرہ بھر نیکی کرے گا قیامت کے دن وہ نیکی اس کے آگے آجائے گی اور جو شخص دنیا میں ذرہ بھر برائی کرے گا قیامت کے دن وہ برائی اس کے آگے آجائے گی۔ وہ دیہاتی یہ سن کر رخصت ہوا اور کہتا جاتا تھا "خدا کی قسم اس میں ذرا کمی بیشی نہ کروں گا" اور آں حضرت حاضرینِ خدمت سے فرماتے تھے کہ "جنتی نہ دیکھا ہو تو اس کو دیکھ لو" لوگوں نے بہت چھان چھان کر دین کو کرکرا کر دیا ہے۔ ورنہ دین سے زیادہ سہل و سلیس کوئی چیز نہیں۔ اس کا تقاضا انسان کی فطرت میں رکھا گیا ہی۔ اور ایک ہادی اور راہ نما اس کے ساتھ ہی۔ بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ولو القی معاذیرہ[2]۔ یعنی انسان کیسے ہی حیلے بہانے کرے وہ اپنے نفس کے عیب و صواب خوب دیکھتا ہے"۔

دین کا دستور العمل

صادق۔ تو جس طرح پیغمبر صاحب نے اس دیہاتی کو ایک مختصر سی بات تعلیم کر دی اور اس کی

---

[1] تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی (ہوگی) وہ اس (نیکی) کو (بچشم خود) دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ اس برائی کو (بچشم خود) دیکھ لے گا [2] بلکہ (خود) انسان اپنے مقابلے میں حجت ہے گو وہ (اپنے تئیں) بے قصور ثابت کرنے کے لئے کتنے ہی) بہانے [illegible]

تسلی ہوگئی۔ اسی طرح میری حالت کے مطابق آپ ایک مختصر دستور العمل میرے لئے تجویز کر دیجئے۔"

بزرگ "بسر و چشم۔ دین کا لب لباب ہے معرفتِ نفس یعنی اپنے تئیں پہچاننا کہ ہم کیا ہیں؟ اب کہو تو اس کی کچھ تفصیل کر دوں اور کہو تو خاموش رہوں؟"

صادق "تفصیل کی تو سخت ضرورت ہے تاکہ مطلب اچھی طرح میرے ذہن میں بیٹھ جائے۔"

بزرگ "اپنے تئیں پہچاننے کی کوشش کرو گے تو پاؤ گے کہ آدمی بھی ایک طرح کا جانور ہے کہ اس کی بہت سی ادائیں جانوروں سے ملتی ہیں۔ وہ دوسرے جانوروں کی طرح چلتا پھرتا کھاتا پیتا سوتا رنج و راحت کا احساس رکھتا ہے۔ اے کاش وہ نرا جانور ہوتا پیدا ہوا ایک وقتِ خاص تک زندہ رہا، مر گیا تو کچھ بھی نہ تھا، خس کم جہاں پاک۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ اس کو عقل لگی ہوئی ہے، جو اس کو چین سے نہیں رہنے دیتی۔ یوں آدمی اپنے زور و ظلم سے جو چاہے کر گزرے مگر جانور اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے نہ کھیتی کرتے نہ کپڑا بنتے نہ گھر بناتے اور آدمی کے بے اس کھڑاگ کے گزر نہیں نہ عقل ہوتی اور نہ یہ سب بکھیڑے کرنے پڑتے۔ پیغمبر صاحب نے پرندوں کے حال میں فرمایا ہے۔ تغدو[1] خماصا وتروح بطانا اور اے کاش عقل اتنے ہی کام کی ہوتی کہ ساز و سامانِ معیشت کے بہم پہنچانے میں مدد کرتی اور بس نہیں، وہ بتاتی ہے کہ اس کارخانہ دنیا کا اور خود آدمی کا کوئی خالق اور بنانے والا ہے اور آدمی کے ساتھ خدا کی ابنائے جنس کی بلکہ سچ پوچھو تو ذرّے ذرّے کی ذمہ داریاں متعلق ہیں کلکم راع[2] وکلکم مسئول عن رعیتہ وقتی ضرورتیں اور ترغیبات ایسی پیش آجاتی ہیں کہ آدمی کتنا ہی محتاط کیوں نہ ہو پھر بھی اپنے فرائض کو پورا پورا ادا نہیں کر سکتا، اور نہیں کرتا تو اس کا دل اس کو ملامت کرتا ہے اور نہ صرف ملامت کرتا ہے بلکہ اس کے ذہن میں یہ بات جما رکھی ہے کہ زندگانی کا دنیا پر خاتمہ نہیں ہے۔ جو کچھ اس زندگی میں کرتے ہیں، برا یا بھلا مرے پیچھے اس کا خمیازہ بھگتنا ہے ہو نہیں سکتا کہ ہم جانور بن جائیں، ہو نہیں سکتا کہ سر سے عقل کو نکال ڈالیں، ہو نہیں سکتا کہ ایسے

---

[1] صبح کو نکلے بھوکے شام کو لوٹ کر آئے پیٹ بھرے [2] سب کے سب چرواہے ہو اور تم سب سے تمہاری رعیت کی بابت سوال کیا جائے گا۔

خیالات کو ذہن میں نہ آنے دیں۔ بس یہی دین ہے۔"

صادق۔" ایں! میں نے آپ سے دستور العمل کی درخواست کی تھی"۔

بزرگ۔" یہی دستور العمل ہو کہ اپنی حالت میں غور کرتے رہو جب سمجھ گئے کہ تم کیا ہو۔ تو ضرور یہ بھی سمجھ گئے کہ تم کو کیا کرنا چاہیئے؟ دین تمھاری سمجھ سے باہر کوئی چیز تم سے نہیں چاہتا۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ سمجھ سے کام لو۔ بس میں نے دین کے متعلق اپنے ضروری خیالات ظاہر کر دیئے ہیں اس پر بھی تم کو شبہ ہو تو بیان کرو میں جواب دینے کو موجود ہوں۔"

صادق۔" آپ کی تقریر میں تو مجھ کو کچھ شبہ نہیں اور یوں تو دین کے متعلق میرے پاس شبہات کے انبار ہیں اور گو اس وقت مجھ کو کچھ پوچھتے نہ بن پڑے" تاہم مجھ کو توقع نہیں کہ دین کی طرف سے میرا دل کبھی مطمئن ہوگا۔"

بزرگ۔" بیشک جس کو تم نے دین سمجھ رکھا ہو اس کی طرف سے مطمئن ہونا تو مشکل ہو مگر افسوس کی بات ہو کہ جس چیز کو خدا نے دل کے اطمینان کے لئے بنایا ہو الا بذکر اللہ تطمئن القلوب[1] وہی تمھاری بے اطمینانی کا باعث ہو، اس کا علاج تو دعا کے سوائے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

مذہبی شکوک اور اُن کا دفعیہ

میرا بھی قریب قریب تمہارا ہی سا حال تھا۔ بلکہ شاید اس سے بھی بدتر، اور جس کو انگریزی تعلیم چھوتوں بھی چھو جائے گی قسم کھانے کی بات ہو کہ اُس کا ایسا ہی حال ہوگا۔ وہ کہے یا نہ کہے ظاہر کرے (اگر ہمت والا ہو) یا چھپائے (اگر دل کا بودا ہے) میں ایک دیندار کے گھر میں پیدا ہوا اور کہہ سکتا ہوں کہ گھر والوں کی دیکھا دیکھی میں بھی اوائل عمر میں دیندار تھا اگرچہ میں اس وقت اور اس طرح کی دینداری کو دینداری کہہ سکوں۔ شامت جو آئی تو مجھ کو سرکاری کالج میں داخل کر دیا گیا باوجودے کہ کالج پادریوں کا نہیں بلکہ سرکاری تھا اور اس میں دین و مذہب سے کچھ بحث نہ تھی

---

[1] سُن رکھو کہ خدا کی یاد سے دلوں کو تسلی ہوا ہی کرتی ہے۔

اور میں انگریزی بھی نہیں بلکہ عربی پڑھتا تھا، تاہم چونکہ ہر قسم کے لوگوں سے ملنا جلنا ہوتا تھا
مختلف آوازیں کان میں پڑنے لگیں۔ بہت دن نہیں گزرے تھے کہ میرے مذہبی خیالات میں
تزلزل پیدا ہونا شروع ہوا۔ نماز پہلے گنڈے دار ہوئی پھر ندارد اور ع خدا کی جب نہیں چوری تو
پھر بندے کی کیا چوری ؛ دو چار دفعہ بڑوں کے لحاظ سے پڑھنی پڑی تو بے وضو ہی پڑھا دی پھر عیسائیت
کی طرف رجحان ہوا تو یہاں تک نوبت پہنچی کہ ریائی نمازوں کی التحیات میں اشہد ان محمداً عبدہٗ و
رسولہٗ کی جگہ اشہد ان عیسی ابن اللہ کہنے لگا۔ مگر حضرت عیسٰی کا خدا اور خدا کا بیٹا ہونا دل میں
کچھ اچھی طرح جمتا نہ تھا پھر جھجکتے جھجکتے وہی اشہد ان محمد اعبدہٗ و رسولہٗ کہنے لگا۔ منہ
سے اقرار دل سے انکار۔ غرض میں کسی وقت عیسائی تھا کسی وقت مسلمان کسی وقت کچھ بھی نہیں
میں اس کی بھی کوشش کرتا تھا کہ مذہبی خیالات کو سرے سے سر میں آنے ہی نہ دوں مگر کوئی نہ کوئی
اتفاق ناملائم پیش آتا ہی رہتا تھا کہ وہ خدا سے بے تعلق محض نہیں ہونے دیتا تھا۔ اپنی بے اختیاری
دیکھ کر دل سہارا ڈھونڈتا تھا بس یہی ایک چیز تھی جو مذہب کے خیالات کو ٹلنے نہیں دیتی تھی، اسی
حیص بیص میں کئی برس گزر گئے ہیں۔ اس کا اقرار کرتا ہوں کہ میری عمر کا کوئی حصہ ایسا نہیں گزرا
جس میں ہمہ وقت میں مذہبی خیالات میں مستغرق نہ رہا ہوں۔ دنیا کے بہت سے کام کاج کرنے کو
تھے ان سے فرصت پاتا اور آدمی کی جون میں ہوتا تو مذہب کا بھی خیال کرتا، کبھی گرویدہ اور کبھی
بالکل ہٹنے سے اکھڑا ہوا، اسی تردد کی حالت میں خدا جھوٹ نہ بلوائے میں نے علم کلام کی پچاسوں
کتابیں دیکھ ڈالیں لیکن کسی سے بھی تسلی نہ ہوئی اور تسلی ہوتی تو کیوں کر ہوتی ؟ عیسائی مثلاً مسلمان
پر ایک اعتراض کرتا ہے مسلمان اس اعتراض کو تو نہیں اٹھاتا مگر ویسا ہی یا اس سے بھی بدتر
اعتراض عیسائی پر جڑ دیتا ہے۔ میری طبیعت پر اس سوال و جواب کا یہ اثر ہوتا کہ دونوں سے بدعقیدت،
آخر اکتا کر میں نے علم کلام کی کتاب دیکھنے سے توبہ کی۔ کیونکہ ان کو .. العلم حجاب الاکبر کا مصداق
پایا۔ اب مجھ کو بالکل یقین ہو گیا کہ میں اسی تذبذب اور تزلزل کی حالت میں مروں گا لیکن اس
سے جیسی ایذا مجھ کو ہوتی تھی بیان نہیں کر سکتا۔ وقتاً فوقتاً خدا سے دعا بھی مانگتا لیکن کن لفظوں کہ

"اے خدا اگر واقع میں تو ہی تو مجھ کو اس حیرت سے نجات دے، مباحثے اور مناظرے سے قطع نظر کر کے اب میں آپ ہی مذہب کی ادھیڑ بن میں رہا، جب موقع ملتا اکیلا بیٹھا یا پڑا سوچا کرتا، شدہ شدہ میرے وہ خیالات ہو گئے جو میں نے تم پر ظاہر کئے۔ اگر بعض یا سب کے سب غلط بھی ہوں تاہم میرا دل مطمئن ہے کیوں کہ میں نے ان کو سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے اور مجھ کو جتنی سمجھ دی گئی ہے اس سے بڑھ کر مجھ سے باز خواست نہیں ہو سکتی۔ ۵ لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا اب بھی مجھ کو کبھی کبھی اختلافات اور اعتراضات کا خیال آیا کرتا ہے لیکن پہلے جو مجھ کو پہاڑ معلوم ہوا کرتا تھا اب میں اس کو پھونک مار کر اڑا دیا کرتا ہوں۔ میں نے اصول ہی ایسے ٹھیرا رکھے ہیں کہ وہ اعتراضات کو اپنے پاس تک نہیں پھٹکنے دیتے۔"

صادق۔ "وہی اصول تو میں معلوم کرنے چاہتا ہوں۔"

بزرگ۔ "عقل انسانی کی نارسائی اور اپنی ہنڈیا کی خیر منانی۔"

صادق۔ "یہ تو آپ نے ایک پہیلی سی کہہ دی۔"

بزرگ۔ "پہیلی نہیں ہے، بڑے کام کی بات ہے۔ جتنے مذہبی اختلافات دیکھتے ہو اکثر بلکہ عموماً ان ہی دو قسموں کے ہوتے ہیں۔ یا تو انسان عقل سے وہ کام لینا چاہتا ہے جو اس کی طاقت سے باہر ہے ہر شخص بجائے خود اٹکل دوڑاتا ہے اور ایک کی مت دوسرے سے نہیں ملتی، جب ایسی بات تمہارے سامنے آئے فوراً اس سے کنارہ کش ہو جاؤ اور سمجھ لو کہ ایسی باتوں میں غور کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ اختلافات کی دوسری بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ آدمی ناحق شیخی میں آ کر جھوٹ موٹ خیر خواہی جتا کر دوسرے کے مذہب کے درپے ہوتا ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ تقاضائے حقانیت ہی ہو۔ تاہم یہ شخص فرض کو چھوڑ کر نفل پر دوڑتا ہے۔ اس کو چاہئے پہلے اپنے نفس کی اصلاح، جس کے نیک و بد کی اس کو خدا کے یہاں چل کر جواب دہی کرنی ہے، وہ اپنی تو خبر نہیں لیتا، اور قاضی جی کیوں دبلے، شہر کے اندیشے سے، دوسروں کی فکر سے نجات نہیں،

---

۵ "خدا نے جس کو جتنا دے رکھا ہے اس سے بڑھ کر کسی کو تکلیف دینی نہیں چاہتا۔"

کہ تم ان اختلافات کو دنیا سے معدوم کر دو گے۔ یہ اختلافات دنیا کے ساتھ ہیں،
نہ اس سے جدا ہوئے نہ اس سے جدا ہو سکتے ہیں اور نہ اس سے جدا ہوں گے بلکہ
میری مراد یہ ہے کہ اختلافات تم کو حیران و پریشان نہیں کریں گے۔

مقلدوں اور غیر مقلدوں کے جھگڑے

یہ اختلافات اکثر فروعی اور غیر ضروری باتوں میں ہیں جن کی مطلق پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ مثلاً آج کل مقلدوں اور غیر مقلدوں کے اختلافات نے مسلمانوں میں بڑا تفرقہ ڈال رکھا ہے اور لڑتے ہیں کن باتوں پر کہ نماز میں آمین پکار کر کہنی چاہیئے یا آہستہ ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں یا اس سے نیچے ہٹا کر صف نماز میں مقتدیوں کو پاؤں سے پاؤں ملا کر کھڑا ہونا چاہیئے یا پاؤں جوڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ سچ ہے کہ نماز نام ہے حرکات خاص (قیام و رکوع سجود وغیرہ) کا اوضاع خاص پر جو شارع سے منقول ہیں یعنی ہم کو اسی طرح پر نماز پڑھنی چاہیئے جس طرح پر خود پیغمبر صاحب نے پڑھی، مگر تیرہ سو برس کی بات۔ اوضاع میں اختلاف تعین کے درجے تک۔ اوضاع کا متعین ہونا مشکل لیکن ہم دیکھتے ہیں تو ان اوضاع مختلفہ میں کوئی بھی شرط نماز نہیں۔ شرط نماز ہے طہارت، استقبال قبلہ، قرآت، قیام وغیرہ اور شرطیں تو ظاہر کے اعتبار سے ہیں اور ان کی تعمیل چنداں دشوار بھی نہیں۔ ہر کوئی کر سکتا ہے اور کیا ہی کرتا ہے۔ ایک شرط اعظم ہے حضور قلب جس کی بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ وہ ہزاروں میں کسی ایک بندۂ خدا سے ادا ہوتی ہوگی۔ اور یہ شرط فوت ہو تو دوسرے سے نماز ہی نہیں ہوتی، بلکہ نیکی برباد گناہ لازم بے ادبی اور گستاخی سمجھی جائے تو عجب نہیں۔ بادشاہوں کے بادشاہ دونوں جہاں کے مالک اپنے خالق و رازق کے روبرو کھڑا ہو تو آپ کہیں اور دل کہیں یہ خدا کو دھوکا دینا اور اس کے ساتھ کھیل کرنا نہیں ہے تو کیا ہے؟ حضور قلب نہیں اور فرضاً نماز پیغمبر کی نقل بھی کر لی اُن ہی کی طرح پکار کر آمین کہی، اُن ہی کی طرح سینے پر ہاتھ باندھے ع آنچہ آدم نے کشاد از نہ بہم تو کیا اس سے نماز مقبول ہو گئی؟ جس کے ایسے

پس بھائی ہمارے تو یہ دو چٹکلے ہاتھ آ گئے ہیں۔ اپنی ضرورت سے زیادہ مذہب کے غم کو پاس نہیں آنے دیتے اور شکر ہے کہ بڑے امن و اطمینان سے زندگی بسر ہوتی ہو میں نے سمجھ لیا تھا کہ مذہب کو ذریعہ اطمینان و تسلّی ہونا چاہئیے، سو یہ صفت ان ہی خیالات میں پائی، ہاں ان خیالات پر بھی اس بات کا کھٹکا تو ضرور لگا رہتا ہو کہ فرائض انسانیت میں مجھ سے بڑی کوتاہی ہوتی ہو۔ نہ تو جیسے چاہئیے خدا ہی کے حقوق ادا ہوتے ہیں اور نہ بندوں کے مگر خدا کی رحمت پر بھروسہ کر کے میں اپنی مغفرت کی طرف سے ناامید بھی نہیں ہوں۔ مذہب تو پوری تسلّی دے مگر اپنے کردار بھی تسلّی ہونے دیں۔"

صادق۔ "آپ نے اختلافات کی بھول بھلیوں میں سے نکلنے کے لئے کیا سلسلہ اختیار کیا تھا؟"

بزرگ۔ "سب سے پہلے خدا کے بارے میں جہاں تک عقل نے یاری دی اپنے خیالات کو راسخ کیا خدا کی نسبت لوگوں کے جیسے جیسے خیالات ہیں کچھ سُنے سُنائے معلوم تھے۔ کچھ کتابوں میں پڑھے تھے۔ ان سب کو سوچا، سب کو غور کیا تو جو خیالات اسلام تعلیم کرتا ہے سلیس قریب الفہم اور قرین قیاس معلوم ہوئے۔ پس ایک اسی جڑ کو پکڑ لیا اور دوسرے مذہبوں کے ساتھ محاکمہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ رہی۔ میں نے دین کو سمجھا ایک عمارت اور خدا شناسی کو اُس کی بنیاد عمارت جس کی بُنیاد درست نہیں گو وہ کیسی ہی نقش و نگار اور ساز و سامان سے آراستہ کی گئی ہو وہ بالکل نامحفوظ ہو۔ علیٰ شفا جرف ھار[1] آنے دو۔ اذا زلزلت الارض زلزالھا[2] کا وقت ہے پہلے ہی جھوکے میں عمارت نہ لڑکھڑا جائے تبھی کہنا۔ اور جب اسلام کی طرف سے پوری تسلّی ہو گئی تو مزید تحقیقات کی ضرورت باقی نہ رہی کہ اور لوگ کیا سمجھتے اور کیا کہتے ہیں۔"

صادق۔ "مصیبت یہ ہو کہ خود اسلام بھی تو اختلاف سے خالی نہیں۔"

بزرگ۔ "بیشک۔ اس واسطے کہ لوگوں کی طبیعتیں مختلف واقع ہوئی ہیں لیکن ان اندرونی اختلافات کا رفع کر دینا کچھ بھی تو مشکل نہیں۔ اختلافات کے رفع کر دینے سے میری یہ مُراد نہیں

---

[1] کنارے پر ریتیلے گار کے جو گرنے کو ہو رہا ہو۔ [2] جب زمین بڑے زور سے ہلا دی جائے۔

خیالات ہوں اور میرا ایک نمازی کے ایسے ہی خیالات ہونے چاہئیں۔ وہ کیا پرواہ کر سکتا ہے کہ آمین پکار کر کہی یا آہستہ، ہاتھ سینے پر باندھے یا نیچے چھوڑ کر۔

صادق "یہ اختلافات تو واقع میں محض بے حقیقت ہیں مگر ان لوگوں میں بڑا اختلاف تقلید کا ہے۔"

بزرگ "وہ بھی رفع یدین اور آمین بالجہر کے اختلافات کی طرح بے حقیقت ہے۔ ائمہ اصول میں اختلاف نہیں کرتے، اُن کے اختلاف بھی فروع میں ہیں یا قیاسی باتوں میں جن کے لئے ان کو نص شرعی بہم نہیں پہنچی۔ علاوہ بریں سوچنے اور خیال کرنے کی بات ہے کہ کتنے مسلمان اس لیاقت کے ہیں اور اُن کی دینی معلومات اس درجے کی ہے کہ اُن کو ائمہ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہ ہو یا وہ ائمہ کے اختلافات میں محاکمہ کر سکیں، ایسے لوگوں کو یعنی اس ملک کے اور اس وقت کے مسلمانوں کو تقلید کے سوائے اور کیا چارہ ہے۔ رہی یہ بات کہ نص شرعی کے ہوتے دیدہ و دانستہ اس کے خلاف امام کی رائے پر عمل کیا جائے۔ شاید کوئی احمق سے احمق مسلمان بھی اس کا قائل نہیں، غرض سارے فسادات ضد اور سخن پروری کے ہیں ورنہ مسلمان کو مسلمان اختلاف کرنے کے معنی کیا؟"

سُنّی شیعوں کا اختلاف

صادق "بھلا سُنّی شیعہ کے اختلافات کو آپ نے کیوں کر رفع کیا؟"

بزرگ "میرے یہاں یہ بھی غیر ضروری میں داخل ہیں۔"

صادق "غیر ضروری!"

بزرگ "جی ہاں غیر ضروری بالکل غیر ضروری۔"

صادق "یہ کیوں کر؟"

بزرگ "یہ اس طرح کہ خدا کو دین اسلام کا جاری کرنا منظور تھا۔ لوگوں کے معتقدات خدا کے بارہ میں اس قدر بیہودہ ہو گئے تھے کہ اُن کی وجہ سے نظام عالم میں فتور واقع ہو چلا تھا اُن غلطیوں کی اصلاح کے لئے خدا نے پیغمبر آخرالزماں کو مبعوث کیا۔ اُن پر قرآن نازل فرمایا۔ جس نے ان ہی عقائد کا تعلیم کرنا تھا کہ جیسے کسی نے بکھیڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ پیغمبر صاحب کو لوگوں کے ساتھ مطارحات

پیش آئے۔ مباحثے اور مناظرے ہوئے اور ہمیشہ کہ مباحثے اور مناظرے کا ہمیشہ انجام ہوا کرتا ہے کشت وخون کی نوبت پہنچی جس کا نتیجہ الحق یعلو ولا یعلی یہ ہوا کہ ادھر اسلام پھیلتا جاتا تھا اور ادھر ردکھن میں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوتی جاتی تھی پیغمبر صاحب شروع شروع میں صرف پیغمبر تھے اور آخر آخر میں پیغمبری کے علاوہ بادشاہ بھی، خاتمیت پیغمبری تو کبھی متوارث ہوتی نہیں اور اس کو متوارث ہونا چاہیئے بھی نہیں پیغمبری ایک فضیلت خاص ہے جس کے لئے خدا اپنے بندوں میں اس کو جو فی علم اللہ اس کا اہل ہوتا ہے۔ منتخب فرمالیتا ہے۔ اللّٰہ اعلم حیث یجعل رسالتہٗ پیغمبر صاحب کے جیتے جی مدون ہو چکا تھا۔ اور وہ دین کے لئے کافی اور وافی ہو جیسا کتاب اللہ اگر پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد دین کے لئے کسی نائب یا خلیفہ یا امام کی ضرورت تھی تو وہ ایسی ہی ضرورت تھی جیسی مسئلہ بتانے دینیات کا درس دینے اور وعظ کہنے کے لئے مولویوں کی ضرورت ہے۔ مگر سلطنت جانشین کے بدون ایک لمحہ بھی نہیں چل سکتی تھی چنانچہ اس جانشینی کا سلسلہ ایک وضع پر چلا۔ اب اس میں غور وخوض کرنا کہ واجب ہو یا غیر واجب، مناسب ہو یا نامناسب، جو لوگ جانشین ہوئے مستحق تھے یا غاصب یہ اسی کی بحث ہے کہ شیر شاہ کی داڑھی بڑھی تھی یا سلیم شاہ کی جس کو نہ دین سے کچھ تعلق اور نہ دین اس کا متقاضی۔ یہ بحث اب تیرہ سو برس بعد کیا فائدہ دے سکتی ہے یا اُن ہی وقتوں میں جب کہ یہ جانشینیاں ہو رہی تھیں اس بحث نے کیا فائدہ دیا۔ ہونے والی بات کون روک سکتا تھا سو لایت کے کسی کلب میں ایک مرتبہ یہ بات زیر بحث تھی کہ جلال الدین اکبر اور عالمگیر اورنگ زیب دونوں میں کون اچھا بادشاہ تھا۔ کچھ لوگ اکبر کے جانب دار ہوئے۔ اور کچھ عالم گیر کے۔ باتوں باتوں میں تکرار ہو پڑی۔ طرفین میں بعض بعض ایسے تیز مزاج تھے کہ فرانس کے علاقے میں جاکر ڈیوئیل لڑتے۔ میں تو ان میں اور سنی شیعوں میں کچھ بھی فرق نہیں کرتا۔"

صادق "سنی شیعوں کے اختلاف کو اس اختلاف پر جو اکبر اور عالمگیر کے بارے

لہ خدا جس جگہ اپنی پیغمبری (کی امانت سپرد) کرتا ہو وہ (اس جگہ کے محفوظ اور قابل اطمینان ہونے کو بھی) خوب جانتا ہے۔

میں کیا جائے۔ قیاس بڑی بے انصافی ہے۔ سنی شیعوں کا اختلاف اختلاف ہے اُن لوگوں کے بارے میں جو پیغمبر صاحب کے حواری اور شاگرد اور بعض اُن کے بہت پاس کے رشتہ دار اور اُن کے تربیت یافتہ تھے۔ ان کے معاملات پیغمبر صاحب کی تعلیم یعنی اسلام پر اثر کرتے ہیں۔ یہ اختلافات یوں سرسری نہیں ٹرخائے جا سکتے۔"

بزرگ "۔ابھی دین کے بارے میں تمہارے خیالات ہی کا ٹھکانا نہیں۔ سب سے زیادہ مکروہ پیرا جو اس اختلاف کے لئے اختیار کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ وہ لوگ پیغمبر صاحب کے حواری اور شاگرد اور قرابت دار اور ان کے تربیت یافتہ ہو کر خلافت یعنی سلطنت کے لئے لڑے اور ضرور ہے کہ ان دو مخالفوں میں ایک حق پر ہو اور دوسرا ناحق پر تھا کیوں اُس کو جانشین پیغمبر اور کیوں اُس کو واجب الادا مانا جائے۔ طلب سلطنت کو اُن لوگوں کی شان کے خلاف سمجھنا پہلی غلطی تو یہی ہے۔ دُنیا اور دین میں جو علاقہ ہے اسلام سے بہتر اس کی توضیح شاید کسی مذہب نے نہیں کی۔ شروع سے اس کے سمجھنے میں لوگوں نے غلطی کی۔ اور غلطی کی وجہ واقع ہوئی۔ دنیا کی بے ثباتی، بے ثباتی کے خیال سے دُنیا کو جس قدر حقیر اور ذلیل سمجھا جائے بجا اور درست مگر وہ ویسی ہی حقیر اور ذلیل ہے۔ جیسے باغ میں بہار کا موسم کہ چند روزہ تو ہے مگر جب دن ہے ایسا کونسا کوڑمغز ہے جس کو بھلا نہ لگے اور رنگ برنگ کے پھولوں کو دیکھ کر سونگھ کر اس کا دل باغ باغ نہ ہو جائے۔ بے ثبات ہے تو اور چند روزہ ہے تو مگر دنیا کو بھی خدا نے کسی مصلحت سے بنایا ہے۔ ربنا ما خلقت ھذا باطلا[1]۔ یہ کہاں کا دین ہے کہ دُنیا میں اتنے کیڑے ڈالے جائیں کہ اُس میں رہنا حرام اُس کو طلب کرنا منع ایسا دین کبھی چلا ہے اور چل بھی سکتا ہے؟ اسلام کی یہی تو بڑی عمدگی ہے کہ وہ ہر بات میں فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ انس

[1] اے پروردگار تو نے دُنیا کو بے کار محض تو نہیں بنایا۔

نے لوگوں کو ہرگز تقدس آو عائی اور زہد ریائی کی تکلیف نہیں دی اور دنیا جہان میں منادی کر دی۔ لا رھبانیۃ فی الاسلام اور من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق پھر پیغمبر صاحب کی زندگی کو دیکھتے ہیں تو گو ان کا اصلی مدعا دنیا میں خدائے واحد کی پرستش اور حسن معاشرت کا قائم کرنا تھا مگر اس فکر سے بھی غافل نہ تھے کہ مسلمانوں کی ایک خاص سلطنت قائم ہو اور اگرچہ تھوڑی مہلت پائی مگر جب تک تمام جزیرہ عرب کو مطیع نہیں کر لیا انتقال نہیں فرمایا۔ تو قرآن اور نمونہ پیغمبر کے ہوتے یہ کہنا کہ اسلام ترک دنیا کا متقاضی ہے صریح بہتان ہے۔ ہاں اسلام یہ ضرور چاہتا ہے کہ دنیا کو نیکی اور حسن معاملہ کے ساتھ برتو۔ تو اگر پیغمبر صاحب کے رفقاء نے ان کے شاگردوں نے ان کے عزیزوں نے سلطنت کی خواہش کی اور خواہش کے ساتھ منافست یعنی ہر ایک دعویٰ دار نے چاہا کہ یہ نعمت اسی کے ہاتھ لگے، تو میں نہیں سمجھتا کہ اس خواہش اور منافست سے ان کے اسلام میں کیوں فتور واقع ہونے لگا۔ اب بھی مسلمانوں میں چھوٹی چھوٹی بے حقیقت باتوں کے لئے کشمکش ہوتی رہتی ہے۔ ایک مدعی ہوتا ہے دوسرا مدعا علیہ اور ولایت تک، مقدمے لڑتے چلے جاتے ہیں اور کبھی کسی کو اس کا خیال ہی نہیں آتا کہ اس مقدمہ بازی سے کوئی فریق دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا۔ ہر ایک فعل کا برا یا بھلا ہونا موقوف ہی نیت پر نیت کا حال صاحب نیت اور خدائے عالم الغیب کے سوا کوئی جان نہیں سکتا۔ ہاں بعض قرائن سے تحری یعنی اٹکل کی جا سکتی ہے۔ سو جن لوگوں کی کشمکش پر سنی شیعوں کا اختلاف مبنی ہے ان کے خلافت سے پہلے اور خلافت کے بعد کے حالات دلالت کرتے ہیں کہ انہوں نے دنیوی اغراض کی طمع سے خلافت یعنی سلطنت کی آرزو نہیں کی بلکہ اسی میں اسلام کا فائدہ سمجھا

۱؎ اسلام میں جوگی سنیاسی بننے کا کچھ کام نہیں بنایا ۲؎ زینت کی چیزیں جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے ایجاد کی ہیں اور مزے دار کھانے ان کا حرام کرنے والا کون؟

کہ زمامِ سلطنت خود اپنے ہاتھ میں لیں انھوں نے حکومت سے کوئی حظ نہیں اُٹھایا۔ انہوں نے بیت المال کی رقم کو ضرورت سے زیادہ اپنے اوپر حرام سمجھا اور کوڑی کوڑی پر جان دی۔ انہوں نے سلطنت کو بوداجب الٰہی سمجھا اور جس خیال سے لی تھی اُسی خیال سے بھائی کو نہیں بیٹے کو نہیں جسے اہل سمجھا حوالے کی۔ اور پیغمبر صاحب کی حیات میں اسلام کی جیسی جیسی انہوں نے خدمتیں کیں کوئی ایسا ہی ہٹ دھرم ہو تو اُن کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لے۔ اس روداد پر کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے غصباً طمع دنیا کی وجہ سے خلافت طلب کی تھی۔ غایت ما فی الباب یہ کہ انہوں نے اپنے استحقاق کے اندازہ کرنے میں غلطی کی ہو تو کیا اس غلطی کی پاداش میں ان کے تمام عمر کے حقوق فراموش کر دیئے جا سکتے ہیں۔ حاشا ثم حاشا اصل لم تو کوئی پاتا نہیں۔ ورنہ مسلمان کی زبان پر ان اختلافات کا نام بھی تو نہیں آنا چاہیئے۔ لوگ مذہبی تقدس کو اتنا اونچا لے گئے ہیں کہ سارا راگ بے مناسبت ہو رہا ہے انسان کو انسانیت کے جامہ میں نہیں دیکھ سکتے اور گو منہ سے نہیں کہتے مگر ان کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کامل دیندار وہ ہے جو فرشتوں کی طرح تمام انسانی کمزوریوں انسانی خواہشوں سے مطلقاً بری ہو۔ جب مجرد دیندار ہونے کے لئے یہ قید ہے تو پیغمبر کا کیا پوچھنا ہے، لوگوں کا بس چلے تو اُسے آدمیت کو چھونے بھی نہ دیں۔ پیغمبر کی نسبت اُن کے تو اس قسم کے خیالات تھے[1] وقالوا ما لهذا الرسول يأكل الطعام ويمشي في الاسواق[2] لولا انزل عليه كنز او جاء معه ملك۔[3] وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه ليبين لهم[4] ولقد ارسلنا من قبلك وجعلنا لهم ازواجا وذرية۔[5] لولا انزل هذا القرآن على

---

[1] اور کافر کہتے ہیں اس رسول کا کیا حال ہے یہ تو کھاتا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے [2] اس پر غیب سے کوئی خزانہ نازل کیوں نہ ہوا یا اس کے ساتھ اس کی مدد کو کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا [3] اور ہم نے جو رسول بھیجا اپنی ہی قوم کی بولی میں گفتگو کرتا ہوا بھیجا تاکہ لوگوں کو سمجھا سکے [4] اور اے پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھی رسول بھیجے وہ بیبیاں بھی رکھتے تھے اولاد بھی [5] مکہ مدینہ دو بڑے شہر ہیں ان میں کسی

رجل من القریتین عظیم ۔ ۲وما ارسلنا من قبلک الا رجالاً نوحی الیہم من اہل القریٰ ۔ ۳وما جعلناہم جسداً لا یاکلون الطعام وما کانوا خالدین ۔ ۴لولا انزل علیہ ملک فیکون معہ نذیراً او یلقیٰ الیہ کنز او تکون لہ جنۃ یاکل منہا ۔ ۵وقالوا لن نؤمن لک حتیٰ تفجر لنا من الارض ینبوعاً او تکون لک جنۃ من نخیل وعنب فتفجر الانہار خلالہا تفجیراً او تسقط السماء کما زعمت علینا کسفاً او تاتی باللہ والملائکۃ قبیلاً او یکون لک بیت من زخرف او ترقیٰ فی السماء ولن نؤمن لرقیک حتیٰ تنزل علینا کتاباً نقرؤہ ۔ ان چند باتوں سے جو صرف نمونے کے طور پر بیان کی گئی ہیں۔ پتہ لگتا ہے کہ لوگوں کے خیال میں پیغمبر کو کیسا ہونا چاہیے تھا۔ آدمیوں سے بالاتر، فرشتہ، شانِ خدائی لئے ہوئے۔ پیغمبر صاحب نے اپنی سی بہتیری کی کہ اُن کی نسبت ایسے خیالات نہ کئے جائیں اور اُن کے اصرار سے اور پکار پکار انما انا بشر مثلکم فرمانے سے اُن خیالات میں بہت کچھ کمی ہوئی بھی مگر لوگوں کے اصلی رجحانِ طبیعت کو کیا جائے۔ رنگ کٹ گیا مگر وہ تہہ باقی۔ اُن ہی خیالات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ پیغمبر کے رفیق پیغمبر کے عزیز پیغمبر جیسا تقدس اور تقدس بھی وہ تقدس جو انھوں نے سمجھ رکھا ہے

---

۱ بڑے آدمی پر یہ قرآن نازل کیوں نہ ہوا ۔ ۲ اور اے پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھی قصباتی لوگوں کو رسول بنا بھیجا اور اُن پر وحی نازل کی ۔ ۳ اور ہم نے پیغمبروں کو ایسے جثے نہیں دیئے تھے کہ اُن کو کھانے کی ضرورت ہو اور نہ وہ لوگ سدا سدا کو دنیا میں رہنے والے تھے ۔ ۴ اس پیغمبر کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا کہ اس کے ساتھ ہوکر لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈراتا یا اس کے پاس غیب سے خزانہ اُتر آیا ہوتا یا کوئی باغ ہوتا کہ اس کا پھل پھلاری کھاتے ۔ ۵ اور کافر کہتے کہ اے پیغمبر ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ہیں مگر یہ کہ تم زمین میں سے پانی کا ایک چشمہ جاری کر دیا تمہارا کوئی باغ ہو اس میں چھوہارے اور انگور کھلے ہوں اور تم اس کے بیچ بیچ نہریں بہا دو جو دھمکایا کرتے تھے آسمان کے ٹکڑے ہم پر برساؤ یا اللہ اور فرشتوں کو سامنے لا کھڑا کرو یا سونے چاندی کا تمہارا گھر ہو یا آسمان میں چڑھ جاؤ اور ہم تو تمہارے چڑھ جانے کے ماننے والے نہیں جب تک کہ ہم پر کتاب اُترے اور ہم آپ اس کو پڑھیں ۔

نہ رکھتے ہوں تو انیس بیس کے فرق سے اس کے لگ بھگ ہوں۔ یہ ہے اصلی جڑ سُنی شیعوں کے اختلاف کی۔ لوگوں نے پیغمبر صاحب کے خانگی حالات کی ٹوہ لگائی تو معلوم کیا کہ باپ تو شیر خوار ہی چھوڑ مرے تھے۔ پیغمبر صاحب نے دادا کے کنارِ عاطفت میں پرورش پائی۔ پھر دادا کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا تو چچا نے سرپرستی کی۔ یوں پیغمبر صاحب کو نسب میں حسب میں خدانخواستہ کسی سے ہیٹے نہ تھے۔ مگر پھر بھی تھے غریب آدمی۔ اور خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ایک بیوہ بی بی تھیں۔ مگر تھیں بڑی مالدار اور ملک شام کے ساتھ اُن کی بڑی تجارت تھی۔ اُن کو متدین کارندے کی تھی جستجو۔ انھوں نے پیغمبر صاحب کی دیانت، امانت، راست بازی حسنِ معاملت کا حال سُنا تو اُن کو مالِ تجارت دے کر شام کو روانہ کیا اور یہ پیغمبری سے پہلے کی بات ہے۔ بھلا جس شخص کو خدا نے پیغمبری کے لئے منتخب کیا ہو اور وہ تجارت کرے تو اُس تجارت میں برکت نہ ہوتی ہو تو ہو۔ اس پھیرے میں خدیجہ رضؓ کو توقع سے بہت بڑھ کر نفع ہوا اور ان کے غلاموں نے جو مال کے رکھ رکھاؤ کے لئے ساتھ تھے پیغمبر صاحب کی ہر طرح کی تعریفیں بیان کیں۔ خدیجہ رضؓ تو پیغمبر صاحب کی گرویدہ ہو گئیں اور پیغمبر صاحب سے نکاح کا پیام دیا۔ ادھر خدیجہ رضؓ کی قدردانی ادھر پیغمبر صاحب کی احسان شناسی باوجودیکہ خدیجہ رضؓ بیوہ کے علاوہ پیغمبر صاحب سے پندرہ برس بڑی تھیں پیغمبر صاحب نے منظور فرما لیا۔ اب پیغمبر صاحب نے دنیاداروں کی نظر میں ایک وقار پیدا کیا۔ ہم تو پیغمبر صاحب کی اس بات کے قائل ہیں کہ باوجودیکہ عرب میں متعدد نکاح کر لینے کا عام رواج تھا۔ مگر خدیجہ رضؓ کے ساتھ پیغمبر صاحب نے اس قدر مروّت برتی کہ جب تک زندہ رہیں دوسرے نکاح کا خیال بھی تو نہیں کیا۔ جس طرح خدیجہ رضؓ کے مال میں خدا نے پیغمبر صاحب کے شمول سے برکت دی تھی اسی طرح ان کے نکاح میں بھی برکت دی کہ بیٹے ہوئے اور بیٹیاں بھی ہوئیں۔ سو بیٹے تو خدا کی مرضی سے زندہ نہ رہے۔ بیٹیوں

میں صرف حضرت فاطمہ رضؓ پیغمبر صاحب کے بعد جیتی رہیں وہ بھی چھ مہینے - ادھر خدیجہ رضؓ کا منہ تھا کہ پیغمبر صاحب نکاح کا قصد نہیں فرماتے تھے ان کے انتقال کے بعد پیغمبر صاحب نے کئی بیبیاں کیں. جن میں حضرت ابوبکر رضؓ خلیفۂ اوّل کی بیٹی اُمّ المومنین عائشہ سربرآوردہ تھیں ایک تو پیغمبر صاحب کی ازواجِ طاہرات میں صرف حضرت عائشہ تھیں جن کے پہلے شوہر پیغمبر صاحب تھے. دوسرے ان کے باپ کے پیغمبر صاحب اور اسلام پر بڑے حقوق تھے کہ وہ سب سے پہلے مسلمان ہوئے تھے اور شروع سے آخر تک برابر جان و مال دونوں سے پیغمبر صاحب کی خدمت میں حاضر. کپڑے کی تجارت کیا کرتے تھے - اور اچھے خوشحال آدمی تھے مگر سارا مال پیغمبر صاحب اور اسلام کی تائید میں خرچ کر کرا کے آخر کو خالی ہاتھ رہ گئے ہجرت کے اُس نازک اور جان جوکھوں کے وقت میں کہ کافروں نے پیغمبر صاحب کے مار ڈالنے کے منصوبے کر لیے تھے اور پیغمبر صاحب بے سروسامان رات کو مکہ سے تشریف لے گئے تھے اور بنظر ظاہر کوئی اُمید نہ تھی کہ صحیح سلامت بچ کر جائیں گے. یہی ابوبکر تھے جنھوں نے پیغمبر صاحب کا ساتھ دیا. مخالف جو چاہیں سمجھیں اور جو چاہیں کہیں ان واقعات کو کون مٹا سکتا ہے. کہ پیغمبر صاحب نے نکاح بھی کئے تو ایسے وقت کئے جب جوانی کی شورش فرو ہو چکی تھی. اور اکثر بیواؤں کے ساتھ اور ایسیوں کے ساتھ کہ اُن کے حالات پکار رہے کہتے ہیں کہ ان کو زوجیت میں لینا ان کے حفظ مرتبت کے لئے تھا، یا ان کی دلجوئی کے لئے. یا اسلام کی خاطر ان کے میکے والوں کی استمالت کے لئے. بہرکیف پیغمبر صاحب کی ازواجِ طاہرات میں سے حضرت عائشہ رضؓ سب میں سربرآوردہ تھیں. اُدھر حضرت فاطمہ رضؓ تھیں تو بیٹی مگر عائشہ سے عمر میں بڑی صاحب اولاد کہ ان ہی سے پیغمبر صاحب کی نسل چلی اور سید کہلائے پھر بیٹی بھی کس ماں کی تھیں؟ خدیجۃ الکبریٰ رضؓ کی جن کے احسانات اور حسنِ معاشرت کو پیغمبر صاحب جب تک جئے ہمیشہ یاد کیا کئے. غرض عورتوں میں سے حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت فاطمہ رضؓ کو پیغمبر صاحب کے ساتھ پرلے درجے کی خصوصیت تھی اور ان دونوں میں بتقاضائے بشریت ایک طرح کی کشیدگی رہا کرتی تھی. حضرت عائشہ کا حال

یہ تھا کہ پیغمبر صاحب نے بیبیوں کی باری باندھ رکھی تھی۔ لیکن دل پر تو کسی کا قابو نہیں چلتا۔ لوگوں کو میلانِ طبع معلوم تھا۔ اُم المومنین سودہؓ نے تو اپنی باری تک بطوعِ خاطر حضرت عائشہؓ کو دے دی تھی۔ اور میل ملاپ والوں میں کسی کو کچھ تحفہ تحائف بھیجنا ہوتا تو عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری کا انتظار کرتے۔ جانتے تھے کہ پیغمبر صاحب کی اصلی بی بی وہی ہیں۔ اُدھر حضرت فاطمہؓ تھیں تو بیٹی مگر جب والد بزرگوار کی خدمت میں تشریف لاتیں تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ بیٹھنے کو اپنی ردا بچھا دیتے۔ گھنٹوں تخلیہ کرتے۔ ان دونوں کا رشتہ ہی ایک دوسرے سے کشیدہ رہنے کا تھا۔ سیر میں ان لوگوں کے حالات پڑھو تو وہ لوگ بھی ہم ہی جیسے آدمی تھے ہم ہی جیسی طبیعتیں۔ اسلام نے ان کے معتقدات کو بدلا تھا، اُن کے معلومات کی اصلاح کی تھی نہ اُن سے انسانیت اور بشریت سلب کر لی تھی لا تبدیل لخلق اللہ[1] پیغمبر صاحب کی ازواجِ طاہرات میں قریب قریب اسی طرح کے محاسدات تھے جیسے اس زمانے کی سوکنوں میں ہوتے ہیں۔ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اگر زندہ ہوتیں اور پیغمبر صاحب اُن کی زندگی میں عائشہؓ کے ساتھ نکاح کر لیتے تو دونوں میں سوکنات کا رشتہ ہوتا۔ اب حضرت فاطمہ اپنی ماں کی قائم مقام تھیں اور عائشہ سے اُن کی رُکاوٹ بدی ہوئی بات تھی۔ پس اب یہیں سے فیصلہ کر لو کہ ان دونوں کی رُکاوٹ اور کشیدگی کو خود ان دونوں کے اسلام میں پیغمبر صاحب کی پیغمبری میں ہم امتیوں کے دین و مذہب میں کیا دخل ہے۔ اگر ایسی ایسی باتوں سے اسلام جانے لگا تو دنیا میں نہ کبھی کوئی مسلمان تھا نہ کوئی اب ہے اور نہ کوئی آئندہ ہوگا۔ مسلمانان در گور مسلمانی در کتاب اور اچھا فرض کیا اسلام جاتا رہا تو کس کا؟ انھیں کا جو ایک دوسرے سے کشیدہ رہے پیغمبر تک اس کا اثر کیوں متعدی ہونے اور پھر آٹے کے ساتھ ہم بیچارے اُمتیوں کا گھن کیوں پیسا جانے لگا، غضب خدا کا خدا کو ایک مانیں، پیغمبر اور قرآن اور آخرت سب کو برحق، نمازیں پڑھیں، روزے رکھیں، حج کریں، زکوٰۃ دیں اور پھر دوزخی کے دوزخی کیوں؟ اس لئے کہ عائشہؓ اور فاطمہؑ ایک

---

[1] خدا کی دی بنائی ہوئی بناوٹ میں رد و بدل نہیں ہو سکتا۔

دوسرے سے روٹھی رہتی تھیں۔ اچھا پھر ہم کیا کریں؟ ہمارے اختیار کی بات ہے؟ ہم نے ان کو لڑوایا؟ اب ہم ان کا ملاپ کرا سکتے ہیں؟ پیغمبر صاحب نے ان کو ملانا چاہا تب تو ملیں ہی نہیں۔ عائشہ رض تو فاطمہ رض کا کیا کر سکتی تھیں کیونکہ فاطمہ رض کو پیغمبر صاحب کے ساتھ نسبت جزئیہ تھی مگر ان افک عائشہ رض کے موقع پر فاطمہ رض کے شوہر حضرت علی رض نے پیغمبر صاحب کو عائشہ رض کے چھوڑ دینے کی ضرور صلاح دی تھی۔ عورت کو گھر کے اجڑنے کا بڑا صدمہ ہوتا ہے اور پھر گھر بھی عائشہ رض کا سا گھر کہ دین کی پیغمبری اور دنیا کی بادشاہت۔ عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں تو پیغمبر صاحب کی بیوی مگر پھر بھی تھی تو آدمی ممکن نہیں کہ ان کو حضرت علی کی صلاح کی خبر نہ ملی ہو۔ اور خبر ملے پیچھے جیسا کچھ ملال ان کو علی رض کی طرف سے ہوا ہوگا اور رہا ہوگا ظاہر۔ پھر اس سے انکار ہو نہیں سکتا کہ حضرت علی رض خلافت کے دعویدار ضرور تھے اور کیوں نہ ہوتے؟ پیغمبر صاحب کے بعد داماد کہو، بیٹا کہو، بھائی کہو، یہی تھے۔ اور چند در چند قرابتوں کے علاوہ علم و فضل اور شجاعت میں بھی کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔ اور سب استحقاق ایک طرف اور فاطمہ رض کا موجود ہونا ایک طرف۔ کوئی ہے جو اتنے استحقاقوں کے ہوتے سلطنت جیسی چیز کو چھوڑ بیٹھے؟ اور یہ نہ صرف حضرت علی رض کا خیال تھا بلکہ سیر اور احادیث کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر صاحب کے تمام قرابت مندان جدی کا یہی خیال تھا۔ دوسرے دعویدار بھی کہیں سے رستہ چلتے نہیں آ گئے تھے۔ ان کو بھی پیغمبر صاحب کے ساتھ طرح طرح کی خصوصیتیں تھیں اور سب پر فائق یہ کہ اس وقت کا رنگ دیکھ کر اپنی کامیابی کا یقین رکھتے تھے چنانچہ کامیاب ہوئے بھی۔ شاہجہاں بادشاہ چار بیٹے چھوڑ کر مرا تھا کوئی حمایت شاہی کی طرفداری پر نازاں تھا۔ کوئی ارکین سلطنت سے ملا ہوا تھا۔ کسی کو اس کا گھمنڈ تھا کہ میں عین وقت پر بادشاہ پاس ہوں اور آسانی سے خزانہ اور قلعہ اور لوازم شاہی پر قبضہ کر سکتا ہوں۔ کوئی اپنی تدبیر اور حکمت عملی پر بھروسہ رکھتا تھا یعنی سب سے چھوٹا عالمگیر۔ اور آخر کار اسی کے سامنے کسی کی بھی نہ چلی۔ میں خیال کرتا ہوں کہ خلافت اسلامی کا بھی یہی حال ہوا۔ لے اڑے وہ جو اس کے لے اڑنے کی تدبیر کر سکتے تھے اور ان کے بعد کی کارروائیوں نے ثابت کر دیا

کہ وہ اس کے اہل بھی تھے - اس بات کو تو عقل قبول نہیں کر سکتی کہ پیغمبر صاحب نے کسی کو تعیین، و تخصیص اپنا جانشین کیا ہو۔ جو شخص ایک نیا مذہب چلا کر لوگوں سے سینکڑوں ہزاروں برس کے معبودوں کی پرستش ان کے عزیزان کے مال و اسباب ان کے وطن چھڑوا دے، جو شخص تمام جزیرہ عرب بلکہ تمام دنیا میں ایک تہلکہ مچا دے، جو شخص ہزاروں لاکھوں خون کرا دے، اُس کو اپنے جانشین کا تسلیم کرا دینا کیا مشکل تھا؟ اُس کو اپنے اتباع پر وہ اقتدار حاصل تھا جو کسی بادشاہ کو گو وہ کیسا ہی جابر اور زبردست کیوں نہ ہو نہ کبھی حاصل ہوا اور نہ کبھی حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ لوگوں کی نہ صرف اس چند روزہ زندگی پر حکومت کرتا تھا، انما تقضی ھٰذہ الحیٰوۃ الدنیا بلکہ اُس آنے والی ابدی لازوال زندگی پر بھی۔ وہ نہ فقط جسموں کے ہلاک کر دینے پر قادر تھا بلکہ روحوں کے تباہ کر دینے پر بھی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا ہے کہ پیغمبر صاحب آدمی تھے کثیر العلائق (میں نے آدمی بھی ڈرتے ہی ڈرتے کہا ہے) بہتیروں کے ساتھ طرح طرح کی خصوصیتیں رکھتے تھے اور کبھی کبھی اظہار احسان مندی یا دل دہی کے طور پر تحسین اور شاباش کی ضرورت واقع ہوتی تھی۔ اُس کو کسی نے جانشینی کی بشارت سمجھ لیا ہو تو اس کی خوشی، جو شخص سب سے زیادہ پیغمبر صاحب کی وفات سے متاثر ہی ہوا وہ فاطمہ رضؓ تھیں۔ والدہ پہلے انتقال فرما چکی تھیں۔ اب ماں اور باپ دونوں کی جگہ پیغمبر صاحب تھے اور باپ بھی کیسے باپ؟ دین و دنیا دونوں کے بادشاہ۔ ایسے باپ کا سر پر سے اُٹھ جانا۔ اس پر حضرت علیؓ کا خلافت سے محروم رہنا، اور نکت بر جراحت ترکہ پدری باغ فدک کا دعویٰ کرنا اور مقدمے کا ہار جانا کسی دوسرے کو ایسے پیہم صدمات پہنچتے تو وہ زہر کھا کر مر رہتا۔ مگر اُن کے صبر و ضبط اُن ہی کے ساتھ تھے۔ پھر بھی ان ہی رنجوں میں گھُل گھُل کر چھ مہینے کے اندر اندر انتقال فرما گئیں اور جتنے دن زندہ رہیں اُن لوگوں سے جنھوں نے ان کو رنج دیئے تھے نہ بولیں نہ بات کی، یہاں تک کہ ان لوگوں کو اپنے جنازے پر آنے کی بھی منا ہی کر دی اور شب کے وقت مدفون ہوئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مانا کہ ان کا غصہ کسی قدر بیجا بھی ہو تاہم اُن کے باپ کے حقوق کیا چاہتے تھے۔ فاطمہ رضؓ کے دل غمزدہ کی خوشی کرنے کے لئے علیؓ کو اگر وہ اہل

بھی نہیں تھے برائے نام خلافت دیدی ہوتی اور انتظام کیا ہوتا۔ خیر خلافت تو کون دیئے دیتا تھا۔ مگر باغِ فدک کے دیدینے میں ایسی کونسی قباحت تھی۔ غایت مافی الباب حدیث نحن معاشر الانبیاء لا نورث ولا نورث ماترکنا صدقۃ کے خلاف ہوتو ہو۔ گناہ اگر ہوتا تو فاطمہؓ کو ہوتا کہ وہ سیدانی ہوکر صدقہ کھائیں۔

سخت افسوس کی بات ہے کہ اہل بیت نبوی کو پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد ہی سے ایسے ناملائم اتفاقات پیش آئے کہ اُن کا وہ ادب اور لحاظ ہونا چاہیئے تھا اُس میں ضعف آگیا اور شدہ شدہ منجر ہوا اُس ناقابل برداشت واقعہ، کربلا کی طرف جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے وہ ایسی نالائق حرکت مسلمانوں سے ہوئی ہے کہ اگر سچ پوچھو تو دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہیں ہے ہم کو تو اس واقعے کا خیال کرکے وہ یہود کا فلم تقتلون انبیاء اللّٰہ ان کنتم مومنین یاد آجاتا ہے۔ کیا بات کا بتنگڑ بن گیا کہ کچھ کہتے نہیں بن پڑتی۔ عیسائی بڑے شدومد کے ساتھ اسلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے عورتوں پہ پردے کی قید لگا کر اور مردوں کو متعدد نکاحوں کی اجازت دے کر عورتوں کے حقوق کو بالکل پامال کر دیا اور مسلمانوں کی بییاں بہو بیٹیاں لونڈیوں سے بدتر۔ ہوئی نہ ہوئی برابر۔ مگر ایسی ہوئی نہ ہوئی برابر ہیں کہ اُن عورتوں ہی کی وجہ سے مسلمان سُنی اور شیعہ دو فریق ہو رہے ہیں ایک دوسرے کے مخالف۔

سوال- اچھا پھر آپ سُنی ہیں یا شیعہ؟

جواب- نرا مسلمان۔ نہ سُنی نہ شیعہ۔ سُنی شیعہ بننے کا اب وقت نہیں رہا۔ آج کو وہ لوگ زندہ ہوتے جو اصل میں ایک دوسرے سے لڑتے تھے تو میں تم کو دکھاتا کہ میں سُنی ہوں یا شیعہ۔

سوال- وہ تو اب کیا زندہ ہوسکتے ہیں مگر فرض کیجئے کہ آپ اُس زمانے میں ہوتے تو آپ کیا ہوتے؟

جواب- جو شخص واقعات کو مذہب میں نہ آنے دے وہ مفروضات کو مذہب میں کیوں

دخل دینے لگا ؟

سوال ۔ یہ تو ٹالنے کی سی باتیں ہیں ۔

جواب ۔ میں ٹالتا تو نہیں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں ایسے فضول بکھیڑوں کو مذہب سے متعلق نہیں سمجھتا ۔

سوال ۔ تو یوں کہیئے کہ آپ کی رائے سُنّی شیعہ کسی سے نہیں ملتی ۔

جواب ۔ پوری پوری تو سُنّی شیعہ کسی کی رائے سے بھی نہیں ملتی ۔

سوال ۔ مہربانی فرماکر اس کی ذرا صراحت کیجئے ۔

جواب ۔ دنیا کے اعتبار سے تو میں شیعہ ہوں یعنی اگر میرے ہوتے وہ واقعات پیش آئے ہوتے تو میں غالباً اہلِ بیت کا ساتھ دیتا ۔ نہیں معلوم اُس میری یہ رائے ہوتی یا نہ ہوتی مگر جہاں تک ان جھگڑوں کے حالات مجھکو معلوم ہوئے ہیں اگر بس یہی ہیں تو میں تو مر جاتا اور حضرتِ فاطمہ کی آنکھ پر میل نہیں آنے دیتا اور جو کچھ وہ فرمائیں بجا یا بجا سر ہو اُس میں فرق نہ کرتا ۔ اسلامی سلطنت رہتی یا جاتی اور جاتی ہی کیوں ۔

سوال ۔ بھلا آپ کی شیعت تو معلوم ہوئی اب یہ فرمائیے کہ آپ سُنّی کیوں کر ہیں ؟

جواب ۔ ہاں سُنّی اس طرح پر ہوں کہ جو لوگ خلافت پر قابو پاگئے جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اُن کو بھی اسلام کا خیر خواہ اور نہ صرف خیر خواہ بلکہ محسن سمجھتا ہوں اور کسی طرح کی نیت بد اُن کی طرف منسوب نہیں کرتا اور نہیں کر سکتا ۔

سوال ۔ تو آپ کٹے سُنّی ہیں پھر آپ اپنے تئیں کس بات میں مستثنیٰ کرنا چاہتے تھے ؟

جواب ۔ اس بات میں کہ سُنّی ان جھگڑوں کو جزو دین قرار دیتے ہیں اور مجبور ہو کر اُن کو واقعات سے انکار کرنا پڑتا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں میں کسی طرح رنجش اور کشیدگی اور رُکاوٹ تھی ہی نہیں ۔ لیکن میرے نزدیک یہ انکار بداہت ہے ۔ میں کہتا ہوں تھی اور ضرور تھی اور ہونی چاہئے تھی ۔ اور آخر کار وہ ظاہر ہوئی پر ہوئی ۔ اور بُری طرح پر ہوئی لیکن اس کو

دین سے کچھ سروکار نہیں ۔ نہ ہمارے دین سے اور نہ خود ان کے دین سے ۔ لوگوں نے خدا میں اور رسول میں اور دین میں اور دنیا میں عجیب خلط مبحث کر رکھا ہے ۔ پیغمبر میں وہ تقدس چاہتے ہیں جو خدا کے ساتھ خاص ہے ۔ فرشتوں کو بھی اُس کی ہوا نہیں لگی اور نہ صرف تقدس بلکہ ایک طرح کی خدائی ۔ خدا اور رسول کو تو ایسا گڈمڈ کیا ہے کہ دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہے ، وہی یہود اور عیسائیوں کا سارنگ ہے کہ اُنھوں نے اپنے پیغمبروں کو اتنا بڑھایا اتنا بڑھایا کہ بیٹا بنا کر خدا کی گود میں جا بٹھایا ۔ مسلمانوں نے بھی باوجودیکہ سارے قرآن سے توحید پڑی نچڑ رہی ہے اور پیغمبر صاحب نے بھی اس کی رخنہ بندیوں میں کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا ۔ قبر شریف کی نسبت بتاکید فرماتے رہے کہ خبردار جو میری قبر کو مسجد بنایا ہوگا ، اُن کو کیا خبر تھی کہ اُن کی اُمت کے کتنے بزرگوں کی قبریں مسجدیں بنائی جائیں گی ، لوگ مرے ہوئے بزرگوں کو سجدے کریں گے ۔ اُن سے حاجتیں مانگیں گے ۔ صحابہ میں بعض لوگ ملک فارس کے بادشاہوں کا ادب اور قاعدہ دیکھ کر آئے تھے ۔ چاہا کہ اسی طرح کی تعظیم پیغمبر صاحب کی کریں ۔ یہاں تعظیم کے لئے لوگوں کا سروقد کھڑا ہونا بھی ناگوار تھا کہ کہیں تعظیم کی عبادت نہ بن جائے ۔ کسی بات کی نسبت ایک شخص کے منہ سے نکلا اگر خدا اور اس کا رسول چاہے (اور یہ کلام اب ہم لوگوں کا روزمرہ ہے) آپ نے سخت ناخوش ہو کر فرمایا کہ تم مجھ کو خدا کا شریک بناتے ہو ۔ غرض باوجودیکہ سارے قرآن سے توحید پڑی نچڑ رہی اور پیغمبر صاحب نے بھی اس کی رخنہ بندیوں میں کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا اُس پر بھی مسلمان احمد بلا میم کے تو کہہ گذرے (احد ہے) کہ یہ ابن اللہ سے بڑھا ہوا ہے ۔ پیغمبر صاحب سچ فرمایا کرتے تھے کہ مسلمانو تم چپے چپے اہل کتاب کے قدم بقدم چلا کرو گے ہو رہا ہے ۔ اودھر تو خدا اور رسول کے ایک ذات کر دینے کے پیچھے پڑے ہیں اور اُدھر دنیا اور دین میں ایسا بیر ڈال رکھا ہے کہ کسی طرح دونوں میں التیام نہیں ہو سکتا ۔ ایسے ایسے بکھیڑے دین کو لازم کئے جائیں گے تو وہ دین اختلاف سے محفوظ نہیں رہ سکتا ۔ دین کی نسبت میں نے جو اپنا خیال ظاہر کیا تمہاری تسکین کے لئے اس کی سند میں ایک حکایت بیان کرتا ہوں کہ جنگ اُحد

تو سنی ہوگی، اُس لڑائی میں مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ گئے تھے۔ یہ گرے لوٹ پر۔ کفار نے کمین میں سے نکل کر اُن پر تیروں کی ایسی رَو برسائی کہ بھاگتے ہی بن پڑی اور بھاگے بھی تو ایسے بدحواس ہو کر کہ پیغمبر صاحب کی بھی خبر نہ لی۔ اُسی گھبراہٹ میں کسی دشمن نے یہ بھی اُڑا دی کہ خدانخواستہ پیغمبر صاحب تو شہید ہوئے۔ اس سے مسلمانوں کو اور بھی بے دلی ہوئی کہ اب کہاں کا دین اور کہاں کا اسلام ناحق اپنے لوگوں سے بھی کیوں بگڑے۔ اُدھر پیغمبر صاحب شہید تو نہیں ہاں زخمی ہوئے تھے اور گو لشکر منتشر ہو گیا تھا مگر پھر کچھ آدمی پیغمبر صاحب کے ساتھ لڑنے مرنے کو تیار تھے۔ آخر پیغمبر صاحب کے چچا حضرت عباسؓ نے کہ وہ بڑے جہیر الصوت آدمی تھے خوب زور سے للکارا کہ لوگو کدھر بھاگے جاتے ہو پیغمبر صاحب تو یہ موجود ہیں ادھر آؤ اس آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ سارے مسلمان سمٹ آئے۔ سب نے مل کر کفار پر حملہ کیا اور مار ہٹایا اس لڑائی کا قرآن میں کئی جگہ مذکور ہے ایک مقام پر فرماتے ہیں وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم ومن ینقلب علیٰ عقبیه فلن یضر الله شیئا[1] یعنی محمد ہیں بریں نیست۔ ایک رسول ہیں ان سے پہلے بھی رسول ہو چکے ہیں تو اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں تو کیا تم اُلٹے پاؤں اُسی شرک وبت پرستی کی طرف پھر لوٹ جاؤ گے اور جو اُلٹے پاؤں شرک وبت پرستی کی طرف پھر لوٹ جائے گا تو وہ خدا کا کیا بگاڑے گا۔ اس سے یہ بات نکلی کہ دین خدا کا ہے۔ اور پیغمبر صاحب کو خدا نے دین کی تعلیم کے لئے مامور فرمایا تھا۔ اگر وہ دنیا میں نہ بھی ہوں جیسا کہ سخت افسوس ہے کہ وہ تیرہ سو برس سے نہیں ہیں تاہم ان کے نہ ہونے سے دین میں کسی طرح کا خلل واقع ہونا نہیں چاہئے۔ بس اب تم آپ انصاف کر لو کہ پیغمبر صاحب کے حواریوں اور شاگردوں اور رفیقوں

---

[1] اور محمد اس سے بڑھ کر اور کیا کہ ایک رسول ہیں اور بس ان سے پہلے (اور) بھی رسول ہو گذرے ہیں اگر (محمد) اپنی موت سے مر جائیں یا مارے جائیں تو کیا تم اُلٹے پیروں (کفر کی طرف) پھر لوٹ جاؤ گے اور جو اُلٹے پیروں کفر کی طرف لوٹ جائیگا وہ خدا کا تو کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔

اور عزیزوں کی باہمی شکر رنجیوں اور کشیدگیوں کو دین میں کیا دخل ہو سکتا ہے اور یہیں سے یہ بھی سمجھ لو کہ پیغمبر صاحب کے بعد دین کے لیے کسی نائب یا خلیفہ یا امام کی بھی ضرورت ہے یا نہیں"۔

فرقۂ صوفیہ

صادق:۔ "یہ تو بڑا بھاری جھگڑا تھا اور آپ نے بڑی ہی آسانی سے اس کو طے کیا میرے دل کو تسکین ہو گئی۔ جزاک اللہ خیراً۔ اسی طرح کوئی بیان شافی صوفیوں اور مشائخوں کے بارے میں بھی فرما دیجئے تو میں شاید آپ کو زیادہ تکلیف نہ دوں ہر چند سنی شیعوں کا سا اختلاف تو نہیں مگر خدا ایک رسول ایک قرآن ایک پھر یہ الگ الگ فرقے کیسے؟"

بزرگ:۔ "لوگ تو مولویوں کے ڈر کے مارے اپنے مذہبی خیالات کے ظاہر کرنے میں مضائقہ کیا کرتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کفر کا فتویٰ جاری کر دیں اور تم چاہتے ہو کہ صرف مولوی نہیں تمام اسلامی فرقے اور ہندو اور عیسائی اور یہود غرض ساری دنیا مجھ کو کافر بنائے کیوں کہ میری مت کسی سے نہیں ملتی۔ میری مت تو یہ ہے کہ میرے سوائے کسی کا مذہب ٹھیک نہیں اور سب کا ٹھیک ہے"۔

صادق:۔ "یہ تو عجب بات ہے"۔

بزرگ:۔ "بے شک عجیب ہے، مگر اسی وقت تک کہ تم نے اس کو سمجھا نہیں۔ سمجھے پیچھے کچھ بھی عجب نہیں"۔

صادق:۔ "تو میں سمجھ بھی چکا"۔

بزرگ:۔ "اجی تم سمجھو اور تمہارا اچھا سمجھے۔ بات معقول ہو اور بیان کرنے والا سمجھانے پر قادر تو کیوں نہ سمجھو"۔

صادق:۔ "بھلا فرمائیے تو سہی"۔

بزرگ:۔ "میرے نزدیک مذہب شخصی چیز ہے یعنی ہر شخص اپنا مذہب رکھتا ہے

نفسی نفسی لاتذر وازرۃ وزر اخری یوم یفر المرء من اخیہ وامہ وابیہ وصاحبتہ و بنیہ لکل امرء منھم یومئذ شان یغنیہ ان باتوں سے کیا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کا عقیدہ یا عمل اس کے سوائے کسی دوسرے کا کام نہیں۔ میرا مذہب میرے لئے ٹھیک ہے اس لئے کہ اس سے مجھ کو اطمینان ہے اور میں اس کے ذریعہ سے نجات آخرت کی امید رکھتا ہوں۔ رہے دوسرے لوگ مجھ کو ان کے مذہب سے تعرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور چوں کہ ان کے مذہب میرے کام نہیں آسکتے ہیں ان کو اپنے لئے کیوں کر ٹھیک کہہ دوں کانپور میں ایک شخص نے کسی پلٹن کے موزوں کا ٹھیکہ لیا۔ وہاں چمڑے کا کام نہایت عمدہ ہوتا ہے موزے تیار ہوگئے تو وہ ان کو پلٹن کے سارجنٹ کے پاس لے گئے جس کی پسند پر موزوں کا پاس ہونا موقوف تھا۔ وہ سارجنٹ تھا ذرا خوش مزاج سا آدمی۔ ٹھیکہ دار صاحب نے پوچھا کیوں صاحب سب ٹھیک ؟ سارجنٹ نے کہا سوائے اس ایک کے جو تم میرے لئے بنوا کر لائے ہو کوئی بھی ٹھیک نہیں ہے۔ یہ سن کر وہ ٹھیکہ دار بہت سٹ پٹایا۔ آخر کو سارجنٹ نے کہہ دیا کہ اور سب موزوں کو نادرست بتانے سے اس کا کیا مطلب تھا۔ جیسے میں نے تم کو سمجھا دیا کہ میں دوسرے مذہبوں کو کسی غرض سے کہتا ہوں کہ ٹھیک نہیں ہے"

صادق "بات تو معقول ہے۔ اچھا آپ نے سب کو ٹھیک کیوں کر کہا؟"

بزرگ "یہ بھی بتا ہی دوں ؟ سب کو ٹھیک کہا کل حزب بما لدیھم فرحون کے لحاظ سے ہر شخص عقل رکھتا ہے اور جتنی جیسی جس کی عقل ہے۔ ویسی ہی اس سے بازپرس ہے لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا ان اللہ لا یظلم الناس شیئا۔"

صادق "خیر یہ بات تو ذہن میں جمتے ہی جمے گی۔ صوفیوں اور مشائخوں کے بارے

۱؎ اور (قیامت کے دن) کوئی شخص کسی دوسرے کا بار گناہ اپنے اوپر نہیں لے گا ۲؎ جس دن ایسی نفسی نفسی سے پڑے گی آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی جورو اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا ان رشتہ داران میں سے ہر شخص کو اس دن (اپنی اپنی نجات کا فکر لگا ہوگا)۔

میں تو اپنی رائے بیان کیجئے۔ کہ مسلمانوں میں ان کا بھی ایک بڑا گروہ ہے"۔
بزرگ "میں تم سے کتنی بار کہوں اور کیوں کر کہوں کہ اپنے نفس کے سوائے کسی کے مذہب کی نسبت بُری یا بھلی رائے نہیں دینی چاہتا۔ نہ اس کی مجھ کو ضرورت۔ اور نہ اس کا مجھ کو کوئی حق۔ مذہب ایک معاملہ ہے بین اللہ و بین العبد جس میں کسی دوسرے کو کچھ دخل نہیں۔ مذہب کا سارا مدار ہے نیت پر اور خدا کے سوا کوئی کسی کی نیت سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔" ؎

بر آستانۂ میخانہ گر سرے بینی　　　مزن بپائے کہ معلوم نیست نیت او

صادق "یہ سچ ہے۔ ولکن لیطمئن قلبی۔
بزرگ "مذہب کے سارے اختلافات پیدا ہوئے ہیں انسان کی خاص طرح کی بناوٹ سے اور اس میں جو مصلحت ہے اس کا سمجھنا مقدور بشر نہیں۔ انسان کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن یا ایک جسم اور ایک روح دونوں میں جو تعلق ہے وہ بھی اسرار الٰہی میں سے ایک بھید ہے جو کسی پر منکشف نہیں قل الروح من امر ربی بہر کیف شارع نے انسان کے ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اور قرآن جیسے نماز روزے کی تاکید کرتا کہ یہ اعمال ظاہر ہیں ویسے ہی حسد کی، غیبت کی، مردم آزاری کی، بخل کی، حرص کی، بے صبری کی، خود غرضی کی، بے حیائی کی باتوں کی سخت مذمت کرتا اور اس کو جس میں یہ عادتیں ہوں مستوجب عذاب الٰہی قرار دیتا ہے۔ اسلام نہ صرف اس کا نام ہے کہ آدمی اپنا ظاہر درست کرے بلکہ باطن بھی۔ خدا نے یہاں تک تو فرما دیا ہے وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ[1] اور واقع میں پہلے دل میں ارادہ پیدا ہوتا ہے تب اسی کے مطابق افعال سرزد ہوتے ہیں۔ باطن کی اصلاح کے بدون ظاہر کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر کسی خبیث درخت کو دور کرنا چاہتے ہو تو اس کو جڑ سے اکھاڑ

---

[1] اور جو تمہارے دل میں ہے چاہے اس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے ہی گا۔

پھینکو ورنہ ٹہنیوں کے قلم کر دینے سے تو پھر کونپلیں پھوٹیں گی اور شاید زیادہ زور سے تو مسلمانوں کو چاہیئے تھا کہ ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح کو ساتھ ساتھ لیئے چلتے بلکہ اصلاحِ باطن کا زیادہ اہتمام کرتے لیکن ایک تو اصلاحِ باطن نفوس پر زیادہ شاق ہے۔ اور دوسرے خبث باطن پر کسی کو آگہی ہو نہیں سکتی کہ لوگوں کی ملامت یا حاکم کی سزا کا ڈر ہو پس لوگوں نے آسان بات پکڑ لی اور ہمتیں صرف اصلاحِ ظاہر میں مقصور ہو کر رہ گئیں مولوی لوگ جو وعظ و احتساب کی خدمت میں لے کر بیٹھے تھے ان کی نظریں بھی لوگوں کے ٹخنوں پر پڑ کر رہ گئیں، کہیں ڈھکے ہوئے تو نہیں یا بڑی بلند پروازی کی تو داڑھی مونچھوں کی تراش خراش کو دیکھا یا ایسا ہی کسی کے سر پر شیطان سوار ہوا تو اُس کے گردے کو تاڑ لیا۔ دین کی دیکھ بھال جانچ پڑتال ہو چکی لیکن بعض اللہ کے ولی ایسے بھی تھے جو افسوس کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ دین کے جزو ضروری یعنی اصلاحِ باطن سے بالکل قطع نظر کیا جا رہا ہے۔ اُنھوں نے صوفیائے کرام کا سلسلہ جاری کر کے دین میں جو ایک بڑا رخنہ پڑ گیا تھا اس کو بند کرنا چاہا یعنی ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ تھے حقیقت میں اسلام کے بڑے رفارمر لیکن حضرت انسان ہیں بے پینیدی کے بدھنے۔ ان سے ایک وضع پر کیا رہا جاتا ہے اصلاحِ باطن کی آڑ پکڑ کر شرعِ ظاہر کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اب مولویوں نے یعنی علمائے ظاہر میں اتنی خرابیاں نہیں جتنی کہ ان مشائخ مدعیانِ صوفیہ میں ہیں ع، بد نام کنندۂ نکو نامے چند :: انہوں نے تو کچھ ایسا طریقہ اختیار کیا ہے کہ جس سے اسلام ہی بیخ و بن سے متزلزل ہوا جاتا ہے یعنی موافق اور مخالف ساری دنیا جانتی ہے کہ خدا کو دین و مذہب کے متعلق جو کچھ اپنے پیغمبر کی زبان سے کہلوانا منظور تھا وہ بجنسہ حرف بحرف قرآن میں لکھا ہوا موجود ہے پس قرآن مجید مسلمانوں کا مذہبی کوڈ یعنی مجموعۂ قوانین ہے۔ رہی حدیث، تفسیر، فقہ یہ بمنزلہ تشریحات اور نظائر کے ہیں۔ پھر پیغمبر صاحب نہیں بھیجے گئے تھے کسی گروہ خاص کی طرف بلکہ روئے زمین کے تمام آدمیوں کی طرف جہاں نبوت کا بلاوا پہنچے ما ارسلنٰک الا کافۃ للناس اور ان کی تعلیم بھی عام تھی جیسی انہوں

کو ویسی غیروں کو، جیسی شہری کو ویسی دیہاتی کو، جیسی پڑھے لکھوں کو ویسی ہی ان پڑھوں کو، جیسی مردوں کو ویسی عورتوں کو، اور بالیقین معلوم ہے کہ پیغمبر صاحب کو جو حکم ہوتا تھا بے کم و کاست ہو بہو سنا دیتے تھے، لکھوا دیتے تھے۔ یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ[1]۔ بعض مقامات میں تادیب کے طور پر پیغمبر صاحب کو زجر ہے جیسے عبس وتولیٰ ان جاءہ الاعمیٰ[2] بعض جگہ ان کے ایسے حالات کا بیان ہے جن کو آدمی ظاہر اور مشتہر کرنے میں مضائقہ کرتا ہے۔ جیسے قصہ افک عائشہ رض اور نکاح زینب رض۔ کونسا ایسا بے انصاف ہٹ دھرم ہوگا جو ان واقعات کے ہوتے ایک لمحے کے لئے تبلیغ وحی کے بارے میں پیغمبر صاحب کو متہم کر سکے۔ وہ خود فرماتے ہیں لن[3] اجد من دونہ ملتحدا الا بلاغا من اللہ و رسالتہ۔

صادق "۔ اچھا پھر ان مشائخین نے یہ کیا طرز تعلیم اختیار کیا ہے جس کی فری میسنوں کی ذاری پردہ داری ہے۔ اس تعلیم کو کہتے ہیں کہ سینہ بہ سینہ چلی آتی ہے۔ بہر کیف قرآن حدیث سے خارج ہوئی۔ اور خارج ہوئی تو داخل اسلام کیوں مانی جائے؟"

بزرگ:۔ "ہم تو اصول مذہب کی رو سے بدعت کے سوائے اس کا کوئی اور نام رکھ نہیں سکتے اگر اصلاح ظاہر بے اصلاح باطن ریا کاری ہے۔ تو اصلاح باطن بے اصلاح ظاہر کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ علماء ظاہر یعنی مولوی لوگ اگرچہ جیسا چاہیئے اصلاح باطن پر زور نہیں دیتے جیسا چاہیئے اس کا اہتمام نہیں کرتے اور اسی لئے وہ لوگ جو ظاہر شرع کے پابند ہیں ان کے معاملات جیسے چاہئیں درست نہیں ہوتے تاہم ان ظاہر

---

[1] اے پیغمبر جو (احکام) تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئے ہیں (بلا کم و کاست لوگوں کو) پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو (سمجھا جائے کہ) تم نے خدا کا (کوئی) پیغام (بھی لوگوں کو) نہیں پہنچایا
[2] محمد اتنی بات پر چیں بجبین ہوئے [3] اور نہ اس کے سوا کہیں مجھ کو ٹھکانا مل سکتا ہے میرا بچاؤ تو اسی میں ہے کہ خدا کی طرف سے (جو حکم آیا ہے لوگوں کو) پہنچا دوں۔

پرستوں کی اصلاحِ باطن سے انکار تو نہیں۔ پوچھا جائے تو کیا مجال، اصلاحِ باطن کی شان میں توہین کا ایک حرف ان کے منہ سے نکلے اور کیوں کر نکلتا سکتا ہے جب کہ قرآن میں حدیث میں ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح اس طرح ساتھ چلتی ہے جیسے گاڑی کے پہیے۔ وہ بہت کریں گے تو حیل شرعی ایجاد کریں گے۔ جیسے تم نے سنے ہوں گے کہ ایک صاحب، بڑے مالدار تھے اور زکوٰۃ دینے کا حیلہ سوچ رکھا تھا کہ میاں بی بی ٹھیٹرا بدلائی کیا کرتے تھے یعنی جب دیکھا کہ برس پورا ہونے پر آیا میاں نے سارا مال و متاع بی بی کے نام زبانی ہبہ کر دیا۔ بی بی جو نو مہینے سے زیادہ پیٹ میں بچے رکھنے کی روا دار نہ تھیں۔ مال کو برس دن اپنے پاس کیا ٹھیرنے دیتیں۔ غرض وہی مثل تھی گھی کہاں گیا کھچڑی میں۔ زکوٰت بھی نہ دینی آئی اور ظاہر شرع کے صدقے جائیے کہ خدا رسول سے بھی شرمندہ نہ ہونا پڑا منظور نہیں کہ لوگوں سے چار آنکھیں کیجئے۔ ورنہ ہم کو تو ان ہی مولویوں کی جوتیوں کا صدقہ ایسے ایسے مسئلے معلوم ہیں کہ نہ نماز پڑھو، نہ روزہ رکھو، نہ زکوات دو، نہ حج کو جاؤ، جس کا چاہو مال مارو، جس پر جی میں آئے ظلم کرو اور پھر دیندار کے دین دار، بہشت کے مستحق، رضائے الٰہی کے امیدوار خیر تو مولوی لوگ بہت کریں گے تو حیلِ شرعی ایجاد کریں گے۔ مگر اصلاحِ باطن کے سامنے سب سرنگوں ہیں اور سرنگوں ہوئے بدون ان کو بن نہیں آتی لیکن باطن والوں کا ظاہر یعنی شریعت کے ساتھ کیا حال ہے، رسول شاہی، ستھرہ شاہی وغیرہ وغیرہ کتنے گروہ کے گروہ تو ایسے ہیں جنہوں نے شریعت کی مخالفت کو اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ نماز نہ پڑھیں روزہ نہ رکھیں، مسلمانوں کی صورت نبائیں نہ بنانے دیں، کھلے خزانے بھنگ پئیں چرس کے دم لگائیں۔ غرض شریعت کے جتنے احکام ہیں سب سے مستثنیٰ۔ اور طرّہ یہ ہے کہ نادم نہیں۔ احکام شریعت کی نسبت پکارے کہتے ہیں کہ یہ پابندیاں عوام الناس کے لئے ہیں یہود کی طرح کہ وہ اپنے تئیں اَبْنَاءُ اللّٰہِ وَاَحِبَّاؤُہٗ سمجھا کرتے تھے اور ان کو پیغمبر زادگی کا بڑا گھمنڈ تھا۔ یہ لوگ بھی خدا کے ساتھ ایک ادعائی خصوصیت جتاتے ہیں۔ دنیا بھر

آوارہ اور کاہل اور مکار اسی گروہ میں جا کر کھپتے ہیں۔ اور لوگوں کا یہ حال ہے کہ دین اور مذہب کو تو سمجھتے بوجھتے خاک نہیں ان فقیروں کے گرد لٹو ہو رہے ہیں جس کے حقیقت میں یہ معنی ہیں کہ ان کو خدا اور رسول کے کہنے کا اعتبار نہیں۔ دلوں میں یہ وہم بیٹھے ہوئے ہیں کہ باطن کا حال کون جانے ؂

خاکساران جہاں را بحقارت منگر   تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

کیا خبر ہے کہ کون کس مصلحت سے کس حال میں ہے۔ اور لے کاش صرف اسی قدر ہو کہ دوسرے کے دل کا حال معلوم نہیں مصیبت تو یہ ہے کہ ظاہر کے خراب ہونے کو باطن کے آباد ہونے کی شرط قرار دے رکھا ہے۔ حقیقت میں خدا کی رزاقیاں ہیں کہ ان نکموں کو بھی رزق پہنچانا منظور ہے ع چو احمق در جہاں باقی ست مفلس کس نمیماند: اگر سب ہمارے ہی سے خیال کے ہو جائیں تو ملک میں لاکھوں بندگانِ خدا بھوکے مرنے لگیں۔ مگر یہ کیا ستم ہے کہ ان کا دوزخ شکم بھرنے کے لئے سارا ملک بھوکا مرا جاتا ہے۔ ملک کی بے دولتی کے جہاں اور اسباب ہیں ان میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ الفتے ہم کو لوٹے لئے جاتے ہیں، یہ سچ ہے کہ فقرا یا مشائخ کے گروہ میں سب کا ایک رنگ نہیں اور ان میں ایسے بھی ہیں اور وہی خطاب مشائخ کے اہل بھی ہیں جو شریعت کا ادب ملحوظ رکھتے ہیں۔ مگر باوجود اس کے جو ہم دیکھتے ہیں تو نفس اسلام کو مولویوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا کہ مشائخوں سے۔ پہلے یہ تو دیکھو کہ اسلام میں ایسا کونسا سرخاب کا پر لگا ہے جس کا اتنا سارا غل ہے، کوئی ایک عمل ظاہر یا باطن کا بتاؤ جو وہی بایوں ہی سے فرق کے ساتھ ویسا ہی دوسرے دینوں میں نہ ہو اور فرق ہو گا بھی تو اعمالِ ظاہر میں ہو گا۔ جہاں تک دین کو باطن کے ساتھ تعلق ہے بلاتفاوت سب دین ایک ہی طرح کے دکھائی دیتے ہیں جھوٹ کو سب برا کہتے ہیں، مردم آزاری کسی کے یہاں بھی جائز نہیں، وقس علیٰ ہذا پس کوئی تو خصوصیت ہونی ضرور ہے کہ اسلام اس پر ناز کرتا ہوا بھی بھلا لگے۔ یہ پہلی کچھ میں نے ہی نہیں بوجھی کہ ناحق کی شیخی مارنے لگوں۔ مگر ہاں اتنی بات ضرور کہوں گا کہ لوگ اس میں سوچ بچار نہیں کرتے

اور یہی پانی مرنے کی جگہ ہے۔ وہ خصوصیت جس پر نہ صرف اسلام کو بلکہ اسلام کے ہر ایک نام لیوا کو فخر کرنا چاہئیے توحید ہے اور بس کہ خدا کے بارے میں لوگوں کے عقائد بہت ہی ڈانواں ڈول ہو گئے تھے اور اب بھی ہیں۔ سب سے پچھلا مذہب اسلام تھا۔ خدا تا قیام قیامت اس کا بول بالا رکھے اور رکھے گا۔ جس نے آب حیات توحید کو تمام آلائشوں سے فلٹر کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اجی جہاں تک اعمالِ ظاہر پر نظر کرتے ہیں اور جہاں تک انسان کے برتاؤ سے معاملات سے اس کے باطن کا پتہ لگتا ہے ہم تو کسی مذہب میں کسی طرح کی کسر نہیں دیکھتے بلکہ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ بعض صفتیں دوسرے مذہب والوں میں ہم اپنے سے بہتر پاتے ہیں مثلاً ہندوؤں ہی کو لو کہ ان بیچاروں کا مذہب سب سے زیادہ بودا اور پھُس پھسا ہے اور خدا کی مرضی یوں ہوئی کہ ہمارا اُن کا چولی دامن کا ساتھ ہو۔ اگر ہٹ دھرمی نہ کریں تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ رحم جیسا ان میں ہے اس کا عشر عشیر بھی ہم میں نہیں۔ آدمی تو بڑی چیز ہے۔ جانوروں اور درختوں تک کا ستانا بھی اُن کے یہاں منع ہے۔ دیکھتے نہیں کہ یہ لوگ گوشت کو چھوتے تک نہیں۔ گائے بیل کی کیسی خدمت کرتے ہیں۔ سانپ جیسے موذی جانور کو بھی تو مارنا نہیں چاہتے۔ یہی حال ہے درختوں کی حفاظت کا کہ ہرے درخت کی کوئی ٹہنی تک تو توڑے خاص کر پیپل کی۔ بارہا اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ہندو دونے لئے ہوئے چینوٹیوں کے واسطے کھانڈ بکھیرتے پھرتے ہیں۔ ایسا کونسا بازار ہوگا جس میں ہندوؤں کی طرف سے بارہ مہینے پانی پلانے کی پونہ بیٹھی رہتی ہو۔ جانوروں کے لئے جابجا پانی کی نادیں گڑی رکھتے ہیں۔ سدا برت بھی جاری ہیں اور یوں بہتیرا ہی دان پن ہوتا رہتا ہے غرض ایسی بہت سی باتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں دیا ہم سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اور اگر نفس کشی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو عبادتوں میں سب سے زیادہ روزہ بے شک گرمی کے پہاڑ دنوں میں کامل ایک مہینے دن بھر بھوکا پیاسا رہنا کچھ آسان کام نہیں۔ صد آفریں ہے مسلمانوں کو ایسی محنت شاقہ خوش دلی کے ساتھ انگیز کرتے ہیں۔ لیکن کوئی کوئی برت ہندوؤں

یں بھی ایسا کٹھن ہے کہ آدمی کو لتہ کر دیتا ہے اور یوں اور بہت سی ریاضتیں ہیں کہ کرنا تو کرنا دیکھنے سے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کتنے ہندو جوگی نظر پڑے کسی نے تو اُٹھائے اُٹھائے ہاتھ سکھا دیا ہے، کوئی درخت میں اُلٹا پڑا لٹک رہا ہے، ایک کو دیکھا خیر نشتر نہیں تو اچھی خاصی نوک دار کیلیں تختے میں جڑ رکھی ہیں اور اُن پر ہی لیٹا بیٹھتا ہے، اور ایسے تو بہت جو شاید دن رات میں گھڑی دو گھڑی کر بیٹھ جاتے ہوں ورنہ جب دیکھو کھونٹے کی طرح زمین میں جمے کھڑے ہیں۔ بٹھور میں ایک گوسائیں جی تھے جو ہر روز اشنان کرتے وقت ساری انتڑیاں مُنہ کے رستے باہر نکال کر گنگا جلی میں دھوتے اور پھر پیٹ میں اتار لیتے۔ غرض بدن کو ستانے اور اینا دینے کا کوئی پیرایہ نہیں جسے ہندو فقیروں نے اختیار نہ کیا ہو۔ انگریزوں سے ہمارا ایسا میل جول نہیں مگر ریاضت کے طریقے ان میں بھی ہیں۔ ہزارہا عورتیں ہیں جو نن کہلاتی ہیں وہ ساری عمر اپنا بیاہ ہی نہیں کرتیں۔ پادریوں میں بھی ایک قسم کے پادری ہیں جن کو زندگی بھر مجرد رہنا پڑتا ہے۔ اب ایک مُکتی فوج نکلی ہے۔ یہ لوگ ہندو سنیاسیوں کی طرح بڑی ہی مصیبت مند زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک عورت کو دیکھ کر ایسا ترس آیا کہ کہا نہیں جاتا اسکی عمر ایسی کوئی تیئیس کے لگ بھگ ہی ہوگی۔ اصل ولایت زا۔ رنگت ایسی کہ چاندنی پڑنے سے میلی ہو۔ بیچاری مذہب کے خبط میں آکر گاڑھے کی موٹی کھدڑ ساڑھی باندھے ننگے پاؤں گھسٹتی چلی جارہی تھی۔ فتحپوری کے سامنے شام کے وقت نہر کی پٹری پر ہر روز بلا ناغہ ایک نہ ایک پادری ضرور وعظ کہتا ہوتا ہے۔ اور میں بھی چلتے چلتے ادبدا کر تھوڑی دیر کے لئے اس کے پاس ٹھٹک جاتا ہوں۔ وہ وعظ کہتا اور لوگ اُسکے ساتھ بحث کرتے ہوتے ہیں اور میں اُس پادری کے علم اور انکسار کو کھڑا دیکھتا کرتا ہوں۔ بازاری لوگ بے تمیزی سے اسکو بڑی سخت سخت باتیں کہہ گذرتے ہیں اور اس مردِ خدا کی آنکھ پر میل بھی تو نہیں آتا۔

صادق - یہ تو آپ ایسی باتیں کرتے ہیں کہ آدمی اسلام کی طرف سے بد عقیدت نہ ہوتا ہو تو ہو۔

بزرگ - بس اتنے ہی پانی میں تھے ؟ جی یہ دوسرے مذہب والے ریاضت نہیں اپنی بوٹیاں بھی توڑ توڑ کر چیل کوؤں کو کھلادیں تب بھی تو اسلام کی گرد کو نہیں پا سکتے -

صادق - کس بات میں ؟

بزرگ - ہر ایک بات میں جس پہلو کو گھمنڈ ہو -

صادق - ابھی ہندوؤں اور عیسائیوں کو دیا اور نفس کشی اور حلم کی مثالیں آپ نے بیان بیان کیں یہ نیکیاں مسلمانوں میں ہیں تو سہی مگر نہ ایسے درجے کی -

بزرگ - تم نے بھی یہ خیال کیا کہ نیکی حد سے گذر جاتی ہے تو نیکی نیکی نہیں باقی رہتی بلکہ وہ بدی سمجھی جاتی ہے - اخلاق کی کتابوں میں تم نے پڑھا ہوگا مگر اسوقت خیال نہیں رہا کہ کوئی سی بھی صفت لو جبتک اعتدال کے درجے میں ہے صفت ہے اور اعتدال سے ذرا بڑھی ذرا گھٹی عیب ہوئی مثلاً ہم ایک غصہ ہی کو لیتے ہیں کہ خدا نے جتنے جان دار دنیا میں پیدا کئے ہیں ان کی حفاظت کا سامان بھی ان کے ساتھ موجود ہے - کسی کو تو قوت پرواز دیدی ہے کہ کوئی اُس کو پکڑ نہیں سکتا قرآن میں اس بات کو کیسی اچھی طرح بیان کیا ہے - یا ایہا الناس ضرب مثل فاستمعوا له ان الذین تدعون من دون الله لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا له وان یسلبھم الذباب شیئا لا یستنقذوه منه ضعف الطالب والمطلوب ما قدروا الله حق قدره ان الله قوی عزیز فرماتے ہیں لوگ مثال بیان کرتے ہیں اسکو کان لگا کر سنو کہ خدا کے سوائے جن معبودوں کو تم حاجت پڑے پر پکارتے اور ان سے دعائیں مانگتے ہو ان کی بےبسی کا تو یہ حال ہے کہ اگر سارے مل کر بھی ایک مکھی کو پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے اور پیدا کرنا تو خیر بڑا کام ہے اگر مکھی اُن سے کوئی چیز چھین لے جائے تو اس سے چھڑا نہیں سکتے - کیا تو مکھی اور کیا مکھی کی لباط اور کیا تمہارے معبودوں کی کہ ایک مکھی ان کے پکڑے نہ پکڑی جائے - افسوس کہ ان لوگوں نے اللہ کی قدر نہ جانی - اللہ تو بڑا زبردست ہے سب پر غالب - خیر غرض یہ ہے کہ ہر جان دار کی حفاظت کا سامان اس کے ساتھ موجود ہے کسی کو تو قوت پرواز

دیدی ہے کہ کوئی اس کو پکڑ نہیں سکتا۔ کوئی پانی میں روپوش ہے کہ کسی کو نظر نہیں آتا اور نظر آتا بھی ہے تو کس کی بلا کو غرض پڑی ہے کہ پانی میں غوطہ لگائے۔ کوئی ایسا غضب کا بھاگنے والا ہے کہ دو چار چھلانگوں میں یہ جا وہ جا نظر سے غائب۔ کسی کے دانت ہیں کسی کے پنجے ہیں۔ یہاں تک کہ مینہ بوندی اور سردی سے بچنے کے لئے پروں اور بالوں اور ان کا قدرتی واٹر پروف بھی تو جلد بدن کے ساتھ سیا ہوا موجود ہے کہ وقت پر ڈھونڈنا نہ پڑے۔ مگر حضرتِ انسان ہیں کہ چھوٹی موٹی سب سے زیادہ نازک مزاج اور دیکھنے میں بے سامانِ محض تو ان کو سب سامانوں کے بدلے عقل دی اور عقل کے ساتھ غصّے کا ہتھیار کہ یہ سان پر چڑھا ہو تو اس کی کاٹ غضب کی کاٹ ہے۔ ادھر تو بے غصے کام نہیں چلتا کہ یہ نہ ہو تو دنیا میں کوئی جینے بھی نہ دے اور اُدھر ویسا ہی خطرناک سو

آئے تو کہاں جائے نہ تا جی سے کوئی جائے جب تک اُسے غصہ نہیں آتا نہیں آتا

حکیم تو اس کو نوعِ من الجنون سے بتاتے ہیں اور ہے بھی یوں ہی کہ آدمی کو غصہ آتا ہے تو پھر اس کو آگا پیچھا نہیں سوجھتا۔ آدمی اپنے آپے سے باہر ہو جاتا ہے یعنی جتنی دیر غصہ رہے انسان انسان نہیں رہتا بلکہ حیوان بن جاتا ہے اور حیوان بھی مرکھنا موذی۔ پھر اس جادو کا توڑ اس زہر کا تریاق کچھ ہے تو عقل ہے کہ وہ غصّے کو بالکل سلب تو نہیں کر سکتی مگر ہاں حد سے بڑھنے بھی نہیں دیتی۔ عقل مندوں نے اس کے فرو کرنے کی تدبیریں نکالی ہیں کہ غصہ آئے تو آدمی سامنے سے ٹل جائے، کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، پیاس نہ بھی ہو تو پانی پیئے، یعنی طبیعت کو دوسری طرف مصروف کرے۔ اور مذہب فرماتا ہے الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس کہ غصّے کو ضبط کرنا سب ریاضتوں سے بڑھ کر ہے۔ انسان میں جتنی عادتیں خلقی ہیں جانے والی تو ان میں ایک بھی نہیں اور انکو عادت نہیں بلکہ خاصیت سمجھنا چاہیئے جیسے پانی کی خاصیت ہے کہ وہ نشیب کی طرف کو بہتا ہے یا جیسے ہر ایک جسم کی خاصیت ہے کہ روک نہ ہو تو زمین پر گر پڑے۔ ایسی ہی کوئی ہو گا تو غصہ بھی رکھے ہی گا۔ ایسا کون ہے جس میں پتا نہیں۔ پس مذہب جس نے بات من ہی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے اُس کے کھوٹے کھرے کی بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ انسان کی علمی قابلیتو

کے سلب کرنے کے درپے ہے یا اُن کے معتدل کرنے کے۔ اگر سلب کرنے کے درپے ہے تو جان لو کہ وہ مذہب ادعائے محال کرتا ہے اور اپنے ارادے میں نہ کبھی کامیاب ہوا اور نہ آیندہ کامیاب ہو۔ ایسے مذہب والے اپنے نزدیک ایک انسان فرض کر لیتے ہیں کہ اس طرح کا آدمی خدا نے کبھی پیدا ہی نہیں کیا اور پھر ایسے فرضی اور خیالی انسان کا نمونہ دکھا کر لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ ایسے بنو۔ ارے بھائی کیسے بنیں؟ پیٹ کو کاٹ کر پھینک دیں؟ آنکھیں پھوڑ لیں؟ کانوں میں رُوڑ ٹھونسے رہیں؟ خدا نے جو ضرورتیں ہمارے پیچھے لگا دی ہیں اُن کو جا کر کہاں پھینک آئیں؟ پیٹ ہے تو بھوک لگے ہی گی اور بھوک لگے گی تو چار و ناچار کچھ نہ کچھ کھانا ہی پڑے گا۔ ہندوؤں اور عیسائیوں کی ریاضتیں سُن کر جو تم اسلام کی طرف سے بدعقیدت ہوتے ہو وہ اسی قسم کی ریاضتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ انسانی خاصیتوں کے بوجھ سے سبکدوش ہونے کی تدبیریں لگے ہیں سو بڑا لیں جتنا چاہیں وہ بوجھ تو مرے ہی سے اُترے گا۔ اس زندگی میں تو اترتا نہیں۔ اور جو دعویٰ کرے کہ میں اُتار سکتا ہوں جھک مارتا ہے۔ اس میں دو پہلو اور بھی بُرے ہیں۔ ایک تو من وجہ اس میں اعتراض ہے خدا پر کہ اس نے انسان کو ایسا کیوں بنایا جیسا چاہا۔ یخلق ما یشاء ہم اس میں چون و چرا کرنے والے کون؟ دوسرے یہ تعلیم درپردہ لوگوں کو نفاق اور ریا کی تعلیم ہے۔ اس موقع پر میں ایک قانونی مسئلہ بیان کرتا ہوں اس سے تم میرے مطلب کو خوب سمجھو گے۔ یہ جو شراب۔ افیون۔ گانجا۔ چرس۔ بھنگ نشے کی چیزیں ہیں اور معلوم ہے کہ ہزاروں گھر اور لاکھوں آدمی ان کی وجہ سے برباد اور تباہ ہوتے ہیں۔ سرکار کا منشاء تو یہ ہے کہ ملک سے ان کا رواج اُٹھ جائے اور کوئی آدمی ان کا نام بھی نہ لے لیکن بہت لوگوں نے ان کو زندگی کی ضرورتوں میں داخل کر لیا ہے کہ بدون ان کے اُن سے مُطلق صبر نہیں ہو سکتا۔ ننگے پھریں بھوکے مریں غرض اور سب طرح کی تکلیفوں کو سہار بھی جائیں مگر عمل کا وقت نہ ٹلنے دیں۔ تو اب سرکار کیا کرتی ہے کہ محصول کے پیچ کو کستی اور کڑا کرتی چلی جاتی ہے اور ان باتوں کی آمدنی پہلے سے اضعافاً مضاعفہ بڑھ گئی ہے اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ مگر سرکار یہ نہیں کرتی کہ ان کی قطعی بندی اور ممانعت کر دے یا ایک دم سے ایسا بھاری محصول لگا دے کہ

کہ وہ بندی اور ممانعت کا کام دے کیونکہ ایسا کرے تو لوگ مجبور ہو کر کھلم کھلا بغاوت نہ بھی کریں تو ہزار حیلے کریں کہ سرکار کے احکام سے بھی ان کا انسداد نہ ہو سکے اور اس کا ضروری نتیجہ یہ ہو کہ محصول بڑھنے کی جگہ اُلٹا گھٹ جائے اور چھپکے چھپکے ان چیزوں کا استعمال بھی جاری رہے۔ بعینہ یہی حال ہے مذہبی احکام کا کہ ان کو حد سے زیادہ سخت کر دیا جائے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ لوگ ان کی تعمیل سے بچنے کے لئے بہانے ڈھونڈیں حیلے تصنیف کریں۔ دل میں تو تعمیل کرنے کی ہے نہیں مگر چونکہ انکار کرتے بن نہیں پڑتا حکم کو مانتے ہیں لیکن وہی یہودیوں کا سا ماننا سمعنا وعصینا[1] تو پھر یہ نفاق و ریا نہیں تو کیا ہے؟ اور نفاق و ریا بھی خدا کے ساتھ۔ اگر اسی کا نام رفارم اور اصلاح ہے تو ہم بے اصلاح ہی بھلے اور یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ جو ریاضتیں ہندو جوگی اور عیسائی راہب کرتے ہیں اگر شرط دینداری ہوں اور نجات ان پر موقوف ہو تو کتنے آدمی ان شرطوں کو بجا لا سکتے ہیں اور خود ہندوؤں اور عیسائیوں ہی میں کتنے آدمی ان کو بجا لاتے ہیں۔ شاید لاکھ میں دو چار۔ تو لاکھ میں دو چار کے بجا لانے سے بشرطیکہ واقع میں خلوص سے بجا لاتے بھی ہوں تو وہ حکم سخت ممکن التعمیل نہیں کہلایا جا سکتا۔ دنیا جس طرز پر چلی آئی ہے اُسی طرز پر چلے گی۔ لکھنے کے لئے جو چاہو کتاب میں لکھ لو۔ یہ صفت ایک اسلام ہی میں دیکھتے ہیں کہ وہ آدمی کو آدمی تسلیم کرتا اور وہ اس پر اسی قدر بوجھ رکھنا چاہتا ہے جس کو وہ آسانی کے ساتھ سہار سکے اور یوں دوسروں کی دیکھا دیکھی مسلمان ایک پہاڑ اپنے سر لادنا چاہیں تو ان کی خوشی۔ اسلام بے چارے کا اس میں کیا دوش؟

صادق۔ یہ تو آپ نے دل کو لگتی ہوئی کہی۔ مگر وہ بات رہ گئی۔ آپ فرما رہے تھے کہ اسلام میں ایسی کون سی انوکھی تعلیم ہے جو دوسرے مذاہب میں نہیں۔

بزرگ۔ ہاں تو وہ انوکھی تعلیم توحید ہے اب تو لوگ مسلمانوں کے غل غپاڑا مچانے سے کچھ کچھ تا دیلیں

---

[1] سنو اور پلے باندھو۔

بھی کرنے لگے ہیں اور بشکلِ موحد بننا چاہتے ہیں ورنہ اسلام کی تشریف آوری کے وقت تو اہل کتاب تک توحید میں ایسے کچے تھے کہ ان میں اور بت پرستوں میں صرف نام کا فرق باقی رہ گیا تھا یضاہئون قول الذین کفروا من قبل۔

صادق۔ اچھا پھر اسلام نے توحید کا کیا ثبوت دیا؟

بزرگ۔ وہی ثبوت جو خدا کے ہونے کا دیا تھا وہی خدا کے ایک ہونے کا بھی دیا۔ یعنی جس طرح عقلِ انسانی گواہی دیتی ہے کہ خدا ہے اسی طرح وہی عقلِ انسانی گواہی دیتی ہے کہ وہ ایک ہے۔ اگر دنیا زبانِ حال سے پکار رہی ہے کہ اس کا بنانے والا ہے تو دنیا کا انتظام زبانِ حال سے پکار رہا ہے کہ اس میں کسی دوسرے کا لگاؤ نہیں۔ جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایک ارادے سے ہو رہا ہے۔

صادق۔ اچھا پھر؟

بزرگ۔ بات تو اس پر چلی تھی کہ اسلام کو مولویوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا ان مشائخ کے گروہ سے اور اسکی سند میں میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ یوں تو دنیا میں بہتیرے ہی مذہب ہیں اور ہر ایک مذہب کا مقصودِ اصلی ہے انسان کی اصلاح گو وقتی اور مقامی خصوصیتوں کی وجہ سے اصلاح کے اصول میں کچھ اختلاف بھی ہو غرض انسانی اصلاح کے اعتبار سے اسلام کو دوسرے مذہبوں پر کچھ ایسی فوقیت نہیں ہاں فوقیت ہے تو توحید میں ہے اور اسی میں ان حضرات مشائخ نے ایسا گول مال لگایا ہے کہ اسلام کے سارے فخر کو ملیامیٹ کر دیا۔ اب سچ پوچھو تو مسلمانوں کا منہ نہیں کہ اہلِ کتاب بلکہ بت پرستوں کی توحید کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکیں۔ مثلاً عیسائیوں کی توحید میں بھی یہی نقص ہے نہ کہ دو خدا اور حضرتِ مسیح اور روح القدس کو عجیب طور سے خدا مانتے ہیں کہ بجائے خود ہر ایک خدا اور پھر ایک خدا ایسا مثلاً ہندو ہیں کہ وہ دیوتاؤں اور اوتاروں کو بھی خدا کہتے ہیں چاہے اسکی کچھ تاویل کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں مگر تین ہوں یا تین ہزار ہوں ہمہ اوست کے آگے تو ان کی کچھ بھی حقیقت نہیں۔

صادق۔ کیوں صاحب یہ ایسی موٹی بات ان صوفیوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی اور کیوں نہیں آتی؟

بزرگ۔ یہ تو کوئی تعجب کی بات نہیں جس وجہ سے مثلاً عیسائیوں اور ہندوؤں کی سمجھ میں نہیں آتی

اسی وجہ سے صوفیوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتی۔

صادق - نہیں میں صوفیوں کی نسبت اس بات کا تعجب کرتا ہوں کہ یہ تو مسلمان ہیں اور مسلمانوں میں سے بھی چنے ہوئے مسلمان کہ مذہب کے پیشوا سمجھے جاتے ہیں تو کیا توحید کے مسئلے پر ان کی نظر نہ پڑی ہوگی؟ قرآن کا شاید ایک صفحہ بھی مشکل سے ملیگا جس میں توحید کا مذکور نہ ہو۔ بے عیسائی اور ہندو اُن کی مذہبی کتابوں میں اول تو توحید ہوگی ہی نہیں اور ہوگی بھی تو ایسی ہی گیڑ بپڑ ہوگی جیسی کہ یہ لوگ معتقد ہیں۔

بزرگ - بس تم ہر چند منٹ کے بعد ایک نہ ایک بات ایسی کہہ دیتے ہو کہ مجھ کو تمہاری طرف سے سخت نا امیدی ہو جاتی ہے۔

صادق - وہ ایسی کون سی بات میرے مُنہ سے نکلی؟

بزرگ - تمہاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تم سمجھتے ہو توحید مذہب نے تعلیم کی۔

صادق - کیا نہیں بھی؟

بزرگ - تو تم نے ابھی مذہب ہی کو نہیں سمجھا کہ مذہب ہے کیا چیز اور کہاں سے اسکی ابتدا ہوئی۔ مذہب کی مثال صرف و نحو کی سی ہے۔ صرف و نحو نے زبان کو نہیں بنایا بلکہ لوگوں نے زبان سے صرف و نحو کو بنایا ہے۔ یعنی اہل زبان کو ایک طور پر بولتے سُنا اُس طور کو قاعدے کے طور پر منضبط کر لیا، صرف و نحو بن گئی۔ قاعدے زبان سے موجود تھے مگر لوگوں کو آگہی نہ تھی کہ ہم بولنے میں اس قاعدے کا لحاظ رکھتے ہیں۔ جب کسی کا ذہن منتقل ہوا اور اسکو قاعدہ سوجھ پڑا تب خبر ہوئی اور یوں بولنے کو تو ذرے ذرے سے لڑکے اپنی مادری زبان ایسی پٹر پٹر بولتے ہیں کہ صرف و نحو کا علامہ بیٹھا ان کا مُنہ تکا کرے۔ اگرچہ لڑکے قاعدے کے نام سے بھی واقف نہیں۔ میں نے مذہب کو اپنے نزدیک ایسا سمجھ رکھا ہے کہ مذہب کے اصول لوگوں کے ذہنوں میں پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ مذہب نے انہی کو قواعد کے طور پر ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔

صادق - اگر ایسا تھا تو مذہب میں اختلاف کیوں ہوا؟

بزرگ - ہاں تو اختلاف اس طرح پر ہوا کہ مثلاً ایک زبان اردو کو لو۔ اگرچہ اردو کی صرف و نحو اس وقت تک مضبوط نہیں اور جو یہ سکولوں اور مکتبوں میں لعنت برہیچ دو چار رسالے دکھائی دیتے ہیں یہ سب لغو

اور مہمل جلا دینے کی لائق ہیں۔ لوگوں کو قواعد کے بنانے کا تو مادہ نہیں اور اس زمانے کے پڑھے لکھوں میں شاید کوئی سر تصنیف کے جنون سے خالی ہو۔ مرزا شہد بدآئی اور تصنیف کا خبط پیدا ہوا۔ دیکھا کہ اب کہ اردو بڑی معراج الکمال رہ گئی ہے اور زبان کے سلسلہ میں پہلی چیز صرف و نحو، اُنھوں نے بھی لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہونا چاہا۔ یہ بات پہلے سے کان میں پڑی ہوئی تھی کہ عربی میں صرف و نحو کا بڑا ذخیرہ ہے۔ عقل کے دشمن نے یہ تو سمجھا نہیں کہ عربی میں صرف و نحو کا بڑا ذخیرہ ہے تو زبان عربی کا ہُو ہے نہ اردو کے لیے اور اگر ایک ہی صرف و نحو سب زبانوں کے لئے کافی ہو تو عربی اور سنسکرت اور لیٹن اور گریک سب بُدّوں کو ایک ہی وضو سے ٹرخا یا جاسکتا ہے۔ بہر کیف فکر ہر کس بقدر ہمت اوست اسے مأتہ عامل اور شرح مأتہ عامل اور صرف و نحو کا فتویٰ لکھنا منظور ہوا تو نحو میر بہم پہنچا ان ہی میں کاٹ چھانٹ شروع کی۔ ماشاءاللہ قلم میں زور طبیعت میں جولانی، اپنی زبان کے کونے کھدرے معلوم۔ ایک ہفتہ نہیں گذرنے پایا تھا کہ اچھا خاصا رسالہ بن کر تیار ہو گیا۔ ہم جیسے کم سواد آدمی زیر و زبر کو اردو میں ڈھونڈتے پڑے پھرتے ہیں تو کہیں پتہ نہیں ملتا۔ غرض اردو کی صرف و نحو تو اس وقت تک منضبط نہیں ہوئی مگر فرض کر لو کہ ہے تو ہم پوچھتے ہیں۔ کہ یہ کہاں کی اردو کے لئے ہے؟ یوں کہنے کو تو اردو سارے ہندوستان کی زبان ہے مگر اردو و اردو میں فرق ہے۔ اردو۔ دلی۔ لکھنؤ کی۔ اردو دیہات کی۔ اردو مارواڑ کی۔ اردو پورب کی۔ اردو پنجاب کی۔ اردو دکن کی۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دلی میں قلعے کی اردو اور شہر کی اردو۔ اور اب بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی اردو میں فرق ہے۔ مسلمانوں میں پنجابیوں کا محاورہ جدا ہمارا جدا۔ لیکن خیر اردو کی صرف و نحو جو ڑبے جو جیسی کچھ لکھی گئی ہے اُسی اردو کی لکھی گئی ہے جو سند ہے اور یہی حال ہے عربی انگریزی سب زبانوں کی صرف و نحو کا۔ یعنی ہر ایک زبان کی صرف و نحو الگ الگ ہے۔ اسی طرح جیسے جیسے لوگوں کے خیالات ہیں ویسے ویسے ان کے مذہب ہیں۔ جیسے بعض زبان کی صرف و نحو نہیں ویسے ہی بعض لوگوں کے پاس مذہبی کتاب نہیں اور جس طرح زبان کی صرف و نحو منضبط نہ ہونے سے لازم نہیں آتا کہ اس میں قواعد نہیں اسی طرح کسی مذہب کی کتاب نہ ہونے سے لازم نہیں آتا کہ وہ مذہب نہیں۔ جن مذہبوں کی کتابیں ہیں میں اُن کو ایسا سمجھتا ہوں کہ گویا ایک ہی زبان کے مختلف لہجوں کی صرف و نحو ہیں۔

اور اسلام وہ مذہبی صرف و نحو ہے جو سب سے زیادہ فصیح، سب سے زیادہ عام فہم ہے اور سب کے لئے بنائی گئی ہے۔

نیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ سا بیچ میں آگیا اور میں نے اس پر خاص کر اسلئے زور دیا تاکہ تم کو معلوم رہے کہ جن کو خدا نے سلیم طبیعتیں عطا فرمائی ہیں، اُن کے خیالات، اور معتقدات اسلام دونوں ایک ہی چیز ہیں اور یہی تو اسلام کے برحق ہونے کی بڑی دلیل ہے کہ عقل سلیم اُسکو طوعاً قبول کرتی ہے کرنا نہیں اصل میں مذکور یہ تھا کہ اسلام کو توحید پر بڑا فخر ہے اور اسی میں سنرات مشائخ نے ایسا گول مال لگا رکھا ہے کہ اسلام کی توحید بھی دوسرے مذہبوں کی طرح میلی میلی اور گدلی گدلی دکھائی دیتی ہے۔

صادق ۔ یہی تو میں پوچھتا تھا کہ ان صوفیوں کی توحید میں فرق پڑا تو کیسے پڑا۔

بزرگ ۔ فتور پڑنے کی پوچھتے ہو تو فتور پڑا بزرگوں کی تعظیم مفرط سے۔ اُنھوں نے پیروں کا ادب کیا۔ اور بجا کیا۔ باپ ہو، استاد ہو، پیر ہو، بڑوں کا ادب کرنا ہی چاہیئے۔ مگر وہی بات، کہ ہر چیز میں اعتدال شرط ہے۔ ادب کی بھی ایک حد ہے۔ مریدوں نے ادب کو حد سے بڑھا دیا۔ یہاں تک کہ تعظیم اور عبادت میں فرق باقی نہ رہا۔ اپنی تعظیم سے کسی کو خوشی نہیں ہوتی؟ پیر جی صاحب کچھ پیغمبر تو نہ تھے کہ مریدوں کو روکتے اور منع کرتے اور مرید خود امیدوار خلافت تھے، پیر جی بادشاہ تھے تو یہ ولیعہد۔ یہ گدی کے ادب کو کیوں کم ہونے دینے لگے تھے۔ یوں تعظیم مفرط کا دستور پڑ گیا۔ دین کا استاد کہ اسکو شیخ ہی کہتے ہیں پیر سے رتبے میں کم نہیں مگر دیکھو بیچارے مولوی ڈرپوک پھونک پھونک کر پاؤں دھرنے والے کہ کہیں شرع کے خلاف نہ ہو جائے۔ شاگرد کو سر آگرمی زبان سے السلام علیکم کہتے ہوئے سن کر خوش ہو لیتے ہیں ہم کسی مسلمان پر کیوں بدگمانی کریں۔ مریدوں نے ادب ہی سمجھ کر پیر جی کا ادب کیا ہوگا۔ مگر اول تو اُن کو ادب مشروع ہی کرنا کیا ضرور تھا کہ پیغمبر صاحب تو اپنی تعظیم کے لئے کھڑا ہونا بھی روا نہیں رکھتے تھے۔ جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے دوسرے عوام کے حال پر بھی کچھ رحم فرمایا ہوتا کہ ان شامت کے ماروں کو اُٹھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ملتا ہے۔ دیوانہ را ہوئے بس است۔ اب کیا حال ہے کہ خدا کو تو بالائے طاق بٹھا دیا ہے۔ سینکڑوں کوس سے ہزارہا آدمی مرد اور عورت قبریں پوجنے چلے آتے ہیں۔ ان ہی کی منتیں مانیں ان ہی کو نذریں چڑھائیں، ان ہی سے حاجتیں مانگیں، اور کہنے کو مسلمان ہیں نبی موحد

کی امت ہمسر کیجیں، نیت بدعت نہیں۔ ان سب کا وبال کس پر؟ ان ہی پر جنھوں نے یہ دستور نکالا جو اس دستور کو جاری رکھتے، جو اس دستور کو رونق دیتے ہیں، جو اس دستور کی کمائی کھاتے ہیں۔ بعض بعض مولوی ایسے ہو گذرے ہیں اور اب بھی ہیں اگرچہ کم ہیں، اور نیک بندے ہر زمانے میں کم ہی ہوتے ہیں، قرآن کے حافظ واعظ، عالم، فقیہ، محدث کہ جن کے دیکھنے سے ہم کو تو پیغمبر صاحب کے صحابہ یاد آ جاتے ہیں۔ صورت پر نور پڑا برس رہا ہے اور درود پڑھنے کو جی چاہتا ہے، متواضع، منکسر، صوم و صلوٰۃ کے پابند، نہ کسی کی غیبت، نہ کسی کی بدی، کوئی آ گیا اس کو پڑھا دیا، نہیں بیٹھے بیٹھے اللہ اللہ کیا کئے۔ ہم نہیں جانتے کہ نیک آدمی یہ ہیں اور کیا سینگ لگا ہوتے۔ ایسے لوگ مر گئے کل من علیہا فان کے حکم سے ناخلف نہ فرق کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ کب مرے اور کہاں مدفون ہوئے۔

ان فقیروں میں ایک تو یہ کھلی کرامت دیکھی جاتی ہے کہ مستور ہوں تو، بے شرع ہوں تو، نشہ باز ہوں تو، بیہودہ بکواس کرتے ہوں تو، آج مرے اور کل سے ان کے ڈھیر کی پرستش ہونے لگی، چہلم نہیں ہونے پایا کہ ڈھیر کا اچھا خاصہ عالی شان گنبد بن گیا۔ قبر شریف پر تکلف غلاف پڑا ہے۔ غلاف پر پھولوں کی چادر، سرہانے اگر کی بتی روشن ہے اور پائنتی خدام اور زوار سر جھکائے دو زانو مؤدب بیٹھے جھوم رہے ہیں۔ پہلے ہی عرس پر سارے میلوں پر اوس پڑ گئی۔ شاہ صاحب مرجع خلائق تو بحالت حیات بھی تھے مگر انتقال کے بعد تو ان کے مریدوں، جانشینوں اور معتقدوں کے برتاؤ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ساری خدائی کا چارج ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ایسا کون سا سنگ دل ہو گا جس کو مردے کے حال پر ترس نہ آتا ہو۔ دیکھتا ہے کہ ایک اپنے ہی جیسا آدمی تھا، جیتا چلتا پھرتا جو مکھی تک اپنے اوپر نہیں بیٹھنے دیتا تھا، مردہ بدست زندہ کیا عاجز ہے کہ کروٹ تک نہیں بدل سکتا۔ مگر سب مردے ان فقیروں کے سے مردے ہوں تو ترس کیا، ایسی موت پر امیروں اور بادشاہوں کو بھی رشک ہو تو بجا ہے۔ ہم تو زندہ امیروں اور بادشاہوں کے ساتھ بھی بعض مزاروں کا سا توزک اور احتشام نہیں دیکھتے۔ پھر ایک اور بڑی خطرناک بات یہ ہے کہ ہر چند ایک مسلمان کی نسبت نیک گمان رکھنے کا حکم ہے اور چاہیے بھی یوں ہی کہ جتنے مسلمان بھائی خدا کے یہاں چلے گئے ہیں کہ اپنی زندگی میں کچھ

ہی کرتے رہے ہوں مگر آخر تھے تو مسلمان. ہم کو خدا کی ذات سے یہی امید رکھنی چاہیے کہ وہ بڑا غفور و رحیم ہے اس نے اپنے فضل و کرم سے ان کو بخش ہی دیا ہوگا مگر جیسا وہ غفور رحیم ہے ویسا ہی بے نیاز بھی ہے سے

خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن ۔۔۔ رہے ہے خوف مجھے اسکی بے نیازی کا

اور یہی بے نیازی ہو کہ بڑے سے بزرگ یہاں تک کہ جن کو پیغمبر صاحب نے خدا کی طرف سے اور اسکے حکم سے جنت کی خوشخبری سنادی تھی وہ تک تو اپنی نجات اور مغفرت کی طرف سے مطمئن نہ تھے اور جیسا خود پیغمبر صاحب جن کے اگلے پچھلے سب گناہ خدا نے معاف کر دیئے تھے لیغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تأخر[1] وما ادری ما یفعل بی ولا بکم فرمائیں تو وہ کس گنتی میں ہیں۔ ذرا اصحاب کا حال پڑھو کہ بڑے سے بڑے عابد و زاہد کی تمام عمر کی عبادت ان کے ایک دن کی خدمت کے برابر نہیں ہو سکتی۔ بایں ہمہ حضرت ابوبکر صدیق فرماتے تھے کہ اے کاش میں گھاس پات ہوتا، کوئی جانور مجھ کو چر جاتا اور گوبر کر کے نکال پھینکتا اور مجھ کو خدا کے حضور میں جواب دہی نہ کرنی پڑتی۔ حضرت عمر فاروق کو کسی بڑے بزرگ صحابی نے بارہ برس کے بعد خواب میں دیکھا کہ وہ پیشانی پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ پوچھا حضرت آپ کا کیا حال ہو۔ فرمایا بھائی اب محاسبے سے نجات ملی ہو۔ وہ بھی خدا نے بڑی ہی رعایت کی کہ میں بال بال نکل آیا۔ اور جتنے بزرگ ہو گذرے ہیں ان کی کتابیں ہیں دعائیں ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی کو خطر عاقبت کی طرف سے تا دم مرگ اطمینان نہ تھا تو ادھر حسن ظن اور ادھر خدا کی بے نیازی ان دو باتوں کا نتیجہ کیا ہو کہ ہم کسی کے مقبول و مغفور ہونے کا قطعی طور پر حکم نہیں لگا سکتے۔ اور جب کہ ابھی مغفرت ہی میں کلام ہو تو یہ ساری کوشش ایک طرح پر خدائی میں دخل دینا ہے۔

---

[1] تاکہ ہم اس فتح کے شکریہ میں دین حق کی ترقی کے لیے اور زیادہ کوشش کرو اور) خدا اس کے صلے میں تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دے [2] اور میں نہیں جانتا کہ (آیندہ) میرے ساتھ کیا کیا جائیگا۔

ایک بزرگ کا تو حال ہم کو معلوم ہے کہ وہ شیخ الامرا تھے یعنی شہر کے اکثر روادار لوگ ان کے مرید تھے۔ اور کیوں مرید تھے اس کا سبب بیان کریں تو کسی نہ کسی کو ان بزرگ کا پتہ لگ جائے اور وہ ہمیں منظور نہیں۔ امیروں کے دین کا بھی عجب حال ہے کہ جہاں اور مشغلے ہیں انھوں نے دین کو بھی ایک شغلہ سمجھا ہے۔ آپ خود چاہے دیندار نہیں، جو ان کو جانتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی جانتے ہیں کہ دین سے ان کو مس نہیں۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ آپ دین میں بھی اپنے اختیارات چلانا چاہتے ہیں۔ فغفور چین کو سنا ہے کہ وہ دنیا کا بادشاہ اور دین کا پیغمبر دونوں مانا جاتا ہے تو چینیوں کے مذہب پر ہم کو تعجب ہوا تھا، مگر اپنے امیروں اور بادشاہوں نے دیکھا تو ان کو بھی اسی خبط میں گرفتار پایا۔ ان کے ناموں اور خطابوں سے تو خیر فرعونیت ٹپکتی ہی تھی مرے پیچھے جو خطاب خلد آرام گاہ، جنت آشیان، عرش مکان، اپنے بزرگوں کو عطا فرماتے ہیں ان کو کیا کہا جائے۔ کیا جنت بھی جاگیر کر پائی ہے کہ اندھا بانٹے ریوڑی ہر پھر اپنوں ہی کو دے گئے بے دمڑی بانٹے ؏ بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را۔ خیر تو وہ بچارے شیخ الامرا دل میں جو کچھ رہے ہوں ظاہر میں تو ان میں فقیری کی صرف یہ بات تھی کہ گیروا لباس زیب تن فرماتے تھے مگر کپڑا ہوتا تھا قیمتی۔ اور یوں بھی ان کی گذران امیرانہ تھی اور امیروں کے پیر تھے تو کیوں نہ ہوتی۔ امیروں کی عقیدت کا تو کچھ کہنا نہیں ان کے یہاں جہاں موروثی داروغہ، موروثی خواجہ سرا، موروثی اتکہ، موروثی ڈھگ۔ تھے اسی فہرست میں شیخ الامرا صاحب بھی تھے۔ مگر لوگ شاید حسد کے مارے کچھ ان کے قائل نہ تھے بلکہ کسی مجمع میں ان کا ذکر بھی آ گیا تو جو وضع دار تھے انھوں نے سکوت کیا اور جو منہ کے پھوہڑ تھے انھوں نے غیبت کر دی کہ ریاکار ہیں، فقیری کو بدنام کر رکھا ہے۔ آخر وہ بزرگ ایسے بیمار پڑے کہ گھڑی گھڑی ان کے مرنے کی خبر اڑنے لگی اور خبر کے ساتھ ان کی کرامتیں اور خوارق عادات بھی کہ وصال ہو چکا ہے اور لطائف جلدی ہیں، سب کو دکھائی دیتے ہیں، سن پڑتے ہیں۔ غسل دینے میں تہمد ذرا کی ذرا گھٹنے پر سے کھسک گیا تھا، خدا کے بندے ہو تو یقین کرو کہ ملتے حضرت نے خود اپنے ہاتھ سے نیچا کر لیا۔ ہاتھ پاؤں جیسے ریشم، جنازہ اٹھایا تو ہلکا پھول۔ آخر مشہور ہوا کہ قبر کی مٹی عجیب خوشبودار نکلی ہے کہ سارا جنگل پڑا مہک رہا ہے۔ شہر کی خلقت کہ اگلی گھڑی کو دو تو سینکڑوں آدمی جمع ہو جائیں ہزاروں آدمی امنڈ

پڑے اور تبرک کے طور پر چٹکی چٹکی مٹی یعنی شروع کر دی۔ کھودتے کھودتے قبر بن گئی باؤلی۔ کتنی عورتوں اور بچوں کے گلے میں تعویذ کی جگہ اُس مٹی کی پوٹلیاں لٹک گئیں۔ پھر وہ دن اور آج کا دن کرامتوں کی فہرست ماشاء اللہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اللّٰھم زد فزد۔

صادق۔ واقع میں یہ کیا بات ہے کہ مرے پیچھے درویش لوگ زیادہ پجنے لگتے ہیں؟

بزرگ۔ پیران نمی پرند مریداں می پرانند۔ اور جیتے جی ایسے لمبے چوڑے دعوے کئے جائیں تو ابراہیم کی سی تحدی ہو کر قلعی نہ کھل جائے۔

صادق۔ ابراہیم کی سی تحدی کیسی؟

بزرگ۔ قرآن میں اس تحدی کا نہایت عمدہ مذکور ہے۔ خدا سمجھ دے تو جتنے خدشے آدمی کے ذہن میں گذرتے ہیں صراحتًہ یا کنایۃً سبھی کا جواب قرآن میں موجود ہے۔ ابراہیم کی تحدی یہ تھی کہ ان وقتوں کا بادشاہ خدا کو نہیں مانتا تھا۔ اسی بات پر اس سے اور ابراہیم علیہ السّلام سے حجت ہو پڑی۔ بادشاہ نے کہا کہ تم جس خدا کی طرف سے پیغمبر بن کر آئے ہو اور چاہتے ہو کہ ساری دنیا اُسی کی پرستش کرے آخر بتاؤ کہ وہ بندوں پر کس طرح کا اختیار رکھتا ہے۔ ابراہیم علیہ السّلام نے کہا کہ ایک اختیار تو اس کا یہی ہے کہ بندوں کا جینا مرنا اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ بادشاہ نے کہا یہ تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر اُس نے ایک خونی کو چھوڑ دیا اور ایک بے گناہ کو ناحق بیٹھے بٹھائے مروا ڈالا۔ ابراہیم نے کہا خیر یہ تو آپ نے کیا مگر آفتاب جو پورب سے نکل کر پچھم میں غروب ہوتا ہے یہ تو آپ کے حکم سے نہیں کیوں کہ آپ سے پہلے بھی تھا۔ آپ اگر خدائی کے اختیارات رکھتے ہیں تو اس کو حکم دیجئے کہ پچھم سے نکلے اور پورب میں غروب ہو۔ اس سے بادشاہ لاجواب ہو گیا۔ تو اگر دنیا میں کوئی بھی ایسا دعویٰ کرے اس کا قائل کر دینا کیا مشکل ہے۔ آئے دن اس کی درماندگی ظاہر ہو۔ یہ وجہ ہے کہ درویش اور مشائخ مرے پیچھے زیادہ پجنے لگتے ہیں۔

صادق۔ کیوں صاحب جو لوگ توحید کے بھی قائل ہیں اور پھر اُس میں رخنے بھی پیدا کرتے ہیں جیسے مسلمان ہو کر ہمہ اوست کہنے والے یا مثلاً عیسائی وہ اپنے معتقدات کی کیا تاویل کرتے ہیں۔

بزرگ۔ ہمہ اوست کہنے والوں اور عیسائیوں کی کیوں تخصیص کرو۔ ایسا کوئی آدمی نہیں جو خدا

کا قائل نہ ہوا اور جو خدا کا قائل ہے وہ ضرور اسکو وحدہٗ لاشریک لہ بھی جانتا ہے اور جس قدر توحید سے بھٹکا ہوا ہے وہ اپنے زعم میں اسکی کچھ تاویل کرتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اصل میں توحید کا معتقد ہے اور توحید کے خلاف جو باتیں اس سے سرزد ہوتی ہیں اُن کی تاویل کرتا ہے تاکہ توحید میں خلل نہ آئے مسلمانوں سے بھی ایسے افعال سرزد ہوتے ہیں جن سے ان کی توحید کا تزلزل ظاہر ہوتا ہے۔ یہ لوگ بھی اپنے بزرگوں کے ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں جسکی وجہ سے دوسرے لوگ کافر اور مشرک اور بت پرست کہلائے تو جو تاویل مسلمان کرتے ہیں ہی یا ویسی ہی قسم کی دوسرے لوگ بھی کرتے ہیں کہ جن کو تم سمجھتے ہو ہم شریک خدائی گردانتے ہیں، خدا نہیں ہیں بلکہ خدا نے اپنی خاص خاص صفتوں کو ان کے رنگ میں ظاہر کیا ہے۔ یا یہ لوگ خدائی سرکار میں ہمارے وسیلے ہیں۔ یا ہم نے خیال جمانے کے لیئے ایک حیلہ بنا رکھا ہے۔ یا چونکہ ہر چیز میں خدا کی قدرتیں نمایاں ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ ان ہی میں خدا ہے۔ غرض آدمی بات بنانے پر آئے تو اس کے ہزاروں رستے ہیں۔ ایک پادری تثلیث کی ایک تاویل کی تھی ایسی بھی ذرا کم سوجھتی ہے۔ کھڑا ہوا وعظ کہہ رہا تھا اور اسی تثلیث کا ذکر تھا اُسکی تمام تقریر کا حاصل یہ تھا کہ تثلیث ایک راز ہے خدا کی ذات سے متعلق۔ ہم سب لوگ مانتے ہیں کہ خدا ہر جگہ موجود ہے جیسا یہاں اس جگہ ویسا امریکہ میں ویسا زمین کے کونے کونے میں۔ ویسا آسمان میں وہ سوتا نہیں تھکتا نہیں، لوگوں کے دلوں کے منصوبے تک جانتا اور جو کچھ ہو چکا اور ہو رہا ہے اور ہونے والا ہے اس کو سب معلوم ہے لیکن یہ ایسی باتیں ہیں کہ مطلقاً ہماری سمجھ میں نہیں آتیں کہ کیونکر کوئی شخص ان صفتوں کا جامع ہو سکتا ہے۔ ایسا شخص نہ کبھی ہوا اور نہ کبھی کسی نے دیکھا اور نہ کوئی اس کی طرف خیال دوڑا سکتا ہے۔ غرض خدا خود بھید ہے اُسکی ہر ایک بات بھید ہے اور دنیا میں اور بھی بہت سے بھید ہیں تو ایک تثلیث کے بھید سے لوگ کیوں اس قدر گھبراتے اور کیوں اس قدر اس کے پیچھے پڑے ہیں۔

صادق ۔ بات تو معقول کہی۔

بزرگ ۔ معقول نہ معقول، کیا خاک معقول کہی! یہ بالکل سچ ہے کہ عقل انسانی خدا کی ذات اور صفات پر احاطہ نہیں کر سکتی ہم نہیں جانتے اور نہیں جان سکتے کہ وہ کیا ہے اور کیسا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ خدا کے بارے میں ہم عقل سے بالکل کام نہ لیں عقل ہم کو اور زیادہ نہ بتا سکے لیکن

اتنا تو ثابت ہے کہ خدا ہے اور عقل گواہی کے سوا خدا کے ہونے کی ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں جب ہم نے خدا کو مانا عقل کا کسی قدر احاطہ تو تسلیم کرنا پڑا اور جس طرح عقل گواہی دیتی ہے کہ خدا ہے اسی طرح یہ بھی گواہی دیتی ہے کہ ایک ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم عقل کی ایک بات مانیں اور ایک بات نہ مانیں۔ رہ گئیں خدا کی صفتیں ہماری عقل تو اتنا تو بتاتی ہے کہ خدا میں یہ صفتیں ہیں اور نظام دنیا گواہی دے رہا ہے کہ اس میں یہ صفتیں ہونی چاہئیں، اس سے آگے عقل گم ہے۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ وہ دیکھتا اور اندھے عمارت دنیا نہیں سنبھل سکتی مگر یہ کہ اس کی آنکھیں ہیں یا نہیں اور ہیں تو کیسی ہیں نہیں ہیں تو کیسے دیکھتا ہے یہاں ہم دم نہیں مار سکتے اور یہی حال ہے اس کی دوسری صفتوں کا۔ اگر عقل یہ کہتی ہے کہ خدا تو ہے مگر نہیں معلوم ایک ہے یا تین ہیں یا ایسا ایک ہے کہ وہی تین ہیں اور ایسے تین ہیں کہ وہی ایک ہے تو پادری صاحب سچے تھے مگر عقل تو صاف پکارے کہہ رہی ہے کہ خدا ایک ہے تو اب عقل کے خلاف کیسے مان لیں؟ ایک کو تین اور تین کو ایک منوانا طلب محال ہے۔ اور میرے مذہب کا اصول یہ ٹھیرا رکھا ہے کہ جو مذہب طلب محال کرے وہ سچا اور خدائی مذہب نہیں ہو سکتا اس وجہ سے میں عیسائی مذہب کو مذہب حق نہیں سمجھتا، اور عیسائیوں کی کیا تخصیص ہے میں نے توحید میں تنزل دیکھا اور جتے سے اکھڑا۔ اور اسی توحید کے کارن تو میں مشائخ کے پاس ہو کر نہیں پھٹکتا ورنہ اصلاح باطن کے لحاظ سے تو اس گروہ کا بہت ہی ادب میرے دل میں ہے اور میں اس گروہ کی بڑی ہی قدر سمجھتا ہوں۔ مگر جیسی بڑی ضرورت ہے ویسی ہی مکر کی بڑی گنجائش ہے۔ خصوصاً جس حالت میں کہ شریعت کی روک تھام اٹھا دی گئی ہو جیسی کہ اٹھا دی گئی ہے۔ پھر ایک بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے طرز عبادت سے اُن کے تیوہاروں سے اُن کی ظاہری وضع سے جس سے مسلمان پہچان پڑتا ہے ان کے احکام شریعت سے آخر اس کا تو پتہ لگتا ہے کہ اسلام کے خدا پرستار ہے۔ پکے مسلمان کو کیسا اور کیا ہونا چاہیے۔ اس کو ہونا چاہئے اللہ کا نور یعنی نیچی داڑھی، نہ چڑھی ہوئی نہ منڈی ہوئی اور نہ خشخاشی کتری ہوئی، مونچھیں لی ہوئی، سر منڈا ہوا نہیں تو سارے سر پر بال، پٹے نہیں گردہ نہیں جیسے ملنوں کا سا لباس نہ ایسا باریک کہ اندر سے بدن پڑا جھلکے کہ اس کو پیغمبر صاحب نے فاسقوں کا لباس فرمایا، نہ تنگ

کو بھی تو اس مجمع میں بیٹھنے سے شرم آئی۔ یوں ناچ کا جلسہ ہوتا تو میں ایسا پاک بے حیا ہوں کہ شاید کچھ بھی شرم نہ کرتا۔ جان لیتا کہ چند بیغیرت مسلمان اسلام کو بدنام اور اپنے تئیں نضیحت کرنے کیلئے مجمع ہوئے ہیں اور ان میں ایک میں بھی ہوں لیکن افسوس یہ تھا کہ اس جلسہ قوالی کو ایسے ادب سے دیکھا جاتا تھا کہ گویا مجلس وعظ ہے اور اس میں خدا اور رسول کا تذکرہ ہو رہا ہے اور قوالی نہیں بلکہ ایک طرح کی عبادت ہے کیونکہ جتنے لوگ تھے سب سرنگوں دوزانو مودب بیٹھے ہوئے تھے۔ بلکہ اپنی مجالس میں تو لوگ ایسا کرتے بھی نہیں عزاداری کی مجلسوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے، مولودکی محفلوں میں شریک ہوا ہوں میں نے تو کہیں ایسا ادب قاعدہ نہیں دیکھا لوگ گانے کے مزے لے رہے ہیں اور کچھ

بھیں بنات النعش گردوں کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

خدا جانے کیا سمجھ کر عجیب عجیب حرکات کرتے تھے کہ ہم جیسے بے بصر انکو حرکات مجنونانہ کے سوائے اور کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ ہاں آسمان میں فرشتے ذکر الہی کے وجد میں آکر ایسے بے تال سر ناچتے ہوں تو خبر نہیں لیکن اگر بہشت میں جانا نصیب ہوا اور ظاہر میں تو کچھ سامان ہے نہیں لیکن اگر ہوا اور ایسا ناچ ناچنا پڑا تو ہم سے کیا بن پڑیگا؟ بہرکیف لوگ تو اپنے خیال میں تھے اور میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ الہی یہ قبر ہے اور بڑے بزرگ ہی کی ہو مگر ہے تو قبر۔ اور حدیثوں میں تو پیغمبر صاحب نے کل قبروں کی سنبت ایسا حکم دیا ہو کہ زمین دوز کر دی جائیں اور جس مصلحت سے یہ حکم دیا گیا ہو ہو وہ یہی مصلحت تھی کہ جو معاملہ ہم لوگ بیٹھے کر رہے ہیں کسی کی قبر کے ساتھ ایسا معاملہ نہ ہونے پائے کیونکہ خدا نے کل من علیھا فان کا فتوی جو جاری فرمایا ہو وہ تو پورا ہو کر رہیگا۔ گنبد بنائیں تو اور مقبرے بنائیں تو۔ علاوہ بریں زیارت قبور سے مقصود ہے عبرت، اور عبرت تبھی ہوگی کہ قبروں کو خستہ حال دیکھو اور اب تو شامیانہ اور روشنی اور ساز و سامان اور زوارون کا ہجوم اور یہ جلسہ قوالی دیکھکر عبرت کی جگہ عظمت کا خیال پیدا ہوتا ہے اور قلب پر الٹی عظمت طاری ہوئی جاتی ہے۔ آخر شب کا وقت تھا اور میلے کے غل غپاڑے کی وجہ سے آنکھ کچھ رات رہے سے کھل گئی تھی اس ارادے سے چلا تھا کہ نور ظہور کا وقت ہے جلوں موقع ہوا تو ان بزرگ کے مزار کے پاس بیٹھکر کچھ قرآن پڑھونگا

کہ اس سے اکڑ ظاہر ہو اور نہ بے ضرورت ڈھیلا کہ وہ اسراف اور شیخی میں داخل ہے۔ ریشمی نہیں، عورتوں کی طرح رنگین نہیں سر سے پاؤں تک بناؤ سنگار کا کہیں نام نہیں کہ زیب و زینت عورتوں کا شیوہ ہے۔ نیچی چولی، ٹخنوں سے اونچا پائجامہ، زیور کے نام بدن پر چھلا تک نہیں کہ یہ سب زنانہ پن ہے۔ گوٹہ نہیں۔ ٹھپہ نہیں، یہ تو مسلمان کی وضع ہوئی۔ اگر چلتا پھرتا کہیں نظر پڑ جائے تو نیچی آنکھیں کئے دبے پاؤں اپنے رستے لگا چلا جا رہا ہے۔ اینٹھتا نہیں اتراتا نہیں۔ جب دیکھو گھر میں یا کام کے سر یا پانچوں وقت مسجد میں۔ گنجفہ، چوسر، پاسہ، شطرنج، جتنے کھیل ہیں ان میں سے اس کو ایک بھی نہیں آتا۔ کبھی کھیلے ہوں تو جانے نہ پتنگ اڑاتا نہ مرغ یا بٹیریں لڑاتا نہ جانوروں کی کشتی کراتا۔ برسوں سے محلہ میں رہتا نہ کبھی سے لڑا نہ جھگڑا۔ گلی کی لڑکیاں دن رات اس گھر سے اس گھر میں دوڑی دوڑی پھرتی ہیں اس نے کبھی کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھا ہو تو پہچانے۔ پاس پڑوس والوں کا کوئی کام ہو تو بے بلائے موجود بازار سے لوگوں کے سودے سلف یہ لا کر دے۔ کوئی بیمار پڑے تو حکیم کے یہاں دونوں وقت یہ جائے نسخہ عطار کے یہاں سے یہ بندھوا کر لا دے۔ اپنے گھر میں نہ کبھی بڈھوں کو جواب دیا نہ کبھی چھوٹوں پر سختی کی کیسا ہی معاملہ پڑا تو نیت کا درست، بات کا پورا، وعدے کا سچا، شہر میں ایسا کون ہو جو اس کا کہا نہیں مانتا۔ ناچ رنگ کی جلسوں میں شریک ہونا تو درکنار نام لے دو تو پسینے پسینے ہو جائے۔ غریب مسکین، متواضع، منکسر، بھلا مانس، حسن خلق، ملنسار، راست باز، دیانت دار، غیور، بردبار، حریص نہیں، لالچی نہیں، سیدھا سادہ، بے تکلف، آنکھوں میں شرم لحاظ، نیک، شرع کا پابند، یہ ہے مسلمان کا مختصر سا حلیہ اور جو پرہیز گار ہیں وہ تو ایسے مہذب اور شائستہ اور باوقار ہیں کہ بھول کر بھی ان سے کوئی سخیف اور خفیف حرکت سرزد نہیں ہوتی۔ ہم کو بھی ایسے دو چار بزرگوں کی زیارت کا اتفاق ہوا ہے تو ان کی متانت کا کچھ ایسا رعب پڑتا تھا کہ ان کے سامنے بات نہیں کی جاتی تھی۔ دل میں تو خیال بیٹھ ہوئے تھے اور جانا تھا ایک رنگ کے ہیں میں۔ ہزار ہا مخلوق تھی مگر مجبوری کہنا پڑتا ہے کہ ایک بھی تو اپنی نگاہ میں نہ جچا۔ بازاری اور عوام اور نہ دوسرے خدا کے لوگوں کو چھوڑ کر قوالی کا جو مقدس جلسہ تھا وہی خود کیا تھا۔ تقدس کے تو بڑے درجے ہیں۔ مجھ جیسے نالائق نابکار عار اسلام ننگ گلہ

یہاں جو آیا تو قوالی کا مجمع دیکھا۔ قرآن پڑھا جائے کیا خاک جلسے میں تو رہا سہی مگر جبتک بیٹھا رہا یہی سوچتا رہا کہ یا تو مجھ کو اسلام سے تعلق نہیں یا اسلام کو ان باتوں سے تعلق نہیں۔

یہ خیالات ہیں جو مجھکو ان باطن والوں کی طرف رخ نہیں کرنے دیتے ورنہ میں تو ان کے پاؤں دھو دھو کر پیوں اور میں تو اس سے زیادہ اور بھی برگشتہ ہوا کہ مجھکو شبہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو کی طرح سازش نہ ہو اور ایک حمام میں سب ننگے ایک دوسرے کی پردہ داری نہ کرتے ہوں۔ ورنہ جیسے کسی کو اپنی لمبی چوڑی تعظیم کرتے دیکھا تھا بگڑ کر کہہ دیا ہوتا کہ کیا تو مجھکو بناتا ہے اگر میں عبادت ریاضت اور مجاہدہ کچھ کرتا بھی ہوں تو تجھکو کیا میری محنت تیرے کام نہ آئیگی تو اپنی آپ کر۔ اور اگر تو نے مجھ کو خدا کا مقرب سمجھ رکھا ہے تو یہ تیری غلطی ہے میں بھی ایک ناچیز سا بندہ ہوں اور اپنے عیب مجھی کو معلوم ہیں میں اپنی نجات سے تو مطمئن نہیں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ پیر خود در ماندہ کرا شفاعت کند۔ اگر شروع میں ایسا رویہ اختیار کر لیا جائے تو کوئی پاس بھی آکر نہ پھٹکے اور ایکدم سے ان خرابیوں کا انسداد ہو جائے جو اس گروہ کے سبب سے اسلام میں پھیل گئی ہیں۔ قرآن میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے لاتزکوا انفسکم ھو اعلم بمن اتقی اپنے آپ پاکیزہ مقدس نہ بنو اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے کام نہیں چلتا) خدا ہی کو خبر ہے کہ کون پاکیزہ مقدس ہے۔ اگر ایسا سمجھیں اور اس پر عمل کریں تو کوئی کیوں کسی سے بیعت لے۔ کیوں کسی کو مرید کرے۔ کیوں کسی سے ہاتھ چموائے۔ کیوں کسی سے پیروں کو ہاتھ لگوائے۔ کیوں لوگوں سے تعظیم و تکریم کا طلبگار ہو۔"

صادق :- "کیوں صاحب ایک بات کا کئی دفعہ خیال آیا اور باتوں کے سلسلہ میں ذہن سے اتر گیا جو لوگ توحید میں پورے نہیں ظاہر ہے کہ وہ اسلام میں تو آہی نہیں سکتے اور ہم ان کو بہت سے نیک اعمال کرتے دیکھتے ہیں تو کیا ان کی یہ نیکیاں برباد اور اکارت ہیں؟"

بزرگ :- "اسکا میرے پاس کچھ جواب نہیں میں نے تم کو بار بار منع کیا کہ تم دوسروں کے معاملات میں دخل نہ دو۔"

صادق :- "لیکن طبیعت میں خود بخود ایک خدشہ پیدا ہو تو کیا کیا جائے؟"

بزرگ :- "طبیعت تمہارے بس کی ہے یا تم طبیعت کے بس میں ہو؟ اگر ایسی ہی لاختیاری ہے تو

ہم مذہب کیطرف سے مطمئن ہو چکے۔ یہ طبیعت تم کو دنیا اور دین دونوں میں خوار کرے گی۔ اس طبیعت کا آدمی دنیا میں امن سے نہیں رہ سکتا! ور اس طبیعت کے نتیجہ ہیں کہ لوگ آئے دن آپسمیں جوتی پیزار کرتے رہتے ہیں۔ کوئی ایک مذہب دوسرے مذہب کو دیکھ نہیں سکتا! ور اگر انصاف سے دیکھا جائے تو جو شخص جس مذہب سے زیادہ تعصب رکھتا ہے اور دوسرے کے ہر ایک فعل کو اسکی توہین کا موجب سمجھتا ہو وہ خود بھی اس الزام سے بری نہیں مثلاً ایک ہندو ہماری مسجد کا ادب نہیں رکھتا تو وہ معذور ہے کہ وہ سرے سے اسکو عبادتگاہ ہی نہیں جانتا لیکن ہم جو مسلمان ہو کر مسجد کا بڑا ادب رکھتے ہیں۔ یہی نا کہ اسمیں جوتیاں پہنکر نہیں جاتے مگر اندر جا کر غیبت ہم کرتے ہیں جھوٹ ہم بولتے ہیں لڑتے جھگڑتے بیہودہ بکواس لگاتے ہیں۔ دنیا کا وہ کونسا کام ہے جو خانہ خدا میں نہیں ہوتا کیا اس سے مسجد کی توہین نہیں ہوتی؟ ہمارے نزدیک اس سے کہیں بڑھکر ہوتی ہے کہ دوسرے مذہب کا آدمی جوتیاں پہنکر اندر چلا جائے مگر لوگوں نے مذہب کا تو حیلہ بنا رکھا ہے ولوں میں خباثتیں بھری ہوئی ہیں۔ مذہب کی آڑ میں ان خباثتوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اور دین کے اعتبار سے تو میں دوسرے مذہب سے معترض ہونے ہی کو برا سمجھتا ہوں۔ کہ ہم کو دوسرے کے دین و مذہب سے غرض نہیں تعلق نہیں وہ جانے اسکا کام جانے ہر کسے مصلحت خویش نکو می داند! ور حدیث شریف میں آیا ہے من حسن اسلام المرء ترک مالا یعنیہ[1] اور میں دوسرے کے مذہب سے معترض ہونیکو (مالا یعنی) میں داخل سمجھتا ہوں اور ایک پہلو تو اسکا بہت ہی برا ہے کہ دوسرے کے مذہب سے معترض ہونا خدا کے اختیارات میں دخل دینا ہے یہ خدا کا کام ہے کہ وہ اپنے بندوں کی نیکی بدی کو تولے اور انکو انکے کئے کی جزا یا سزا دے۔ ہم سے وہ لوگوں کے بارے میں پوچھتا نہیں تو ہمارا دخل در معقولات۔ دنیا میں ہمارا لوگوں سے اتنا ہی تعلق ہے کہ ہماری حاجتیں ان سے اور انکی حاجتیں ہم سے متعلق ہوتی ہیں۔ اور بس اگر ہم نے مثلاً کسی سے قرض لیا ہے اور وہ ہم کو وقت پر ادا کر دیتا ہے یا ہم کو کسی نے قرض دیا ہے اور ہم سے ناحق ناروا زیادہ نہیں لینا چاہتا تو ہم کو جیسا مسلمان ولیسا ہندو ولیسا عیسائی ویسا

---

[1] آدمی کے ایمان کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جو چیز اسے درکار نہ ہو اس سے سروکار نہ رکھے۔

بُت پرست ویسا مشرک ویسا کافر ہم مسلمان ہیں کہ اپنے واسطے وہ مسلمان نہیں تو اپنے واسطے ؎

آسایش دوگیتی تفسیر این دو حرف است　　با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

دوست دشمن کا تفرقہ بھی شاعر نے کیا ہے ہمکو تو سب دوست ہی دوست دکھائی دیتے ہیں۔ دشمن اگر ہے تو اپنا نفس ہے۔ ان النفس لامارۃ بالسوء[57]۔

صادق "یہ رائے تو آپنے اب قرار دی لیکن جن دنوں آپ میری طرح دین کی طرف سے اطمینان حاصل کرنیکی فکر میں تھے اسوقت کفار کے اعمال نیک کی نسبت آپ کیا خیال کرتے تھے۔"

بزرگ "لگے مجھ سے بھی طالب العلمانہ داؤ چلنے؟ میں جو کچھ رائے رکھتا تھا اب میں نے اسکو بدل دیا ہے۔"

صادق: "تاہم اسکو سننے سے مجھکو تسکین ہوگی"

بزرگ: "تسکین تو اس سے ہوگی کہ اپنی ہنڈیا کی خیر مناؤ مگر تم اصرار کرتے ہو تو ایک حکایت کے طور پر تم سے بیان کئے دیتا ہوں۔ مجھ کو ایک مثال سوجھ گئی تھی کہ جیسے ایک شخص کسی سخت مرض میں مُبتلا تھا وہ گیا ایک حکیم حاذق کے پاس اس نے بڑی توجہ سے اسکا علاج کیا اور مریض اچھا ہو گیا شرط انسانیت یہ ہے کہ وہ حکیم کا شکریہ ادا کرے لیکن وہ عطار کے پاس دوڑا گیا۔ اسی طرح خدا نے ہر ایک آدمی کو اتنی عقل دی ہے کہ وہ خدا کو پہچانے۔ اگر وہ پہچاننے کی کوشش نہیں کرتا تو جو اعمال نیک وہ اس غرض سے کرتا ہے کہ خدا سے اسکو تقرب ہو وہ ایسا ہی غلطی میں ہے جیسے وہ بیمار عطار کا شکریہ ادا کرنے گیا تھا، مگر اس کے بعد جو تم نے اس طرح کی بات پوچھی تو مجھ سے زیادہ برا کوئی نہیں کیونکہ بحث مناظرہ میری چڑھ ہے۔"

صادق: "آپ ناخوش نہ ہوجیے، میں نے بحث کے طور پر آپ سے کچھ نہیں پوچھا بلکہ استفادہ کے طور پر۔ اور آپکے بیان سے میری پوری تسلی ہوگئی ہے اور کسی طرح کا خدشہ میرے دل میں باقی نہیں ہاں طبیعت ان خیالات سے آشنا نہیں اب انشاء اللہ فوقتاً فوقتاً غور و فکر کرکے میں ان خیالات کو راسخ کردوں گا۔"

۵۷　آدمی کا نفس تو بدی ہی کے بُرے حکم چلاتا ہے۔

نیچری فرقہ

لیکن میں اِن نیچریوں کی نسبت بھی آپکے خیالات معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آجکل ان لوگوں نے بھی بڑی اودھم مچا رکھی ہے ؟"

بزرگ۔ نیچری ابن الوقت ہیں یعنی اس زمانہ کی پیداوار۔ زمانہ کا رنگ تو دیکھو کیا کیا ہو گیا ہے۔ تمام ہندوستان میں انگریزی عملداری ہے مطمئن کہ ایسا امن کبھی ہندوستان کو نصیب نہیں ہوا۔ اسی امن کا دوسرا نام ہے آزادی۔ ہر شخص فاعل مختار رہے جو چاہے سو کرے بشرطیکہ دوسرے کی عافیت میں خلل انداز نہو۔ سرکار ایک کو دوسرے کی آزادی میں کیوں خلل انداز ہونے دیگی جبکہ رعایا کی آزادی میں اپنا خلل انداز ہونا بھی جائز نہیں رکھتی۔ آزادی کے کئے پیرایہ ہیں ان میں بڑا ضروری پیرایہ آزادی رائے کا بھی ہے جس سے ہم کو بحث ہے۔ سرکار کسی رائے میں دخل نہیں دیتی مگر جس چیز سے رائے کے قایم کرنے کی لیاقت پیدا ہوتی ہے یعنی تعلیم اسکے پیچھے ستو باندھ کر پڑی ہے۔ اسواسطے کہ دنیا کے کام بغیر تعلیم کے چل نہیں سکتے۔ ہرچند تعلیم دنیاوی چیزوں میں دیجاتی ہے اور کسی مذہب کا نام زبان پر نہیں آنے پاتا مگر ہندوستانی مذہب کے بدون ٹکڑا نہیں توڑتے ان کی عادت ہے کہ پوشاک ہو تو کھانا پینا ہو تو میز کرسی ہو تو برتن بھانڈا ہو تو ہر چیز کو مذہب میں لے دوڑتے ہیں یہ تعلیم کو کیا بخشتے۔ مدتوں لوگ اسی خبط میں رہے کہ تعلیم کا اصلی مقصود عیسائی بنانا ہے مگر جھوٹ کے پاؤں کہاں۔ ادر ادھر بڑی پیٹ کی مار اور یہ بھی دیکھا کہ تعلیم کی بھٹی میں تو سوکھا اور گیلا سبھی جلا چلا جاتا ہے ہندو مسلمان عیسائی یہودی کون ہے جو اسکی آنچ سے بچا ہو بارے وہ اگلی سی وحشت تو نہیں مگر انس بھی نہیں۔ بہت سی دوائیں ہیں کہ فائدہ [illegible] بارسی اکسیر کا حکم رکھتی ہے جیسے کونین ہوئی یا کاڈلیور آئل ہوا مگر کونین تو اس بلا کی کڑوی ہے کہ [illegible] نا پر نہیں رکھی جاتی کسی میں ہیک ہے کہ حلق سے نہیں اترتی۔ اور جب طبیعت دوا کو قبول نہ کرے تو فائدہ کیا خاک ہو اسلیئے لوگوں نے کونین کی تلخی دور کرنے کیلیئے گولیاں نکالیں۔ کونین [illegible] اوپر کوئی اور چیز خوش مزہ یا بد مزہ نہیں بے مزہ۔ کاڈلیور آئل ہیں جو کا نشاستہ ملا اور [illegible] ملادیں کہ

کا ٹو اور آنول کی مہک بھی دب گئی۔ اور اس کے اثر کو بھی تائید ہوگئی۔ یہی حال نئی تعلیم کا ہے کہ اسکے آگے اکسیر کی کچھ حقیقت نہیں مگر مذہبی خلط والوں کو کچھ بھی نہیں۔ کیا مشکل میں جان ہے کہ مفلسی جیسا تو مہلک مرض اور دوائی یہ ایک تعلیم نہ پینے بن پڑتی ہے اور نہ بے پئے رہا جاتا ہے نیچریوں نے تاویل کی ایک ترکیب نکالی ہے۔ اس سے مذہبی مذاق کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ پھر تعلیم کی دوا مطلق ناگوار نہیں معلوم ہوتی۔ بس انکی دوا میں یہی ایک عیب ہے کہ مذہبی مذاق کو معطل کردیتی ہے جیسے مخدر دوا ہیں کہ جہاں لگا دو اتنا ٹکڑا اس سُن پڑ جاتا ہے ورنہ نیچریوں کے مسلمان ہونے میں اور انکی نیت کے بخیر ہونے میں ذرا بھی شک نہیں

صادق: "لیکن مذاق مذہبی جو بڑی ضروری اور بکار آمد قوت ہے وہ جو باطل ہوئی جاتی ہے

بزرگ: "کیا کیا جائے مقام مجبوری ہے؟"

صادق: "ایسی کاہے کی مجبوری ہے؟"

بزرگ: "مجبوری یہ ہے کہ تعلیم بھی تو اپنی جگہ قایم نہیں ہے۔ انگریزی عملداری سے پہلے ہمارے یہاں کی بھی کیا۔ لفاظی اور منطق و فلسفہ کے خیالی ڈھکوسلے سو وہ سارا دفتر گاؤ خورد ہو گیا اب تو ہندسہ اور ریاضی اور طبیعیات ایسے علوم کی قدر ہے جن کا مدار بدیہیات اور مشاہدات پر ہے اور ایسے علوم دنیا میں کام بھی آتے ہیں ایسے ہی علوم سے ریلیں چل پڑیں۔ تار دوڑنے لگے۔ ہزارہا قسم کی کلیں ایجاد ہوگئیں ان علوم کو پڑھتے پڑھتے آدمی کی طبیعت کچھ ایسی ہو جاتی ہے کہ بے مشاہدہ اسکو کسی بات کا یقین ہی نہیں آتا وہ ہر جگہ ڈھونڈتا ہے اقلیدس کا ثبوت یا حساب اور جبر و مقابلہ کا سوال۔ مذہب کے اعتبار سے یہ پہلا خلل ہے جس سے آجکل کا کوئی تعلیم یافتہ دماغ خالی نہیں طبیعت تو واقف ہوئی ایسی اور مذہب کی جڑ بنیاد خدا کی شناخت جسکو نہ کسی نے دیکھا اور نہ کوئی دیکھ سکتا ہے تو ایسی طبیعتوں میں اور مذہب میں کیونکر التیام ہو اگر مذہب ہی مشاہدے کی چیز ہوتی تو جوتیوں میں دال ہی کیوں بٹتی سب کی ایک مت ہوتی نہ کوئی کسی کو کافر بناتا۔ نہ کوئی کسی کو جہنم میں ڈھکیلتا! مذہب کو پھر بھی صبر کرنیکی جگہ ہے کہ اسکو کچھ نہیں سوجھتا الیاس احدی الراحتین۔ بڑی مصیبت تو اسکی ہے جو اندھا بھی نہیں کہ صبر کرے

اور اسکو نور کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہی نہیں دیکھتا تو دل نہیں مانتا، اور دیکھتا ہی تو صاف نظر نہیں آتا بعینہ یہی حال ہی انسان کا مذہب کے بارے میں۔ اسکا دل گواہی دیتا ہی کہ خدا ہی اسواسطے کہ وہ اسکی آواز سنتا اور اسکی آہٹ پاتا ہی مگر نہ دکھائی دیتا اور نہ پکڑائی دیتا۔ پھر اسکا دل گواہی دیتا ہی کہ گو میں دنیا سے کوچ کر جاؤں اور میری لاش کو جلا کر راکھ کر دیں اور راکھ کو دریا میں بہا دیں یا قبر کھود کر گاڑ دیں اور میرے بدن کو کیڑے کھا ڈالیں مگر میں کسی جون کی شکل میں رہوں۔ رہوں گا ضرور۔ پھر اسکا دل گواہی دیتا ہی کہ میں دنیا میں اچھے کام بھی کر سکتا ہوں برے بھی کر سکتا ہوں اچھا کروں تو مجھکو شاباش ملے گی اور برا کروں تو میری شامت آئیگی بس مذہب کے بارے میں عقل انسانی کی پرواز ہوچکی۔ گو وہ انسان افلاطون یا افلاطون کا باوا ہی کیوں نہ ہو اور کوڑھ میں کھاج عقل کی نارسائی پر ماشاء اللہ کریہ کہ سب کچھ جان لوں اور خدا ہو جاؤں اور یہ ساری آفت کاہیکی ہی؟ اسی کریدکی کہ حضرت آدم سے صبر نہ ہو سکا۔ اور جس درخت کے کھانیکی مناہی تھی اسکو کھایا پر کھایا۔ انہوں نے کھایا اور اسی کے مزے ہم پڑے چکھ رہے ہیں۔ طبیعت کی کرید دیکھکر خدا نے پیغمبر بھیجے کہ جہانتک انسان کا ظرف متحمل ہو سکے اسکو وہ بات بتا دیجائے جس کی ٹوہ میں لگا ہی۔ پیغمبروں نے بتایا سمجھایا مگر جی میں تو سمجھو۔ "پھلا کیا کوئی سمجھاے مجھے" وہ کرید نہ گئی پر نہ گئی کہ دنیا کی چیزوں کی طرح خدا کو دیکھوں۔ اس سے۔ میری باتیں ہوں، اسکا منشا معلوم کروں، دنیا سے جو جو کچھ پیش آلی ہے سب پرجادی ہے۔ دوں یہ کرید تھوڑی بہت سبھی میں ہی اور آجکل کے تعلیم یافتوں میں تو جنون کی حد کو پہنچ گئی تھی۔ قریب تھا کہ لوگ قید اسلام سے آزاد ہو کر کہیں کو آوارہ ہو جائیں انکی روک تھام کیلئے نیچری کھڑے ہوئے تو سورش تو فرو ہو گئی اور رہی سہی اور فرد ہوتی جاتی ہے کہ اب کوئی انگریزی پڑھا ہوا مسلمان چاہے وہ ایم اے اور ایل ایل بی یا بیرسٹر ہی کیوں نہ ہو احاطۂ اسلام سے بھاگنے کا نام نہیں لیتا، مگر سرک تو جلتے ہی جائینگے۔"

صادق" اگر یہ ہے تو نیچری ہم مسلمانوں کی شکرگذاری کے مستحق ہیں۔

بزرگ" خیر اگر شکرگذاری کے مستحق نہ بھی ہوں تو لعنت اور گالیوں کی بوچھاڑ کے بھی سزاوار نہیں

جو ان پر چاروں طرف سے پڑی برس رہی ہیں۔ یہ تو دل سے اسلام اور مسلمانوں کے خیرخواہ ہیں انکو خود بڑی مشکل درپیش ہے۔ کیونکہ مرض ہے سخت اگر اسکو جنون سمجھا جائے تو وہ ایسا خطرناک جنون ہے کہ مجنوں شاید اپنے تئیں یا دوسرے کے تئیں کسی طرح کا نقصان نہ پہنچا بیٹھے اور پھر جنون بھی ہے تو نئی قسم کا اس کیلئے علاج بھی نیا تجویز کرنا پڑتا ہے اور نئے علاج میں کچھ غلطی بھی ہو تو چنداں لحاظ کے قابل نہیں۔"

صادق: "آپ نے نیچرل کے اصول تو خوب دریافت کئے مگر یہ فرمایئے کہ اسلام اور تعلیم میں التیام کا انھوں نے کیا طریقہ نکالا۔؟"

بزرگ: "انہوں نے طریق یہ نکالا کہ جہاں تک ہو سکا اسلام ہی کو دبایا۔ اور بات بات میں تعلیم اور عقل کی جانبداری کی۔"

صادق: "یہ تو ایک طرفہ فیصلہ ہوا!"

بزرگ: "اس میں شک بھی کیا ہے اور اسی سبب سے تو میں انکی ہاں میں ہاں نہیں ملاتا۔"

صادق: "اچھا اگر تعلیم اور عقل کی جانبداری نہیں کرتے تو کرتے کیا؟ تعلیم یافتہ تو کسی طرح دبنے والے تھے نہیں۔"

بزرگ: "بتاؤں کیا کرتے عقل اور مذہب دونوں میں حدبندی کر دیتے جیسے ان دنوں ہماری سرکار روس اور افغانستان کے مقابلہ میں کر رہی ہے۔ مگر عقل اور مذہب کے مقابلہ میں جو حدبندی کی جاتی ہے اسمیں الگ الگ تین طرح کی حدبندی ہوتی۔ ایک تو علاقہ جس میں مذہب ہی مذہب ہو اور عقل کو قطعی ممانعت کر دیجاتی کہ اپنے قدوم نحوست لزوم اس علاقہ میں نہ لائے دوسرے خالص عقل کا علاقہ کہ حضرت مذہب وہاں جانیکی تکلیف نہ فرمائیں تیسرا علاقہ مشترک کہ اسمیں عقل اور مذہب دونوں یکساں دخیل ہوں۔ عام مسلمان تو بیچارے بھولے بھالے سیدھے سادے سمجھتے ہیں کہ مذہب اور عقل دونوں جڑواں بھائی ہیں۔ ان میں لڑائی کا بانٹیا لیکن جن کو عقل (اس زمانے کی عقل ہی) وہ جانتے ہیں کہ عقل اور مذہب میں سدا سے کھٹ پٹ ہوتی چلی آئی ہے۔ اور وہ دونوں میں نہ کبھی بنی اور نہ کبھی بنے۔ عام مسلمانوں نے تو ایک کان کیا گو نگا

انکے کان کیا بہرا۔ انکو عقل و مذہب کی لڑائی کی خبر ہی نہیں اور نہ ان کیلئے حدبندی کی ضرورت جن کو عقل کے بڑے لمبے چوڑے دعوے ہیں ان ہی کی حدبندی کی ضرورت بھی ہے ہم نہیں کہتے کہ نیچریوں نے مذہب اور عقل کے اختلاف کو یا حدبندی کی ضرورت کو نہیں سمجھا۔ سمجھا اور خوب سمجھا۔ مگر علاقہ ۱ کو توڑکر علاقہ ۲ میں شامل کر دیا اور یہ بڑی غلطی کی کہ ہمیشہ ہمیشہ کو جھگڑا قایم کا قایم رہا۔"

صادق۔ "ذرا علاقوں اور ان کی حدبندی کی صراحت تو کیجیے۔"

بزرگ۔ "لو میں اکثر مذہبی باتوں کو علاقہ نمبر(۱) قرار دیتا ہوں کہ اسمیں مذہب ہی مذہب ہو اور عقل کا دخل نہ ہو میں تم سے بیان کر چکا ہوں کہ مذہب کا سارا دارومدار خداشناسی پر ہے۔ خدا کو مانا اپنے تئیں نیک و بد کا ذمہ دار سمجھا اور مرے بعد اپنے باقی رہنے کا یقین کیا تو ان سب خیالات کے جمع ہونیسے مذہب پیدا ہوا اور خداشناسی میں جہاں تک ہم کو ملکہ ہے وہ بھی بیان کر چکا ہوں تو سرے سے مذہب کی بنیاد ہی نامفہوم چیز ہے تو ایسا علاقہ نکلا یا نکلا جہاں مذہب ہی مذہب ہے عقل کا دخل نہیں ہیں اکثر مذہبی باتوں کو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ ان میں عقل کو دخل دینا وضع الشئے فی غیر محلہ ہے مثلاً خدا کی ذات صفات میں عقل دوڑانی لاحاصل ہونیکے علاوہ دخل احمق ہے۔ اسی طرح بعد مرگ جو جو حالتیں پیش آئینگی ان میں رائے زنی کرنا دخل احمق ہے۔ تمام جزئیات شرعیہ کی مصلحتوں کو معلوم کرنے کی کوشش کرنا دخل احمق ہے جبر و قدر کی پہیلی کے پیچھے پڑنا دخل احمق ہے۔ یا روح کی ہیئت کے درپے ہونا دخل احمق ہے اور اسی طرح سیکڑوں باتیں نکلیں گی جہاں عقل کے پر جلتے ہیں تو کیوں ایسا علاقہ قایم نہ کیا جائے جہاں عقل کا مطلق دخل نہ ہو۔ علاقہ نمبر(۲) دنیا کے دھندے ہیں کھیتی میں چنے بوئیں یا مٹر۔ جوتی سلیم شاہی پہنیں یا گول پنجے کی یا بوٹ یا گرگابی۔ کہ ایسی باتوں سے مذہب سے کچھ سروکار نہیں۔ علاقہ نمبر(۳) تمام اخلاقی باتیں ہیں کہ عقل اور مذہب دونوں کا ان پر اجماع ہے۔"

صادق۔ "یہ آپنے عقل و مذہب میں حدبندی اور علاقوں کی تقسیم تو خوب نکالی۔"

بزرگ۔ "جی ہاں ایسا نہ کریں تو مذہب کیطرف سے اطمینان کیونکر ہو۔ یہ من سمجھوتیاں برسوں کی

غور کے نتیجے ہیں اور برسوں ہی کے غور میں ذہن نشین بھی ہوتے ہیں۔"

صادق۔ تو آپ کے نزدیک نیچریوں نے کیا غلطی کی ذرا پھر فرمائیے گا؟"

بزرگ۔ اصل غلطی تو یہ ہے کہ عقل سے اسکی بساط سے بہت زیادہ کام لینا چاہتے ہیں اور غلطی کا قاعدہ ہے کہ بڑی جلدی انڈے بچے دیتی ہے جہاں ایک بڑی غلطی کی اور اس سے دو دوسری غلطیاں پیدا ہوئیں اگر تو ان لوگوں کو غیر ضروری باتوں میں بہت وقت ضائع کرنا پڑتا ہے اور پھر عقل کی نارسائی کے تسلیم کرنیکی تو کھائی ہے قسم، ایسی ایسی مکروہ غلطیاں کرتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی ہے اور اصل مطلب فوت ہوتا ہے سو الگ۔ حدیث تفسیر فقہ تو بالائے طاق رکھ ہی دیا تھا صرف ایک قرآن بچا تھا وہ بھی اسلیئے کہ اس پر انا لہ لحافظون کا پہرا تھا تو اسکو بھی مارے تاویلوں کے ایسا الو کیا ہے کہ اسکی فصاحت و بلاغت پر پانی پھیرا تو پھر ظاہر عبارت پر سے اعتماد اٹھ گیا۔ چلے تھے لوگوں کو مسلمان کرنے۔ ان کو اصل دین یعنی قرآن میں بھی شک پڑ گئے ہیں آپ جو بزرگوں سے کان گانٹھنے پر آؤں اور قرآن اور یہ مادت کو ایک نہ کر دکھاؤں تبھی کہنا۔"

صادق "مجھ کو تو کوئی خاص مثال دیکر نیچریوں کی سمجھائیے تب میری تسکین ہو۔"

بزرگ۔ "مثالوں کو لیکر کیا کروگے؟ وہی کلیہ قاعدے کیوں نہیں یاد رکھتے جو پہلے تمکو بتا دیئے ہیں کہ عقل انسانی قاصر و محدود ہے، اسکو اسکی حد سے باہر مت ہونے دو۔ اور دین میں سینکڑوں اور ہزاروں باتیں ہیں سب پر مقدم اپنے نفس کی اصلاح اور معلوم ہے کہ آدمی تا مرگ اصلاح نفس سے فارغ نہیں ہو سکتا پس ضروری کو چھوڑ کر غیر ضروری باتوں میں مشغول ہونا وقت جیسی قیمتی چیز کا ضایع کرنا ہے جس کی باز پرس ہونی ہے تو جب کوئی مذہبی بات تمہارے سامنے پیش آئے سب سے پہلے دیکھو اصلاح نفس سے متعلق ہے یا نہیں۔ اگر نہیں یا عقل انسانی کی رسائی سے باہر ہے اور جھگڑے کی ساری باتیں اسی قسم کی ہیں تو اس کان سنو اور اس کان اڑا دو شیطان کے بہکانے ڈھکانے کے ہزاروں رستے ہیں۔ ان میں کثیر الوقوع یہ بھی ہے کہ آدمی دین سمجھکر ایک کام میں لگا رہتا ہے اور اس شغل کو کار نیک سمجھکر اسکے اجر و ثواب کی توقع رکھتا۔ حالانکہ وہ کام نیک ہو یا نہ ہو۔ اس کے

نہ کرنے سے اس پر کسی طرح کا الزام نہیں اور سینکڑوں ضروری کام ہیں جنکی بازپرس ہوتی ہے وہ رہ جاتے ہیں اور آدمی انکے سرانجام میں غفلت کرتا ہے یہ آفت اکثر پڑھے لکھوں میں ہوتی ہے کچھ لوگ انکی لیاقت اور ذہانت کی تعریفیں کرتے ہیں اور یہ سن سنکر پھولے نہیں سماتے شاید انہی نیکی بھی کی ہو کہ دوسروں کو غلطی اور گمراہی سے بچایا مگر عجب و خود پسندی سے اپنے تئیں تو تباہ کرلیا۔ وھم[1] یحسبون انہم یحسنون صنعا دوسرے لوگوں کے جھگڑے تو پرانے پڑ گئے ہیں اب کوئی انکی طرف آنکھ اٹھاکر بھی نہیں دیکھتا۔ اور یہ مقلدوں غیر مقلدوں کی نزاعیں ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں باتیں ہیں کہ تمام سمجھدار آدمی ان پر ہنستے ہیں مگر ہاں نیچری فرقہ نیا کھڑا ہوا ہے اور اس میں لوگ بھی بڑے بڑے ذہین اور لائق ہیں سو یہ بھی آخرکار کسر انکسار ہوکر ایک ایکدن اپنے ٹھکانے لگ جائیں گے ان کی کون سی خاص بات بیان کروں دعا و قدرت و وحی اور معجزات اور ملائکہ اور شیطان اور جنت اور دوزخ اور آسمان ایک چیز بھی انہوں نے نہیں چھوڑی جس میں عقلی تکے نہ چلائے ہوں انھوں نے اپنا اصول ہی ٹھیرا رکھا ہے کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ جو بات سمجھ میں نہ آئی اس سے انکار اور نہیں ان سب کو غیر ضروری اور ایک انسان ہی بالاتر سمجھتا ہو"

دعا

صادق: "اگر آپ دعا وغیرہ ان ہی چند باتوں کی نسبت اپنی رائے ظاہر فرمائیں تو میں نہایت درجہ ممنون ہوں گا اور شاید میں اس سے زیادہ آپکو تکلیف بھی نہ دوں"

بزرگ: "دعا کا حال یہ ہے کہ میرے نزدیک کوئی فرد بشر اس سے منکر نہیں یعنی کوئی بندہ بشر نہیں جو مصیبت میں دعا نہ مانگتا ہو اور دعا نہیں مانگتا دل کی خالی خولی تسلی کیلئے۔ بلکہ اس تسلی کیلئے جو حصول دعا سے ہوتی ہے یعنی ہر فرد بشر کو کامل یقین ہے کہ کوئی اسکے دکھ درد سننے والا ہے اور ایسا سننے والا کہ وہ اسکی مدد کرسکتا ہے اور اسکو پورا بھروسہ ہے کہ کریگا۔ تو یہ انسان کی ایک طبعی بات ہوئی اور دعا سے انکار کرنا اصول نیچر کے خلاف ہے۔ فلاسفہ میں سے ایک گروہ سوفسطائیوں کا ہے وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں چیز ہے ہی نہیں یہ سب وہم کا کارخانہ ہے۔ ایک چیز جس کو ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں خارج میں نہیں اسکا

---

[1] اور ان کو خیال ہے کہ ہم اچھا کر رہے ہیں۔

وجود نہیں۔ ہمارے وہم نے اسکو موجود مان لیا ہے۔ وہ لوگ خوشی اور رنج اور درد کسیکے قائل نہیں مگر باایں ہمہ دنیا بھی ہی اور اسمیں بے شمار مخلوق بھی ہی خوشی اور رنج بھی ہی اور راحت اور درد بھی ہی۔ کیوں ہے؟ اسلیئے کہ ہم دیکھتے اور احساس کرتے ہیں غرض ہمارا دیکھنا اور احساس کرنا ہی چیزوں کے موجود ہونیکی دلیل ہی اور اسکے سوائے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہی اور نہ کسی اور دلیل کی حاجت۔ اسی طرح دعا بھی ہی کیوں ہے؟ اسلیئے کہ ہم کو خود بخود اسکے ہونیکا یقین ہی۔ جو شخص دعا کا منکر ہو اسکو چاہیئے کہ دعوے اسلام سے دست بردار ہو کر سوفسطائیوں میں جا ملے۔ مگر نیچری ہونا اور انسان سے نیچر کو نہ ماننا اور سوفسطائیوں کی سی باتیں کرنا اور اسلام کا دعویٰ۔ یہ تو کوئی معقول بات نہیں رہی یہ بات کہ کیوں ہر طرح کی دعا قبول ہوتی اور کیوں ہمیشہ قبول نہیں ہوتی۔ اس سے تو دعا کو اور تقویت پہنچتی ہی کہ باوجودیکہ ہر طرح کی قبول نہیں ہوتی اور ہمیشہ قبول نہیں ہوتی پھر بھی لوگ دعا کیئے ہی جاتے ہیں اسواسطے کہ دعا ان کی فطرت میں داخل ہی۔ دعا کا تو نام ہی اصل فکر اس بات کی ہی کہ خدا کی قدرت محدود ہے یا نامحدود۔ میرے روبرو یہ مسئلہ پیش کیا جائے تو میں فوراً اس بحث کو بند کر دوں کہ خدا کی ذات او صفات میں زیادہ غور و خوض کرنا ہماری عقل کی رسائی سے باہر بات ہی لیکن لوگوں کے سروں میں میرا دماغ نہیں۔ دماغوں میں میرے خیالات نہیں۔ نیچری خدا کو قادر مطلق تو مانتے ہیں مگر اس طرح پر کہ اس نے اپنی مرضی سے ایک قاعدے پر دنیا کے انتظام کو چلا دیا۔ اب وہ قاعدہ ٹوٹ نہیں سکتا نہ اسواسطے کہ خدا اسکو توڑ نہیں سکتا بلکہ اسواسطے کہ وہ اسکو توڑنا نہیں چاہتا۔"

صادق "کمبخت بات تو منہ سے ایسی اتار کر لاتے ہیں کہ کسی کے اٹھائے نہ اٹھے۔"

بزرگ "یہ سچ ہی کہ دنیا کا انتظام ایک سنت پر چل رہا ہی اور اسمیں بھی شک نہیں کہ وہ سنت ناقابل تبدیل بھی معلوم ہوتا ہی مگر ہماری معلومات اسقدر ناقص ہی کہ اول تو ہم یقینی طور پر یہ نہیں جان سکتے کہ وہ سنت ہی کیا۔ ہم ایک واقعے کو دیکھتے ہیں کہ اور اپنے نزدیک اسکا ایک سبب ٹھیرا لیتے ہیں۔ ممکن ہی کہ جس کو ہم نے سبب سمجھا ہو وہ سبب کافی نہ ہو۔ اس میں کچھ شرائط ہوں، یا اس کے ساتھ دوسرے اسباب ہوں، اور وہ ہم کو معلوم نہ ہوئے ہوں۔ یہ نہیں یا ور تاریخی اور ہزارہا قسم

کی کلیں جو چل پڑی ہیں انکے معنی کیا ہیں کہ نئے نئے اسباب انسان کو دریافت ہوتے چلے جاتے ہیں۔ دوسرے زمانہ گذشتہ کے حالات بھی تو مبہم ہیں کوئی شخص وثوق کے ساتھ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ شروع دنیا سے فلاں واقعہ کے خلاف کبھی نہیں ہوا۔ ہاں یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے علم میں اسکے خلاف نہیں ہوا لیکن کیا وہ اور کیا اسکا علم؟ یہ برسالی مینڈک جو برسات کا پانی پڑنے سے زمین میں کودنے اچھلنے اور رینگنے لگتے ہیں انکو کیا خبر کہ دنیا میں گرمی اور جاڑے کے موسم میں کیا ہوا کرتا ہے زمانہ کے امتداد پر نظر کرو، اور پھر انسانی ہستی کو دیکھو تو آدمی حشرات الارض سے کچھہ زیادہ وقعت نہیں رکھتا، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ باوجودیکہ ہم دنیا کے انتظام کو ایک نسق پر چلتا ہوا دیکھتے ہیں ساتھہ ہی ہم اسکو قابل تبدیل بھی سمجھتے ہیں ورنہ دعائیں کیوں کرتے۔ رہی یہ بات کہ دنیا کے انتظام کو ہم کیوں قابل تبدیل سمجھتے ہیں؟ اسکا وہی جواب کہ ہماری فطرت ہی اسی طرح کی واقع ہوئی ہے مزہ تو اسی میں ہے کہ نیچری کو نیچر قائل کرے۔ نیچریوں نے اپنی اسی رائے کے نتائج پر نظر نہیں کی ورنہ ایسی بات انکو منھہ سے بھی نکالنی مناسب نہ تھی ؎

تو برائے وصل کردن آمدی ❊ نے برائے فصل کردن آمدی

میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ اگرچہ دنیا کے امن و انتظام میں حکام ظاہر کو دخل ہے مگر مذہب جتنا آج دنیا کے تمام لوگوں کی (صرف معدودے چند نیچریوں کی نہیں اور منھہ سے کہنے کی سند نہیں بلکہ واقع میں نہ دل سے) یہ رائے ہو بیٹھے کہ خدا نہیں یا ہے اور جو کچھہ اسکو کرنا تھا کرچکا۔ پھر دیکھو دنیا کا کیا رنگ ہوتا ہے۔ فرانس اور اٹلی نے حکماً مذہب کو انتظام دنیا سے خارج کرکے کیا پھل پایا، مردم شماری گھٹ گئی، جرائم کی تعداد اضعافاً مضاعفہ بڑھ گئی، ملک سے برکت سلب ہوگئی تو ہار کر پھر چاہتے ہیں کہ حسب دستور سابق مذہب کو رواج دیں، مذہب سے علیحدہ ہو کر دنیا میں نیکی رہ ہی نہیں سکتی، اور اس جگہ مذہب سے مراد ہے یہی خیال کہ خدا اپنی ذات سے دنیا میں تصرف کرتا ہے اور وہ اسباب کا محکوم یا محتاج نہیں ہے۔

(وحی اور معجزات)

صادق۔ "اچھا اب چلیے وحی۔"

بزرگ۔ "یہ بحث جا پہنچی ہی خدا کی صفات میں۔ جب ہم نے ایک شخص کو پیغمبر مانا اور تسلیم کر لیا کہ اس بندے کو خدا سے خاص تقرب حاصل ہی تو اب اس تقرب کی کیفیت میں ہم کلام نہیں کر سکتے وہ بندۂ مقرب اپنے تقرب کی نسبت جو کچھ بیان کرے ہم کو مان لینا پڑیگا اور اسکی زیادہ تفتیش کرنے سے ہم کو فائدہ ہی کیا۔ تقرب ہی تو اسکو ہی نہ کہ ہمکو۔ ہم کو اس تقرب سے کام ہی نہ تقرب کی کیفیت سے"

صادق "اچھا معجزات؟"

بزرگ "یہ قدرت کی بحث کا ضمیمہ ہی۔ بات ایک ہوتی ہے اور اسمیں شاخ در شاخ بہت سی باتیں نکلتی چلی آئی ہیں۔ اس پر بھی ساری ہی قوموں کا اجماع ہے کہ وہ کونسا مذہبی گروہ ہی ذرا میرے سامنے آئے جو معجزات اور خوارق عادات اور کرامات اور استدراج کا قائل نہیں اور قائل بھی ایسے ایسے لوگ ہیں کہ ایسے مقدس آدمی جھوٹ بولنے لگیں تو جانو کہ دنیا میں کہیں سچ کا نام نہیں۔ خدا کی قدرت پر نظر کرو تو معجزہ کچھہ تعجب نہیں۔ دنیا کا ہر واقعہ معجزہ ہی۔ فرق اگر ہے تو اسی قدر ہی کہ ایک چیز آئے دن واقع ہوتی رہتی ہی ہم اس سے خوگر ہو گئے تعجب نہیں کرتے۔ ایک چیز جو معمولی چیزوں سے وقعت میں کم بھی ہو شاذ و نادر واقع ہوتی ہی ہم کو تعجب ہوتا ہے۔ ان[1] فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنہار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتہا وبث فیہا من کل دابۃ وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لایت لقوم یعقلون یہ بھی ذرا خیال کرنیکی بات ہے کہ اگر کوئی واقعہ خلاف عادت واقع ہو تو گواہی کے سوائے اسکا اور کیا ثبوت دیا جا سکتا ہے اور گواہی کو لوگ صرف اسوجہ سے متہم کریں کہ واقعہ خلاف عادت ہے

---

[1] بیشک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات کے رد و بدل میں اور کشتی میں جو لوگوں کے کام کی چیزیں لیکر دریا میں چلتی ہیں اور مینہہ میں جسکو اللہ نے آسمان سے برسا کر زمین کو اسکے مرے پیچھے ہرا بھرا اٹھایا اور ہر طرح کے چلتے پھرتے جانور اسمیں پھیلائے اور ہواؤں کے الٹ پلٹ میں اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرا رہتا ہے سمجھنے والوں کیلیے بہتیرے ہی قدرت کے نشان ہیں۔"

تو یہ نری زبردستی اور ہٹ دھرمی نہیں تو کیا ہے؟ علاوہ بریں میں تو معجزات کی کچھ ایسی بڑی قدر بھی نہیں کرتا۔ وہ اور کوئی ہونگے جنکو معجزات سے تسکین ہوتی ہوگی ہم کو تو تسکین ہوتی ہے پیغمبر کی تعلیم سے، پیغمبر کی طرز زندگی سے"

صادق - "اب ملائکہ کا نمبر ہے"

بزرگ، " ملائکہ سے جو انکار کیا جاتا ہے تو صرف اتنی بات پر کہ دکھائی نہیں دیتے سو خدا کرے ابھی نہ دکھائی دیں یوم یرون الملٰئکۃ لابشری یومئذ للمجرمین ویقولون حجرا محجورا[۱]- تاویل یہ کرتے ہیں کہ ملائکہ سے مناسب مقام کابلیوں کی طرح کے قوی ہیکل لوگ یا اللہ کے نیک بندے یا انسان کی وہ روحانی قوتیں جو نیک کام کرنیکی داعی ہوتی ہیں مراد ہیں لیکن ہم فرشتوں کو اسی طرح کی مخلوق مانیں جیسا کہ عام مسلمان مانتے ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کیا قباحت لازم آجائیگی۔ یوں بھی خدا اپنے تصرفات دوسری چیزوں کے ذریعے نافذ کرتا ہے وہ ذریعہ مثلاً (آگ پانی ہوا) نہ ہوئے فرشتے ہوئے سہی۔ اور فرشتوں کے نہ دیکھ سکنے کی کیا شکایت کریں جبکہ اپنی روح جسکو ساری عمر بغل میں پالا کئے۔ دیدار کے دکھانے کی روادار نہیں۔ ملائکہ کے متعلق ایک قصہ قرآن میں ہے کہ خدا نے آدم کو پیدا کرکے زمین میں اسکو اپنا نائب بنانا چاہا تو فرشتے معترض ہوئے۔ خدا نے آدم اور فرشتوں سب سے چیزوں کے نام پوچھے۔ آدم اس امتحان میں پاس ہوا اور کل فرشتے فیل۔ تب خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کا ادب کریں۔ صرف شیطان نے نافرمانی کی اور راندہ گیا۔ یہاں فرشتوں سے نیکی کا رجحان اور شیطان سے بدی کا میلان مراد لیتے ہیں کہ خدا میں اور فرشتوں سے بحث کا ہونا سخت نامعقول بات ہے لیکن اگر خدا میں اور فرشتوں میں بحث کا ہونا نامعقول بات ہے تو خدا میں اور آدم کی نیکی کے رجحان اور بدی کے میلان میں بحث کا ہونا اس سے زیادہ تر نامعقول بات ہے اور یوں ہنسی اڑانے پر آو تو ہر ایک بات کی ہنسی

---

[۱] جس دن فرشتے نظر آئینگے گنہگاروں کیلئے کوئی خوشی نصیب نہ ہوگی اور فرشتوں کو دیکھکر کہیں گے دور دفان۔

اڑائی جاسکتی ہے وکان[1] الانسان اکثر شیئ جدلا مجھکو تو اس ہنسی اڑانے پر قران کی وہ آیت یاد آئی وان[2] تقول نفس یاحسرتی علی ما فرطت فی جنب اللہ وان کنت لمن الساخرین اسی طرح ایک مسلمان کی ایک تحریر پر نظر پڑی وہ عیسائیوں کی اس دعا کا ٹھٹھا مسخر کرتا ہے جو گرجاؤں میں مانگی جاتی ہے کہ "اے ہمارے آسمانی باپ تیرے نام کی تقدیس ہو، تیری بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسی آسمان میں ہے ویسی زمین پر ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے"۔ اسپر وہ مسلمان صاحب فرماتے ہیں کہ پیٹ بھرنیکی دعا تو گدھا بھی ہر روز مانگتا ہے۔ یعنی یہ دعا خدا کی تعلیم کی ہوئی نہیں معلوم ہوتی۔ یہانتک تو چنداں مضائقہ کی بات نہیں کہ مسلمان تورات و انجیل کو محرف سمجھیں اتنی پرانی کتابوں کا ترجمہ در ترجمہ ہوکر تبدیل سے محفوظ رہنا قرین قیاس نہیں۔ کچھ بھی کرو ترجمہ میں اصل کی شان تو باقی رہتی نہیں اور یہ آزمائی ہوئی بات ہے۔ اسپر وہ آفتیں جو یہودیوں اور عیسائیوں پر مخالف مذہب والوں کے ہاتھ سے نازل ہوتی رہیں جلاوطن کردیئے گئے۔ انکی کتابیں چھین کر جلادیں اور اس زمانہ کی کتابیں ایسی تھیں ہی کتنی۔ پھر مذہب میں ایسے بدنفس بھی ہوتے رہے ہیں جو عندیا لالچ میں آکر اور نہیں تو معنوں ہی میں الٹ پھیر کرنیکو موجود ہو جاتے ہیں لیکن بایں ہمہ اسلام نے تورات اور انجیل کا برابر ادب قائم رکھا ہے پیغمبر صاحب ان ہی کتابوں سے استشہاد کرتے تھے۔ مصدقا[3] لما معکم انا[4] انزلنا التوراۃ فیہا ھدی ونور وقفینا[5] علی آثارھم بعیسی بن مریم مصدقا لما بین یدیہ من التوراۃ وآتینٰہ الانجیل فیہ ھدی ونور ومصدقا لما بین یدیہ من التوراۃ وھدی وموعظۃ للمتقین جن کتابوں کو خدا ہدی اور نور اور مواعظ فرمائے مسلمان کی یہ شان نہیں ہونی چاہیئے کہ ان کی توہین کرے اور خدا کی تعلیم کی ہوئی دعا کو گدھے کے رینگنے سے بھی گئی گذری سمجھے۔ ہمارے

---

[1] مگر انسان تمام مخلوقات سے زیادہ جھگڑالو ہے [2] آخر کار تم میں سے کوئی کہنے لگے کہ اے افسوس میری (اس کوتاہی پر) پر جو میں نے (دنیا میں خدا ملحوظ رکھنے) میں کی اور میں تو ان باتوں پر ہنستا ہی رہا۔ [3] کتاب تورات کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے [4] ہم (ہی) نے تورات نازل کی جس میں ہر طرح کی ہدایت اور نور (ایمان) ہے [5] اور بعد کو ان ہی پیغمبروں کے قدم بقدم ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو چلایا کہ وہ تورات کی جو ان کے وقت میں پہلے سے موجود تھی تصدیق کرتے تھے۔ اور ان کو ہم نے انجیل (بھی) دی جس میں ہر طرح کی سوجھ اور راہ راست (ہدایت) موجود ہے اور تورات جو اس کے نزول کے زمانہ میں پہلے سے موجود تھی (یہ انجیل) اسکی تصدیق بھی کرتی اور خود بھی پرہیزگاروں کیلئے ہدایت اور نصیحت ہے"

خیال میں تو نہیں آتا کہ خدا کو رب العٰلمین کہنا اور اس سے روزی مانگنا دونوں میں کیا فرق ہو سکتا ہے اگر لوگوں نے توراۃ و انجیل میں تحریف کی اور ہم کہتے ہیں کہ کی تو پیشین گوئیوں میں کی ہوگی احکام میں کی ہوگی دعاؤں میں تحریف کرنیکی انکو کیا ضرورت پڑی تھی؟ اسی خیال سے میں نے تم کو مناظرہ اور مباحثے کی سخت ممانعت کی کہ اب مباحثے اور مناظرہ کا یہ رنگ رہ گیا ہے اور یہ تو بڑا ہلکا رنگ ہے لیکن کیا اسی طرز سے تم عیسائیوں کو مسلمان کرنا چاہتے ہو؟ یوں کہو کہ اس طرز کو دیکھکر مسلمان بھی مسلمان رہتے ہیں یا نہیں "

صادق ۔" اب اس ذکر کو جانے دیجیے سنکر طبیعت کو بڑا رنج ہوتا ہے وہی نیچریوں کے خیالات بیان کیجئے کہ شیطان کے بارے میں ان لوگوں کی کیا رائے ہے ؟ "

بزرگ ۔" فرشتوں کے ذکر میں سن نہیں چکے ؟ اب اسکے دہرانے کی کیا ضرورت ہے ؟

صادق ۔" ایک اعتراض تو نیچریوں کی طرف سے مجھے بھی کر لینے دیجیے "

بزرگ ۔ بسم اللہ "

صادق ۔" بھلا یہ تو بتائیے کہ شیطان کو ہمارے پیچھے لگا دینا کہ ہر وقت ہماری ابدی ہلاکت کے درپے رہے اور ہم اسکو دیکھ بھی نہ سکیں آپ کو بھی خدا کی شان اور اسکے انصاف سے بعید معلوم ہوتا ہی یا نہیں اس سے تو وہ بدی کا میلان ہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے "

بزرگ اب تم لگے اسرار مصالح خالق عالم میں دخل دینے اور یوں تو سرے سے انسان کا پیدا کرنا اور مارنا ہی خدا کی شان اور اسکے انصاف سے بعید معلوم ہوتا ہی مگر یہ تو بتاؤ کہ شیطان پیدا کرنا انصاف سے بعید ہی تو انسان میں بدی کا میلان پیدا کرنا کیوں انصاف سے بعید نہیں ۔ دونوں کا نتیجہ ایک ہے مگر ایک نکتہ بتاتا ہوں ، کیا یاد کروگے ۔ بدی کو شیطان کی طرف منسوب کرنے میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ گو آدم نے خدا کے حکم کی سرتابی کی اور جس درخت کی ممانعت تھی کھالیا اسپر بھی خدا نے اپنی مہربانی اسپر سے کم نہیں کی ۔ کھایا آدم نے اور بھوپا گیا شیطان کے سر۔ مجرم کو روبرو کہنا کہ تیرا قصور ہے اور ایک آڑ رکھکر الزام دینا ، دونوں میں بڑا فرق ہے ۔ شیطان کا پیدا کرنا جسکو ہم دیکھ

بھی نہیں سکتے ظلم ہوتا اگر ہم کو آگاہ نہ کر دیا ہوتا اور یوں دنیا میں بہت سے انسان کی جان کے دشمن موجود ہیں۔ وہ پانی میں ڈوب جاتا، آگ اسکو جلاتی، بجلی گرتی، سانپ کاٹتا، زہر سے مرتا اور پھر اتنے دشمنوں میں زندہ رہتا، اب کہیں سوالات کا سلسلہ ختم بھی کر دیگے جی تو بیشک اکتا گیا۔

صادق "بس اب ختم ہی سمجھئے۔ دو چار باتیں اور رہ گئی ہیں آپکا جی تو بیشک اکتا گیا مگر میرے دل سے تو پوچھیے کہ میرے حق میں آپکا ایک ایک لفظ آبحیات کا کام دے رہا ہے، اب جنت اور دوزخ کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟"

بزرگ "میں کیا فرماؤں گا۔ نہ اسکو دیکھا نہ اسکو۔ ہاں اس سے جو پیغمبر صاحب سے سنا دوزخ کا تو دیکھنا تک بھی گوارا نہیں جنت کی تمنا ہے سو وہاں جانیکی جو شرائط ہیں وہ ادا نہیں ہوتیں غرض ذاتی معلومات تو جنت اور دوزخ کی نہ ہے اور نہ اس زندگی میں ہو سکتی ہے مرے پیچھے جو بات سو بات ہمارے یہاں ایک مسلمان کا لڑکا خدمتگار رہتا، کچھ احمق اور مسخرہ سا، تو نیچے اسکو چھیڑتے اور پوچھتے کہ کیوں بے فلانے تو بہشت میں جانا چاہتا ہے یا دوزخ میں؟ وہ کہتا میاں وہاں چلکر دیکھونگا ادھر یا ادھر ہو رہونگا میرے کان میں اسکی بات پڑتی تو کہتا ایسی بیخبری ہے تو یہ اب بھی بہشت ہی میں ہے۔ نیچری بیچارے تو جب مجبور ہوتے ہیں اور جواب بن نہیں آتا تو ناچار تاویل پر اتر پڑتے ہیں اصل میں اعتراض عیسائیوں کا ہے کہ مسلمانوں نے دنیا کے مزوں کو جمع کر کے ایک خیالی بہشت بنا رکھی ہے جو خدا کے تقدس کے بالکل خلاف ہے۔ میں کہتا ہوں دنیا میں جو خدا نے یہ مزے پیدا کئے ہیں خدا کے تقدس میں بھی کونسا فرق آگیا کہ بہشت میں ان کے ہونے سے آجائیگا۔ عیسائیوں کی تو بات بات میں رہبانیت ہے اور وہ نہ چلی ہے نہ چل سکتی ہے اگر انسان کی ایک خواہش کا پورا ہونا گناہ نہیں ہے تو دوسری خواہش کا پورا ہونا کیوں گناہ ہے۔ خواہش ہونے میں سب خواہشیں برابر ہیں۔ ہاں کیفیتیں مختلف ہوں اگر وہ کھانا کھا سکتا ہے تو پانی کیوں نہ پیئے اگر کھانا کھا سکتا ہے اور پانی پی سکتا ہے تو سونے کو اس نے کس نے منع کیا من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق[1] دنیا کے کسی مزے میں

---

[1] (اے پیغمبر لوگوں سے پوچھو کہ اللہ نے جو زینت کے سامان اور کھانے پینے کی ستھری چیزیں اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں (ان کو کس نے) حرام کیا ہے۔

گناہ نہیں۔ گناہ ہے تو ان سے ناجائز طور پر فائدہ اٹھانے میں ہے۔ ان مزوں میں پڑکر خدا سے غافل ہو جانے میں ہے اور خدا کی ناشکری میں ہے۔"

صادق ۔" اچھا پھر نیچری کیا کہتے ہیں؟"

بزرگ ۔" نیچری کہتے ہیں لوگوں کے سمجھانے کو تمثیل کے طور پر جنت کے مزے اور دوزخ کی تکلیفیں بیان کر دی ہیں۔ رنج و راحت آخرت میں بھی ہے مگر ہم اس کی کیفیت کے سمجھنے کے لائق نہیں۔ ناک اسی جگہ ہے سامنے سے بتاؤ تو اور گدی کے پیچھے ہاتھ لیجا کر بتاؤ تو۔ ہم تو چھوٹتے ہی یہی جواب دینگے کہ دوزخ ہو یا جنت یہ وہ چیزیں ہیں جن سے مرے پیچھے واسطہ پڑیگا۔ وحی کے سوائے ہم کو کوئی ذریعہ انکی حقیقت دریافت کرنیکا نہیں ہے۔ اور جو کچھ وحی میں ہے ہم اس سے ایک حرف نہ کم کہہ سکتے ہیں اور نہ ایک حرف زیادہ اور نہ تاویل کرتے ہیں بلکہ سکوت اور زیادہ تفتیش کرنیکو اپنے حق میں بالکل غیر ضروری سمجھتے ہیں"

صادق ۔" اب تو صرف ایک آسمان رہ گیا ہے اور بس۔"

بزرگ ۔" اچھا تم نے میرے لفظوں کو یاد رکھا ابھی انپر کیا موقوف ہے ایسی بیسیوں باتیں ہیں وہ جو کچھ تمہارا دہ ہے میں نے تم کو سمجھا ہی دیا۔ آسمان کا بھی قرآن میں بہت ہی جگہ مذکور ہے اول تو زمین پر اسکے تصرفات بکثرت ہیں۔ آسمان سے پانی برستا۔ آسمان سے روشنی آتی۔ آسمان سے سینک پہنچتی آسمان سے تعلق سے ہمارے موسم بدلتے۔ آسمان کے تعلق سے ہماری روزی پیدا ہوتی۔ پھر آسمان میں اجرام فلکی ہیں اور انکی حالتوں میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ان سے بھی ہمارے کام نکلتے ہیں۔ ان کے علاوہ آسمان کی قدرت کا بڑا عظیم الشان نمونہ ہے لوں دیکھو تو ایک نیلا سا سرپوش زمین پر ڈھکا ہوا معلوم ہوتا ہے ایسا کہ دور تک کنکوا اڑھائیں تو شاید آسمان کو جا لگے مگر جتنی دور آنکھ سے دکھائی دیتا ہے اتنی ہی دور بڑے سے بڑے پتلے کی دوربین سے۔ غرض یوں دکھائی دیتا ہے اسکو بھی ایک اعتبار سے ان ہی چیزوں میں سمجھو جو نظر نہیں آتیں جیسے فرشتے۔ جنات۔ بہشت۔ دوزخ وغیرہ آدمیوں کو اختلاف کرنے کیلئے اتنا بس کرتا ہے۔ یہ حضرت عقل دوڑائے بدون رہنے کو نہیں جو جس کی سمجھ میں آتا ہے کہتا ہے اصل حقیقت خدا کو معلوم ہے اپنی نارسائی کا تو حال یہ ہے کہ اپنے ہی تئیں جاننا

کہ کیا ہیں آسمان کے پیچھے کیا سر کھپاتے ہیں۔ مذہب کی رُو سے جو تعلق ہم کو آسمان سے ہے وہ یہی ہے کہ ہم اسکو دیکھیں اور اپنی بے حقیقتی اور خدا کی عظمت کے خیال کو دل میں جمائیں اور جو ان فکروں میں پڑے ہیں کہ وہ ہے بھی یا نہیں اور ہے کتنی دور ہے۔ اور کاہے کا بنا ہے۔ دنیا ان کی لیاقت اور ذہانت کی مدح کرے اور اپنے جی میں خوش ہوں مگر مذہب کو علاقہ نمبر (۲) کی باتوں سے کچھ سروکار نہیں۔ خدا قرآن میں فرماتا ہے۔ وجعلنا السماء سقفا محفوظا وھم عن ایاتھا معرضون جس نظر سے علم ہیئت والے اجرام فلکی کے حالات کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں ہم تو انکو اس آیت کے الزام سے بری سمجھتے ہیں۔ آسمان کے متعلق ان دنوں ایک نئی بحث چلی ہے کہ قرآن میں کئی جگہ اسکا مذکور ہے کہ خدا نے زمین و آسمان کو یعنی سارے جہان کو چھ دن میں بنایا چھ دن۔ اس سے لگے کہ خدا اس سے کم میں بنا نہیں سکتا تھا مگر اس نے کسی مصلحت سے جو ہم پر منکشف نہیں چھ دن لگائے۔ کہتے ہیں کہ اس دیر کے لگانے سے ہم لوگوں کو دکھانا سکھانا منظور نہ تھا کہ کوئی کام ہو آہستگی کیساتھ کرنا چاہیئے خیر تو یہ واقعہ ان وقتوں کا ہے کہ آدم خاکی کا وجود بھی نہ تھا اور آدم کی نسل میں بھی پیدا ہوتے ہی ساتھ ہی سب کمالات حاصل نہیں کرلئے تھے۔ ہزاروں برس کے تجربہ کے بعد تو ہم اس درجہ کو پہنچے ہیں سو جاننے والے اسکو بھی ترقی کی ابجد ہی بتاتے ہیں اور ہے بھی یوں ہی۔ آدمی نہ صرف آنے والے واقعات کے جاننے سے عاجز ہے بلکہ ایک مدت کے بعد اسکو گذشتہ واقعات کا پتہ ملنا بھی مشکل ہو جاتا ہے مصر میں ہزارہا برس پہلے کے عجیب مینار موجود ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ آدمی کے بنائے ہوئے ہیں ان میں کتبے لگے ہیں مگر پتہ نہیں چلتا کس نے بنائے، کب بنائے کس غرض سے بنائے۔ کتبے پڑھے نہیں جاتے وہ خط معدوم ہو گئے۔ انکے لکھنے والے معدوم ہو گئے۔ پڑھنے سمجھنے والے معدوم ہو گئے اور ایسی کتنی چیزیں دنیا میں ہیں۔ جب ایسی ایسی مستحکم یادگاروں کا یہ حال ہے تو آدمی کیا جان سکتا ہے اور کیونکر جان سکتا ہے ان وقتوں کی باتیں جو اسکی ہستی سے پہلے کی ہیں؟ کیفیت تو یہ ہے اور رائے زنی کیجاتی ہے اسمیں کہ آسمان و زمین کیسے بنے اور کیونکر بنے اسکو جنون نہ کہیں تو کیا کہیں؟ افراط عقل بھی کیا بری چیز ہے انسان کو کیسے کیسے کنوئے جھکاتی ہے! زمین آسمان کے پیدا ہونے کی سب سے پہلی تحریری یادداشت

دنیا میں توراۃ ہی کہ اس سے پہلے باب میں اسی قسم کا بیان ہی یا اب لوگوں نے عقلی تکّے چلانے شروع کئے ہیں انھم کا بجز مضمون انہوں نے دیکھے دنیا میں اس طرح کے تغیرات کہ جہاں پہاڑ ہیں وہاں کسی زمانہ میں دریا بہتا ہوگا۔ کیونکہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر مچھلیوں کی ہڈیاں پائی گئیں اور معلوم ہی کہ مارے سردی کے کوئی جاندار وہاں نہیں جاسکتا۔ علاوہ بریں ہڈیاں نکلیں پتھروں کی تہوں میں دبی ہوئی۔ پھر دیکھا کہ صحرائے افریقہ کے ریگستانوں کو کھودا جاتا ہی تو بہت نیچے جاکر ایسے درخت دبے ہوئے نکلے۔ سوائے سمندر کے دوسری جگہ پیدا نہیں ہوسکتے۔ انکو چاہیئے شور پانی۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہاں پہلے سمندر رہو گا۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ہوا کے جھکولوں سی سمندر میں جھاگ اٹھتے ہیں اور جھاگ سورج کی گرمی پاکر کائی بجلاتے ہیں' کائی کی مٹی ہٹی کے کنکر کنکر کے پتھر مگر یہ تغیرات کتنے ہزاروں برس میں جاکر واقع ہوتے ہیں تو انہوں نے قیاس دوڑایا کہ ہونہ ہو دنیا اسی قاعدے سے بنی ہوگی ذرا "ہوگی" کو دھیان میں رکھنا۔ اب انھوں نے فرض کرلیا کہ زمین آسمان میں پہلے خلا تھی اور خلا میں ایک قسم کے نہایت چھوٹے چھوٹے ذرے تھے جیسے کواڑوں کی دراز میں آفتاب کی شعاع سے نظر آیا کرتے ہیں، ان ہی ذروں میں تغیر و انقلاب ہوہوکر دنیا بنگئی بس اب کیا تھا ابتدائے آفرینش کا ایسا عمدہ طور پر حل ہوگیا کہ گویا آسمان اور زمین ان کے سامنے کے گودھلائے بیٹھے ہیں اب اس خیال کا مقابلہ ہی۔ توراۃ کی کتاب آفرینش سے یہ لوگ کہتے ہیں کہ دنیا کے بننے میں کچھ نہ لگے ہونگے تو لاکھوں کروڑوں برس۔ اور توراۃ بتاتی ہی چھ دن صرف چھ دن۔ اگر کوئی شخص دہریہ ہو اور خدا کو نہ مانتا ہو اور وہ ایسا خیال کرے تو عجب نہیں کہ دنیا اسی طرح قدیم سے چلی آئی ہی اور آپ سے آپ بنگئی ہی لیکن بیچارے نیچریوں کی مشکل ہی کہ ایکطرف تو قرآن ہی توراۃ کا ہمزبان اسکا مصدق اور دوسری طرف زمانہ حال کے محقق فلاسفر کی رائے۔ نہ قرآن ہی کو غلط کہتے بن پڑتی ہی اور نہ فلسفیوں کو ہی جھٹلایا جاسکتا ہی۔ اور یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ دنیا کا اتنا بڑا کارخانہ موجود ہو جائے! اور خدا الگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تماشا دیکھے۔ آخر انہوں نے آب و آتش کے یکجا کرنیکی یہ تدبیر نکالی۔ اور اسکے سوائے نکالتے بھی کیا۔ کہ وہ چھوٹے چھوٹے ذرّے خدا نے پیدا کئے۔

اور ان ذرّوں کا اجتماع اس طرح پر کہ ایک اجتماع سے مچھر بنا اور دوسرے سے ہاتھی۔ ایک سے آفتاب دوسرے سے ہوا۔ ایک سے زمین دوسرے سے پانی۔ یہ سب خدا کے حکم سے ہوا۔ مگر ہوا وہی لاکھوں کروڑوں برس میں جیسا کہ فلاسفہ نے سمجھا۔ رہا قرآن، وہ تو کچھ بات نہیں۔ زمین و آسمان کی پیدایش کے بارے میں یہودیوں کا ایسا ہی خیال تھا کہ خدا نے ان کو چھ دن میں بنایا ہی۔ سو قرآن میں خدا کا یہ مقصود نہیں کہ ہم نے زمین و آسمان کو چھ دن میں بنایا ہی بلکہ مطلب یہ ہی کہ زمین و آسمان جس کا چھ دن میں بنجانا تم کہتے ہو اسکے بنانے والے ہم (خدا) ہیں۔ توریت جس میں پیدالیش کا خاص پہلا باب[1] ہے مسلمان اسکے ذمہ دار نہیں کہ جو کچھ اس میں لکھا ہی وہ وحی آسمانی ہی۔ یا یہودیوں کے ڈھکوسلے ہیں: تاویل کی تو سہی مگر جس کی نظر قرآن پر ہے وہ کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ قرآن میں چھ دن کی تعین پر زور نہیں دیا گیا ہی بیشک کچھ آیتیں ایسی ہیں جن کا مخاطب بہ تکلف یہود کو بنایا جا سکتا ہی مگر ایسی بھی آئتیں ہیں جنکا سیاق و سباق پڑا پکار رہا ہی کہ چھ دن پر زور ہی اور مخاطب بلا تخصیص یہود کل افراد بشر ہیں جیسے سورۂ ق میں ولقد خلقنا السمٰوات والارض وما بینہما فی ستۃ ایام و ما مسنا من لغوب[2] دما مسنا۔ کا اسکے سوائے اور کیا محل ہو سکتا ہی کہ قائل کا مطلب چھ دن پر زور دینا ہی غرض اپنی اپنی سمجھ ہی تو ہی ہمکو تو اس تاویل کے تسلیم کرنیسے دنیا کا چھ دن میں پیدا ہو مان لینا زیادہ آسان معلوم ہوتا ہی اور پھر جب خدا نے چھوٹے چھوٹے ذرّوں کو بنایا اسکے حکم سے ان کے اجتماعات ہوئے اتنا مان لینے سے کیا قباحت لازم آجائیگی کہ موجودہ اجتماعات چھ ہی دن میں ہوئے اور آگے کو یہ قاعدہ ٹھیرا کہ ہوں تو ہزاروں لاکھوں برس میں ہوں؟ اس سے خدا کی بڑی عظمت اور اسکی بے انتہا قدرت ظاہر ہوتی ہی کہ جو کام ہزاروں لاکھوں برس میں ہونیکے تھے اسنے بے تکان چھ دن کے تھوڑے عرصہ میں کر دکھائے آدمی جواب ایک طور پر پیدا ہوتا ہی ضرور ہی کہ سب سے پہلا آدمی اور طور سے بنا ہو تو اب ایک طور پر دنیا کا چلنا اسکی دلیل نہیں ہو سکتا کہ یہی الموارسد سے چلا آیا ہے

---

[2] اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو چیزیں آسمان و زمین میں ہیں (انکو سبکو) چھ دن میں بنا کر کھڑا کیا اور تکان نے تو ہم کو چھوا تک نہیں۔

اب تم نے نیچریوں کے اصول کو سمجھ لیا ہوگا۔ ان کا اصل مقصد ہی قرآن اور زمانہ حال کے فلسفہ کو ایک ذات کر دینا۔ کہ دونوں میں کسی طرح کا تناقض اور اختلاف باقی نہ رہے۔ نیت اچھی ہی اور بہت اچھی ہی۔ ارادہ نیک ہے اور بہت نیک ہے۔ مگر دلیا ہی کام بھی مشکل ہی اور کوئی آسان سمجھتا ہو تو کرکے دکھائے۔ بیشک نیچریوں سے غلطیاں ہوتی ہیں اور مسلمانوں کا کون سا فرقہ ہے جو ان سے بدتر غلطیاں نہیں کرتا؟ مگر سچ پوچھو تو نیچریوں کی غلطی سے مسلمانوں کو عاجلاً نقصان نہیں پہنچا جبکہ دوسرے فرقوں کی غلطی سے مسلمانوں کی دنیا تباہ ہو رہی ہے اور دنیا کے ساتھ دین بھی ؛؛

صادق" میں نے آپکے عقاید کو خوب سمجھا اور اب میرے دل میں کسی طرح کا خدشہ باقی نہیں اور مجھکو ایسی خوشی اور تسلی ہی جو ساری عمر کبھی نصیب نہ ہوئی۔ اور مجھکو امید ہے کہ اگر مرتے وقت بھی میرے ایسے ہی خیالات رہے تو میں بڑے اطمینان سے مروں گا، انشاء اللہ میرا خاتمہ بخیر ہوگا اور آخر کار نجات ؛؛

یوں صادقہ چاہتی تو وہ لکھنے میں بہت تیز دست تھی کہ اپنے اس خواب کو بہت سے بہت ایک ہفتہ میں لکھکر صادق کے حوالے کر دیتی۔ مگر اس طرح کے لمبے لمبے خواب جن میں نقطوں اور عبارتوں کو دہرانا پڑتا تھا ان کے بیان کرنے میں اسکے دماغ کو ایسا سخت فشار ہوتا تھا کہ وہ گھنٹے سوا گھنٹے سے زیادہ اس تکلیف کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی ؛

اسکو یا تو ایکبار اپنے ماموں کے امتحانات کے سوالات بتلانے میں ایسی زحمت پیش آئی تھی مگر وہ بھی تھوڑی دیر کا کام تھا، یا اب یہ ایک رسالہ کا رسالہ اسکو لکھنا پڑا اور وہ تو صادق ہی سے تھا جسکی خاطر اس نے یہ محنت گوارا کی۔ ادہر اسکو تاد لی، ادہر اسکو جلدی۔ اسپر بھی صادقہ کا ایک چلّہ خرچ ہوا، تب کہیں جاکر پورا خواب قلمبند ہوا، اکثر تو ایسا ہی ہوتا تھا کہ صادقہ کہتی جاتی اور صادق جھکا ہوا دیکھ رہا ہی اور کبھی کبھی صادقہ کہہ بھی بیٹھتی تھی کہ تمہارے جھکنے سے مجھ پر بڑا بوجھ

پڑتا ہی تو صادق ذرا کی ذرا پرے ہٹ جاتا۔ پھر سرکتے سرکتے پاس آ کر دیکھنے لگتا۔ غرض ادہر صادقہ کے قلم سے نکلا اور ادہر صادق نے پڑھا۔ پھر ایکدفعہ کے پڑھنے سے اسکو کیا سیری ہوتی۔ وہ بار بار پڑہتا اور سوچتا رہتا۔ خواب ختم ہونے کو آیا تو صادقہ کو اپنے خاص طرح کے حافظہ کی وجہ سے یاد تھا، اور صادق کو بار بار پڑہنے سے۔

صادق کا دیوانخانہ تو ایک مدت سے مذہبی اکھاڑا ہو رہا تھا اور ایسا کون سا دن تھا کہ دو ایک سے اسکی جھڑپ نہ ہوتی ہو بشروع شروع میں تو ہوتا تھا مناظرہ اور آخر میں ہو جاتی تھی عداوت کتنے آئے اور روٹھ روٹھ کر گھر بیٹھ رہے۔ اور پھر کہیں رستے میں ٹدبھیڑ ہو گئی تو ایک نے ادہر کو منھ پھیر لیا اور دوسرا اکتر اکر نکل گیا۔ خواب کا مناظرہ بالکل اور ہی ڈھب کا تھا۔ اس میں لفظوں پر بحث تھی، نہ دوسرے کو چھیڑنے اور چڑانے سے مطلب۔ نہ خواہ مخواہ کی ضد۔ نہ سخن پروری بلکہ جس طرح بیمار طبیب سے اپنا حال بیان کرتا یا دوست دوست کو صلاح بتاتا اسی طرح نرمی سے آہستگی سے بات چیت ہو رہی تھی۔ جیسے بھلے آدمی آپس میں ہنسا بولا کرتے ہیں۔ ابتدا ہی سے صادق کی طبیعت گداز ہونے لگی۔ یہ کسی وقت بونگی بے تکی بھی کہہ بیٹھتا، مگر ادہر سے جب جواب ملا ایسا معقول کہ اسکو الٹ کر کچھہ کہنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا پس حقیقت میں اسکو مناظرہ کہنا ہی ٹھیک نہیں وہ خاصا سبق تھا جو صادق پڑہتا تھا۔ اور وہ مرد بزرگ پڑھاتے جاتے تھے صادق ان سے کیا جھگڑ سکتا تھا، انہوں نے جھگڑے کا ڈربا ہی پھونکدیا، صادقہ نے جتنا خواب پہلے دن لکھکر دیا صادق کی آنکھیں تو اسی سے کھل گئیں کہ ہاں مذہب کی تحقیقات اور اس سے اطمینان حاصل کرنیکا یہ رستہ ہے۔ اس نے وہ لغو اور بیہودہ لاحاصل مباحثے جو آئے دن اسکے یہاں رہتے تھے یک قلم موقوف کر دیئے۔ بلکہ لوگوں کو تعجب بھی ہوا۔ کوئی کہتا کہ جواب سے عاجز آ گئے۔ کوئی سمجھتا تھا ان مدرسہ والوں کی جمع پونجی ہی کیا۔ خاصکر علیگڈہ کالج کے لڑکونکی اور وہ بھی دینیات میں۔ بیچارے گنتی اور پہاڑوں کے سوائے کیا جانیں۔ سنی سنائی چند باتیں معلوم تھیں ہو چکیں، اب کہیں تو کیا کہیں؟ ایک شخص جو صادق کے خانگی حالات سے بھی

کسی قدر واقف تھا خدا جانے اس کو کیونکر معلوم ہو گیا کہ میاں بی بی دونوں کوئی مذہبی کتاب لکھ رہے ہیں۔ اس کے ذریعے سے سارے جلسے میں اس بات کا چرچا سا ہو گیا تو لوگوں نے تقاضا شروع کیا کہ صاحب کچھ لکھ رہے ہو تو میدان میں لاؤ یہ کہا کہ بی بی نے لکھا میاں نے داد دی میاں نے کہا بی بی نے تسلیم کر لیا۔ ان لوگوں میں ایک صاحب تو وہ تھے جنہوں نے مقلدوں غیر مقلدوں کی لڑائی میں یہ تجویز نکالی تھی کہ مسجدیں تقسیم ہو جائیں مقلدوں کی الگ غیر مقلدوں کی الگ، ہر مسجد کے دروازے پر ٹکٹ لگا دیا جائے تاکہ کوئی انجان دوسرے فریق کی مسجد میں نہ گھس جائے، ایک حضرت وہ تھے جنہوں نے وہ فتویٰ دیا تھا کہ غیر مقلد امام کے پیچھے متعدد مقتدیوں کی نماز نہیں ہوتی کیونکہ امام کی اطاعت مقتدیوں پر لازم ہے مقتدی تو سجدے سے اٹھ سیدھے کھڑے ہو گئے اور امام جلسۂ استراحت میں ہے تو اطاعت کہاں رہی۔ ایک اس درجے کے محتاط تھے جنہوں نے برسوں سے بی بی کو اس قصور پر اس کے میکے میں بٹھا رکھا تھا کہ وہ لوگ پھول والوں کی سیر میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک تھے جو فتحپوری کے عین دروازے کے سامنے پادریوں کے مقابلے میں لب سڑک وعظ فرماتے مسجد میں نماز مغرب ہو رہی تھی اور ان کا وعظ جاری ہے۔ کوئی جانا چاہتا تو اس کو روکتے کہ جماعت پر وعظ کو فضیلت ہے۔ ایک رہتے تو تھے شہر کے باہر پہاڑ گنج اور بالالتزام مغرب اور فجر کی نماز کھجور والی مسجد میں پڑھتے کہ ہندوؤں کا محلہ ہے نماز میں کسی کے بولنے کی آواز بھی کان میں پڑ جائے تو ثواب جہاد ہاتھ سے نہ جانے دیں ایک نے اپنی زندگی اسی میں وقف کر رکھی تھی کہ کچھ دلی پر موقوف نہیں کہیں بھی مذہبی تکرار سن پائیں عدالت میں پیروی کرنے کو جا موجود ہوں ایک اس تدبیر میں لگے رہتے تھے کہ مندر نہ بچنے پائے جس کی بغل میں مسجد نہ ہو۔ ایک لنگوٹ باندھ کر نیچریوں کے پیچھے پڑے تھے آپ تو کچھ لیاقت رکھتے نہ تھے مگر جو کچھ نیچریوں کی شان میں نثر یا نظم کسی اخبار یا رسالے میں دیکھ پاتے سن پاتے اس کو چھوڑا نہیں چنانچہ ان کے پاس رد نیچری کا خاصہ ایک کتاب خانہ جمع ہو گیا تھا اور اس پر ان کو بڑا فخر تھا اور فخر کی بات ہی ہے غرض سب کی غرض مشترک یہ تھی کہ نہ آپ چین سے رہیے اور نہ دوسروں کو چین سے رہنے دیجئے یہ لوگ تقاضا نہ بھی کرتے تاہم صادق سے خواب کا ضبط ہونا مشکل تھا۔ لوگوں کے تقاضے نے تو خواب کا پورا لکھا جانا بھی دشوار

کردیا تھا یا ابھی آدھا بھی نہ لکھا جا چکا ہوگا کہ صادق نے جلسہ میں سنانا شروع کردیا۔ اگرچہ ایک ایک ایسے جھگڑالو تھے کہ کسی طرح ماننے ہی نہ تھے مگر ہم کو تو صداقت اور خلوص کی تاثیر کا اُسی دن سے یقین آیا کہ صادق پڑھتا جاتا تھا اور یہ سب کے سب دم بخود بیٹھے سنتے تھے کسی نے کان تک بھی تو نہیں ہلایا۔ ان کی عمروں میں یہ پہلی ہی دفعہ تھی کہ ان کو اس طرح کی دینداری اور نصیحت کی باتوں کے سننے کا اتفاق ہوا۔ اب لوگوں کو خیال آیا کہ اصل میں دینداری ہے کیا چیز، ہم کو کرنا چاہیے کیا اور ہم کر رہے ہیں کیا اس سے پہلے یہ لوگ مسلمان تھے اس لئے کہ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئے تھے مسلمان کہلاتے تھے، اب نئے سرے سے مسلمان ہوئے، اس لئے کہ اسلام کی حقیقت کو سمجھا اُس کی غرض و غایت کو سمجھا، اُس کی صداقت کو سمجھا۔ کوئی ایسا ہی سنگدل ہوگا جو خواب کو سن کر رو نہ دیا ہو۔ ایک دفعہ تو سب کے دل پسیج گئے پھر جو ایمان سے تسلی ہوئی تو سب نے اپنی اپنی اصلاح پر کمر ہمت چست کرلی یا تو جس وقت مباحثہ ہوتا تھا سارے محلے کو سر پر اٹھا لیتے تھے یا اب غل غپاڑے کی جگہ ہو اسکون اور سکوت تو اہل محلہ کو امن ملا اور خواب کی برکتوں کی بسم اللہ ہوئی، وہ صاحب جنہوں نے مسجدوں کی تقسیم تجویز کی تھی اور اپنے محلے کی مسجد پر لکھوا بھی دیا تھا کہ غیر مقلد نہ آنے پائے سب سے پہلے تو انہوں نے ہی اس تحریر کو چھیلا اور کھرچا اور جن کو غیر مقلد امام کے اقتدا سے انکار تھا وہ شیخ المحدثین کی مسجد میں جا کر پانچوں وقت جماعت سے نماز پڑھنے لگے اور جنہوں نے بی بی کو بٹھا رکھا تھا ڈولی لے جا کر گھر والی کو سوار کرا لائے۔ واعظ صاحب نے وعظ تو بند نہیں کیا مگر کوئی نماز کے لئے جانا چاہے تو اُس کو روکتے ٹوکتے بھی نہیں بہار گنجی پہلوان مدتوں سے دکھائی نہیں دیئے نماز تو کیا چھوڑی ہوگی ہو نہ ہو اپنے محلہ کی مسجد کا حق سمجھنے لگے۔ مقدمے باز صاحب عہد کرتے ہیں کہ جو مقدمات دائر ہیں اُن سے دست بردار ہونا تو بڑی مشکل کی بات ہے مگر آئندہ کوئی نیا مقدمہ نہیں ہونے لگا۔ جو اس کے درپے تھے کہ ہر مندر کے پہلو میں مسجد ہو اب کہنے لگے ہیں کہ مندر والوں کو [illegible] پوجا کو ہم روک نہیں سکتے خواہ مخواہ اُن کی بغل میں گھس کر اپنی عبادت میں کیوں خلل ڈالا اور دیر کی کیا ضرورت ہے۔ بدستور گزشتہ اخبار اور رسالوں کا آنا بند اور نہ لوگوں کا اگلا سا جمگھٹا اور جب لوگ آتے تھے ... تو اُن کو اپنے شہر ہی کی پڑی تھی کہ دوسروں کے حالات سے تعرض کرتے پھرتے ہیں

یوں امن اور صلح کاری نے رفتہ رفتہ ایک سے دوسرے میں اور دوسرے سے تیسرے میں اپنی تاثیر نیک کرنی شروع کردی لیکن ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں تاہم جن تیوہاروں کی تقریبوں میں ادبدا کر فساد ہوتے تھے ایسے چپ چپاتے گزر جاتے ہیں کہ کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ اور خدا کو منظور ہے تو وہ دن بھی آیا سمجھو کہ ان تمام مذہبی مخالفتوں کا ایک افسانہ رہ جائے گا اور آنے والی نسلیں ان باتوں کو سن سن کر ہنسا کریں گی کہ ہمارے بزرگ بھی کس قماش کے لوگ تھے جو اختلاف رائے پر لڑتے تھے، مذہب سدا سے ہے اور سدا کو رہے گا اور اختلاف بھی سدا سے ہے اور سدا کو رہے گا مگر مذہب میں جو ایک طرح کی کڑواہٹ ہے، دیر سویر تو ہو یہی تعلیم اور آزادی آخرکار اس کو کھو کر رہے گی، لوگوں کے عقیدے جدا جدا ہونگے مگر ایک جگہ کھائیں گے ایک جگہ پئیں گے، ایک جگہ اٹھیں بیٹھیں گے، ایک جگہ رہیں سہیں گے، ایک طرح کا لباس ہوگا، ایک طرح کا مذاق، آپس میں دوستی اور اتحاد رکھیں گے، اس وقت جاننا کہ آفتاب اسلام طلوع کرنے کو ہے: اور ابھی تو آدھی رات ہے یا شاید کچھ ڈھلی ہو تو ڈھلی ہو، وہ جو کہتے ہیں اوچھے نے کٹورا پایا پانی پی پی پیٹ پھلایا صادق کا تو کچھ اس طرح کا سا حال ہوگیا تھا، وہ اس کو خواب تھوڑا ہی سمجھتا تھا، بلکہ وحی یا الہام، وہ سارے سارے دن خواب پڑھ پڑھ کر لوگوں کو سناتا اور ڈرایا کرتا تھا، جو شخص غیروں کے سر ہو ہو کر سنائے وہ اپنے کالج کے دوستوں کو کیوں چھوڑنے لگا تھا، اس نے خواب کی ایک بڑی عمدہ خوشخط نقل تیار کی اور اسی خاص کمیٹی میں جس کا سکریٹری تھا اور جس کا مذکور شروع کتاب میں آچکا ہے اس کو اس تمہید سے پیش کیا۔

دوستو عزیزو! ارشدکم اللہ تعالیٰ، آپ صاحبوں نے شروع سے اس کمیٹی، اس معزز کمیٹی کے سکریٹری ہونے کی عزت مجھ کو دے رکھی ہے جس کی میں بے انتہا قدر کرتا ہوں، اور میں نے اگر سکریٹری ہونے کے فرض کو جیسا چاہیئے تھا ادا نہ کیا (سب طرف سے آواز آئی نہیں ایسا نہیں) تو اس کی اور جو کچھ وجہ ہو مگر میں آپ سب صاحبوں کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ مجھ کو اس کمیٹی کے اغراض سے پوری پوری دلچسپی نہیں یا میری توجہ اس کمیٹی کی طرف سے کچھ کم ہو گئی ہے آپ اس بات کو یاد رکھیئے گا کہ جس شوق سے میں نے اس کمیٹی کے منعقد ہونے کی تحریک کی تھی وہ شوق اگر زیادہ نہیں ہوا تو گھٹا بھی نہیں (بیشک یا بے شک) میں نے شروع شروع میں نکاح کے خلاف اپنی رائے کے ظاہر کرنے کی جرأت کی تھی لیکن میں

کھلے سے اقرار کرتا ہوں کہ جن صاحبوں نے میری اس رائے سے مخالفت کی اُن کی دلائل نہایت قوی تھیں اور میں نے اُن دلائل کے سننے کے بعد ایک منٹ کے لئے بھی اس رائے کو اپنے سر میں نہیں رہنے دیا میری نظر میں رائے کی کچھ بھی وقعت نہیں جب تک کہ صاحب رائے خود اُس پر عمل نہ کر کے دوسروں کے لئے نظیر نہ بنے کیا آپ نے وہ اعتراضات نہیں سنے ہونگے؟ ضرور سنے ہوں گے جو ایک بڑے ہندو ریفارمر پر چاروں طرف سے کئے جا رہے تھے کہ وہ چھوٹی عمر کی شادی کے سخت مخالف تھے اور اب بھی مخالف تھے مگر انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کو جس کو بڑی محنت اور احتیاط کے ساتھ تعلیم دی جا رہی تھی بالکل چھوٹی سی عمر میں بیاہ دیا اور وہ بیاہ اس کی تعلیم کی گاڑی میں ایک روڑا تھا جس کو ہٹا نہ سکے مجھ کو اس کا تو خیال کبھی نہیں آیا کہ اگر شادی نہ کروں گا تو لوگ مجھ پر معترض ہوں گے کیونکہ میری معرفت کا دائرہ بہت ہی محدود ہے نہ تو مجھ میں ریفارمر بننے کی صلاحیت ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اُس نے مجھ کو شہرت کی آفتوں سے بھی بچایا ہے تو اگر مجھ پر اعتراض کرتے بھی تو شاید اتنے کہ ان کو میں ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گن سکتا لیکن میں نے دنیا کے حال پر نظر کی اور دیکھا کہ خدا کی یہی مرضی ہے کہ ایک وقت پر دنیا چلے تو اس سے اعراض کرنا قانون فطرت کو توڑنا ہے، اور تمام قوانین میں قانون فطرت ہی ایسا زبردست قانون ہے جس کا توڑنے والا سزا سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور اسی واسطے اُس قانون کے سب سے بڑھ کر جاننے اور سمجھنے والے نے ہمارے پیغمبر صاحب صلوات اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین نے فرما دیا۔ النکاح سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی میں نے نہ صرف نکاح کی ضرورت کو سمجھا بلکہ اس ذمہ داریوں کو بھی اور جب میں نے نکاح کا قصد کیا ہے تو آپ کی اس کمیٹی کے طفیل سے اس تعلق کے اطراف و جوانب اور نتائج و عواقب سے اس قدر واقف ہو چکا تھا کہ اپنی واقفیت کے بدولت نکاح کا قصد کرنا میرے نزدیک داخل حمق ہے میں نے عموماً انسان کی اور خصوصاً اپنی نیتوں کو جانچا اور انقلابات کو بھی پیش نظر رکھا جو یقیناً یا غالباً میری حالت میں واقع ہونے والے ہیں مثلاً میں یقیناً جانتا ہوں کہ اگر آفات ناگہانی سے محفوظ رہا تو میری توانائی ایک حد پر پہنچ کر ٹھہرے گی اور پھر گھٹنی شروع ہوگی۔ میں نے اس غرض سے انگریزی پڑھی کہ مجھ کو آسودگی ہو اور میں اس کالج کا جس کو خدا اس کو ابدالآباد تک قائم رکھے نہایت ممنون اور شکر گزار ہوں کہ میں معاش کی طرف سے بالکل مطمئن ہوں۔ اول تو آپ صاحبوں کو معلوم

ہے کہ کتنی دفعہ مجھ کو معقول نوکریاں ملتی رہیں اور میں نے اُن کو قبول نہیں کیا ہے میں معاش سے آزادی کی بہت زیادہ قدر کرتا ہوں۔ اسی لیئے میں نے قانون اور انجنیری دو چیزیں اختیار کی ہیں جن کے ذریعے سے میں امید کرتا ہوں کہ نوکری پیشہ لوگوں سے زیادہ خوشحال رہوں گا۔ ایک چیز اور بھی ہے سو میں اپنے مضامین پایونیر اور انگلشمین اور مدراس میل اور بمبئی ٹائمز یعنی ہندوستان کے تمام نامی انگریزی اخباروں میں بھیج کر دیکھ چکا ہوں، سب نے میری تحریر کو پسند کیا ہے، جو شخص اتنے وسائل رکھتا ہو اس کو معاش کی طرف سے بے اطمینانی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ میری خاص حالت ایسی تھی کہ بزرگوں کا پس خوردہ بھی میرے لیئے کافی ہوتا۔ مگر وہ روح جو اس کالج کی تعلیم نے میرے دل میں پھونکی ہے کسی طرح جائز نہیں رکھتی کہ میں دوسروں کا بار خاطر ہو کر رہوں خدا کا شکر ہے کہ میں اندھا لولا لنگڑا اپاہج نہیں ہوں اور جن چیزوں سے لوگوں نے عزتیں پیدا کیں دولتیں کمائیں وہ سب سامان میرے لیئے بھی تہیا ہے، اگر میں اُس سے کام لینا چاہوں، اور میں نے لیا ہے اور لوں گا سخت دون ہمتی کی بات ہوگی کہ میں دوسروں کا سہارا پکڑوں ؏

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است رفتن بپائے مردُئے ہمسایہ در بہشت

اسی خیال سے میں نے نحن رجال وھم رجال کو اپنا شعار قرار دے کر اس کی مہر کندہ کرا رکھی ہے جس کو آپ صاحبوں نے کبھی کبھی میرے خطوط اور لفافوں پر ثبت کیا ہوا دیکھا ہوگا۔ بہر حال نکاح سے پہلے میں نے جہاں اور پیش بینیاں کیں اُن میں ایک یہ بھی تھی کہ مجھ کو زیادہ خرچ درکار ہوگا تو میں نے دیکھا کہ میں اس کے لئے پورا پورا طیار ہوں جس بات میں مجھ کو زیادہ غور کرنا پڑا وہ یہ تھی کہ میں نے اُن ذمہ داریوں پر نظر کی جو مجھ پر عائد ہوں گی اس لیئے میں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی خانہ داریوں کی طرف توجہ کی تو اُن کو ناگفتہ بہ حالت میں پایا کہ مردوں نے عورتوں کے حقوق پامال کر دیئے ہیں اور یوں کوئی عورت شوہر پر غالب آگئی ہے تو وہ اتفاقی صورت ہے۔ عام دستور کے مطابق عورت مرد کے مقابلے میں ہوں بھی تو نہیں کر سکتی۔ حالانکہ اسلام نے مرد اور عورت دونوں کے حقوق کو ایسی عمدگی کے ساتھ مقرر کر دیا تھا کہ اگر اس قاعدے پر عمل ہوا ہوتا تو ہماری قوم کی ہرگز یہ ردی حالت نہ ہوتی۔ وہ قاعدہ کیا تھا[1] ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف وللرجال علیھن درجۃ ذرا لفظ درجۃ کے

[1] اور جیسے مردوں کا حق) عورتوں پر ہے ویسے ہی دستور کے مطابق عورتوں کا (باقی صفحہ ۲۴۶ پر)

اطلاق پر نظر کرو کہ وہ مردوں کی مطلق فضیلت ظاہر کرتا ہے اور جس میں نے خیال کیا تو وہ فضیلت اسی کی ہے کہ مرد کماتا اور رب البیت کہلاتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھو تو ایک طرح پر اسی حیثیت میں وہ اہل وعیال کا خادم ہے۔ عجیب انتظام ہے کہ دنیا میں ہر ایک شخص محتاج اور محتاج الیہ اور خادم و مخدوم دونوں ہے پس مرد اور عورت میں فرق ہے تو دائیں بائیں آنکھ یا دائیں بائیں ہاتھ کا سا لیکن ہمارے طرز تمدن نے اس فرق کو حد سے زیادہ بڑھا رکھا ہے اور جو مسافت مرد اور عورت دونوں کی حالتوں میں واقع ہے اس کے کم کرنے کو بڑی مدتیں چاہئیں۔ وہ بھی اس صورت میں کہ ابھی سے عورتوں کی اصلاح حالت کی تدبیر کی جائے سو اس کا تو ابھی ہم لوگوں میں مذکور بھی نہیں۔ رب البیت ہونے کے اعتبار سے مرد کا نہ صرف یہ فرض ہے کہ وہ اہل وعیال کے لئے معاش پیدا کرے کہ یہ تو ہر کس وناکس کرتا ہے اور شاید تقاضائے طبیعت بھی ہے بلکہ ایک مہذب خانہ دار کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ بی بی کے ساتھ محبت اور خاطرداری اور دلجوئی سے پیش آئے ہمیشہ اس کی ہمدردی کرتا رہے اور جیسا اس کو اپنی امانت دار سمجھتا ہے آپ بھی اس کی امانت میں خیانت نہ کرے یہی وہ فرائض ہیں جن کی تعمیل میں اکثر کوتاہی ہوتی اور یہی کوتاہی اکثر خانہ داریوں کو بدمزہ رکھتی ہے مجھ کو اچھی طرح یقین ہو گیا تھا کہ خانہ داری سے بہتر کوئی چیز انسان کو ادب نہیں سکھا سکتی۔ خانہ داری اس کے حق میں جنتری کا کام دیتی ہے کہ اس کے سارے بل نکل جاتے ہیں، پہلے شوہر اور پھر باپ بننا ایسے بوجھ نہیں ہیں کہ ان کے تلے آکر آدمی اچھل کود کر سکے بشرطیکہ آدمی آدمی ہو اور اگر ظاہر کا آدمی اور باطن کا جانور ہے تو اس سے کچھ بحث نہیں۔ میں نے تو اپنے اصول یہ ٹھہرا رکھے ہیں کہ کوئی شخص کتنے ہی سرٹیفکیٹ دکھائے مجھ کو اس کی نیک چلنی کی طرف سے ایسا اطمینان نہیں ہوتا جیسا صرف ایک اتنی سی بات سے کہ وہ خانہ دار ہے۔ کاہلی کے دور کرنے کو خانہ داری جیسا کوئی کارگر تازیانہ نہیں۔ وہ حکایت آپ نے نہیں سنی کہ ایک شخص نے پیغمبر صاحب سے تنگ دستی کی شکایت کی اور وہ تھا مجرد نہ آگے اگاڑی نہ پیچھے پچھاڑی۔ فرمایا نکاح کرو۔ کیا اور تنگ دستی زیادہ ہوئی۔ پھر شکایت کی اور پھر ارشاد ہوا اور نکاح کرو۔ آخر خدا نے کشائش دی۔ بات کیا تھی کہ وہ شخص بے فکری کی وجہ سے کاہل ہو گیا تھا۔ دو گھڑی لیٹ پڑ رہے تو لگا ناچار پھرنے

پھر تو وہ شخص جس کو بیٹھ کر اٹھنا مشکل تھا دل سے محنت کرنے پر آمادہ ہوا اور خدا نے اس کو ایسی توانائی دی کہ تکدر کی جوڑی کے بغلی اور روالی ہاتھ خاصی طرح صفائی سے ہلانے لگا۔ غرض میں نے دوسروں کی طرح بے سوچے سمجھے ادائے رسم کے طور پر اس تعلق کا ارادہ نہیں کیا اور نہ کوئی خواہش نفسانی اس کی متقاضی ہوئی کہ جلدی کرتا۔ مجھ کو اس تعلق کے لئے انتخاب کے کرنے میں بڑی مشکلیں پیش آئیں۔ میں نے اپنی آزادی کو اس معاملے میں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ یہ میرے اختیار کی بات تھی اور میرے ہی اختیار سے ہونی بھی چاہئے تھی لیکن رسم و رواج نے اُس اختیار کو حقدار سے چھین کر دوسروں کو دے رکھا ہے ایسی کارروائی کے نتیجے کبھی قباحت سے خالی ہو نہیں سکتے۔ کہ ذمہ داری کسی کی اور اختیار کسی کا۔ چنانچہ میں نے اپنے اختیار کو آپ نافذ کرنا چاہا۔ گو اُن لوگوں نے جو اُس پر غصباً قبضہ کئے ہوئے تھے برا بھی مانا ہو۔ کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے اور اسی کا تجربہ مجھ کو پہلے پہل اسی معاملے میں ہوا۔ میرا ہی دل جانتا ہے کہ میں نے کس مشکل سے اپنے اختیارات کو سنبھالا۔ بے شک مجھ کو کئی طرح کی تکلیفیں پہنچیں اور سب میں زیادہ ایذا دہ تھی ناحق کی بدگمانی، مگر جیسی بدگمانی کی تکلیف تھی ویسی ہی اس بات کی خوشی بھی تھی کہ میں دوسروں کے لئے ایک نمونہ قائم کرتا ہوں اس اصلاح کا جس کو ہماری سوسائٹی کی سخت ضرورت ہے۔ اگرچہ امید نہیں کہ میرا بے وقعت اور بے حقیقت نمونہ کوئی بڑی تحریک پیدا کرے گا۔ مگر تمام اصلاحوں کا یہی حال ہے کہ شروع میں ضعیف ہوتی اور بتدریج قوت پکڑتی جاتی ہیں۔ دوسری مشکل اور میں کہوں گا کہ سخت تر مشکل انتخاب کی تھی ہمارا طرز تمدن ہم کو انتخاب کی اجازت دے نہیں سکتا۔ اس کو چاہیے معاشرت اور اختلاط اور وہ ممکن نہیں، میں تو ایسا تب دل ہو چلا تھا کہ کئی بار میں نے آزادی سے دست برداری کرنی چاہی کہ بلا سے دوسروں پر بوجھ تو رہے گا۔ اُن کو موقع بھی مل سکتے ہیں۔ گو میرا رجحان پورا پورا معلوم نہ ہو مگر عام طور کا رجحان تو سبھی کو معلوم ہے۔ اور جو لوگ میری طرف سے اور میرے لئے انتخاب کریں گے وہ یقیناً میرے خیرخواہ بھی ہیں۔ قریب تھا کہ میں بھی عام دستور کی اگ کے تلے سے ہو کر نکلوں کہ میری خوش قسمتی نے مجھ کو ایک موقع دیا اور میں اپنے اختیار اور انتخاب دونوں کو اچھی طرح سے لا سکا۔ مجھ کو ایک دوست سے ایک شریف زادی کے ایسے تفصیلی حالات سننے کا اتفاق ہوا کہ وہ معاشرت اور اختلاط کے

ترتیب قریب تھا میں ایک دن مینٹل فلاسفی (فلسفۂ عقلی) کی ایک کتاب بیٹھا دیکھ رہا تھا کہ دلّی کے رہنے والے ایک آشنا میرے کمرے میں تشریف لائے اور پوچھا کہ ایسی توجہ سے کیا پڑھ رہے ہو میں نے کتاب کا نام بتایا انہوں نے پوچھا کس فن میں ہے میں نے کہا فلسفۂ عقلی، انہوں نے زیادہ تصریح چاہی تو میں خواب کا بیان پڑھ رہا تھا اُس میں سے اُن کو کچھ سنایا، اس پر انہوں نے کہا کہ ہمارے محلے میں ایک میر خسرو صاحب ہیں بڑے شریف اور معاش کی طرف سے بھی آسودہ، ان کی ایک لڑکی ہے۔ خدا نے اُس کا عجیب طرح کا دماغ بنایا ہے کثرت سے خواب دیکھتی ہے اور اُس کا خواب کبھی غلط نہیں ہوتا اور تعبیر بھی ایسی دیتی ہے کہ اُس کے خلاف کبھی ہوا ہی نہیں سارا شہر اُس کا معتقد ہے میری والدہ کا تو یہ حال ہے کہ ابا جان کے یا بڑے بھائی کے یا کسی کے خط کو ایک دن کی بھی دیر ہو جاتی ہے تو میر خسرو کے گھر دوڑی جاتی ہیں اور خدا کی قدرت جب کبھی کسی بات کے پوچھنے کو گئی ہیں ہمیشہ جواب باصواب لے کر آتی ہیں حسن کی لیاقت کی، پاک دامنی کی، ہنر اور سلیقے کی، نیک بختی کی دھاک ہے، مگر باوجودیکہ بیس بائیس برس کی ہو گئی ہے اور دو چھوٹی بہنیں بیاہی جا کر بچوں کی مائیں ہیں۔ اس بیچاری سے کوئی بیاہ نہیں کرتا کہ اس کے سر پر کچھ ہے۔ حالانکہ خواب کے سوائے کچھ بھی تو نہیں، ناحق کا واہمہ ہی واہمہ ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ بڑی بزرگ عورت ہے، عابدہ، پرہیزگار، قرآن خوان، تہجد گزار، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جس تقریب سے اس دوست نے تذکرہ کیا، اس میں تصنع یا مبالغے یا طرفداری کو دخل ہو نہیں سکتا پس مجھ کو تو اُن کا کہنا پتھر کی لکیر ہو گئی۔ اجنبی بن کر میں نے دو چار باتیں ان سے اور بھی پوچھیں۔ ادھر وہ اُٹھ کر گئے۔ ادھر میں نے بسم اللہ کر کے میر خسرو صاحب کو ایک بڑا لمبا خط لکھا اُس کی نقل بھی میرے پاس محفوظ ہے اور کبھی موقع ہوا تو وہ خط بھی میں آپ صاحبوں کو سناؤں گا۔ اگرچہ ہم لوگوں میں عورتوں کا تذکرہ کرنا آداب مجلس کے خلاف ہے مگر ایک تو یہ کمیٹی خاص طرح کی ہے ممکن نہیں کہ نکاح پر بحث ہو اور عورتوں کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ دوسرے درحالیکہ ہم بزرگانِ دین حتیٰ کہ پیغمبر صاحب کی ازواج طاہرات و صاحبزادیوں کے بے تکلف نام لیتے، بے مضائقہ ان کے کل حالات بیان کرتے ہیں تو ہماری عورتیں کیا حقیقت ہیں کہ اُن کا نام لینا، اُن کے حالات کا بیان کرنا موجب بے عزتی سمجھا جائے۔ بس اسی ایک بات سے

قیاس کر لینا چاہیئے کہ ہم نے اپنی عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کیا اور آئندہ کیا کرنے والے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو پردہ کا حکم دیا ہے اور اسمیں چند در چند مصلحتیں ہیں مگر ہمکو دیکھنا ہے کہ جن لوگوں کے گھر سے پردہ نکلا وہ خود کس طرح پردہ کرتے تھے۔ عورتیں لڑائی میں ساتھ ہوتی تھیں اسلئے کہ خیمہ میں بیٹھی بالوں کی گلوریاں بنا بنا کر رکھیں بلکہ اسلئے کہ سپاہیوں کی خدمت بجا لائیں، زخمیوں کی مرہم پٹی کریں، پانی پلائیں، رسیاں بٹیں۔ یا اسی قسم کے اور کام جو عورتوں کے بس کے تھے۔ عورتوں کو نماز میں شریک ہونیکی اجازت تھی۔ عورتیں نامحرم مردوں سے بات چیت کر سکتی تھیں چنانچہ اسوقت تک وہ خطبے لکھے ہوئے موجود ہیں جو عورتوں نے مردوں کی جماعت کو مخاطب کر کے بیان کئے۔ غرض پردہ تھا اور پردے کے ساتھ آزادی بھی تھی کہ فتنے کا بھی انسداد ہو اور دنیا کے کاروبار میں بھی خلل نہ پڑے۔ ہم نے پردہ میں اتنا انسداد کر دیا کہ عورتوں کا نام تک زبان پر آنا موجب بے حرمتی ہے مگر یہ ادعائی حرمت و دنیا کی فلاح۔ دنیا کی ترقی کے ساتھ تو جمع نہیں ہو سکتی۔ خیالات تو یہ ہیں اور اسپر بڑبڑاتا ہے کہ اہل یورپ نے ہماری سلطنت چھین لی۔ اہل یورپ ہم کو پیٹ بھرا نہیں دیکھ سکتے۔ اہل یورپ ہماری ملکی دولت گھسیٹے لیے جاتے ہیں

اسلام حقیقت میں ہمارے حق میں میگنا چارٹا (فرمان آزادی) کا حکم رکھتا ہے اور کل دنیا کی ترقیوں کے دروازے ہمارے لئے مفتوح کئے۔ مگر ہم کمبختوں نے اس سے فائدہ اٹھانا نہ جانا۔ آپ اپنے اوپر قیدیں لگاتے گئے اور ہاتھ پاؤں پر بندھے بندھے پانچوں حیثیت شرعی نکل گئے۔ غیر مسلمان کی عورت کا ذکر تو ہمارے اس کالج میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ لوگ اسکو کہتے ہیں کالج اور میں کہتا ہوں امام باڑہ۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ عورتوں کا تذکرہ ہم لوگوں میں خلاف آداب مجلس ہے۔ مگر میں اس جھوٹی خلاف شرع مصنوعی ادعائی عزت کو مسلمانوں کی بے عزتی کا موجب سمجھتا ہوں۔ اسلئے بے محابا آپ لوگوں کے سامنے کہتا ہوں کہ میں نے نکاح سے پہلے جو تفتیش کی۔ اسمیں ایک بات یہ بھی تھی کہ مجھ میں باپ بننے کی صلاحیت ہے تو زوج ثانی میں ماں بننے کی بھی صلاحیت ہے یا نہیں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس امر کی تحقیقات محال سے زیادہ مشکل تھی مگر میں نے خیال کیا کہ جو امور جسمانی شناخت سے متعلق ہیں وہ ایک خاندان کے لوگوں میں اکثر یکساں ہوتے ہیں چنانچہ دریافت سے معلوم ہوا کہ اس خاندان کی کل عورتیں ددھیال کی کیا ننھیال کی سب کثیر الاولاد ہیں۔

یہ باتیں میں نے اس غرض سے بیان کی ہیں کہ گو پردے نے تحقیقات کے سب رستے بند کر رکھے تھے مگر آدمی درپئے تفتیش ہو تو بہت کچھ کر سکتا ہے میں نے کیا اور میں افسوس کرتا ہوں کہ دوسرے کیوں نہیں کرتے۔ ادھر میر خسرو صاحب بھی روشن خیال آدمی ہیں۔ انھوں نے بھی میرے حالات کیوں نہ دریافت کئے ہونگے۔ بارے خوش نصیبیوں میں سب سے بڑی خوش نصیبی یہ بھی تھی کہ انھوں نے مجھے اپنی فرزندی میں لینا قبول کیا اور میں نے اپنے تعلق کو اس سے جو سنا تھا اور اپنی توقع بلکہ تمنا سے بہت زیادہ پایا۔ والحمد للہ علیٰ ذلک

اس تعلق کی وجہ سے جو دلی میں زیادہ رہنے کا اتفاق ہوا تو مجھکو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ مفلس اور کاہل ہیں۔ خود پسند اور مغرور ہیں۔ پرانی لکیروں کے فقیر ہیں۔ وہ بڑے تیرہ خیال اور متعصب ہیں۔ ان میں اصلاح پانے کی مطلق صلاحیت نہیں، وہ جلی ہوئی رسیاں ہیں۔ مگر ان کے بل جیسے کے تیسے ہیں۔ وہ قومی خیالات سے بالکل ناآشنا ہیں۔ شروع سے آخیر تک۔ الا ماشاء اللہ۔ میں جو پہنچا تو لوگوں نے شاید دو ایک ہی دن سے از خود بلا تقریب میرے پاس آنا شروع کیا اور آئے تو ایسے جمے کہ اٹھنے کا نام نہیں۔ معلوم ہوا کہ ہزاروں آدمی اسی طرح نکھٹو پڑے پھرتے ہیں بعض تو ایسے بھونڈے خیالات کے تھے کہ ان سے مجھکو ملنے سے دلی نفرت تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ میں ان کے ڈھب پر چڑھنے والا نہیں تو بے دل ہو کر بیٹھ رہے۔ ساری بادی جھپٹ چھپٹا کر آخر وہ لوگ رہے جو مولوی یا طالب علم یا پڑھے لکھے کہلاتے تھے۔ مگر پڑھنا لکھنا اپنے اپنے طور کا۔ لوگوں کی ملاقات کے حالات میں روزنامچے میں لکھتا گیا ہوں اور کبھی نہ کبھی آپ صاحبوں کو سناؤں گا کیونکہ دلچسپی سے خالی نہیں اس وقت تو مجھے اسقدر کہنا ہے کہ دلی والوں میں بلا کا مذہبی تعصب ہے، اور مسلمانوں ہی میں باہم اسقدر اختلاف ہے کہ پولیس فوجداری دیوانی کوئی کچہری نہیں جس میں ان کے مقدمات دائر نہ ہوں انکے آپس میں تو اتنا اختلاف ہے مگر میرے مسلمان نہ ہونے میں سب کو اتفاق تھا۔ میں حیران تھا کہ الٰہی میرے منہ سے کفر کا کون سا کلمہ نکلا کہ یہ لوگ مجھکو مسلمان نہیں سمجھتے آخر معلوم ہوا تو صرف علی گڑھ کالج کا سبب ہے میلان تو جی کا جھکنا تھا۔ مگر یہ لوگ مجھکو گنتے ہی نہ تھے۔ اور میری مذہبی معلومات جو تھی سو تھی۔ میں اپنے کو سنبھالتا یا مذہب کے گورکھ دھندے کو بیٹھا سلجھاتا ؟ تو میں بعض اوقات لاجواب ہو جاتا

تھا۔ مگر میں بھی اس خیال میں غلطاں پیچاں رہنے لگا۔ بیسیوں مذہبی رسالے دیکھ ڈالے اور شوق ہی کہ بڑھتا چلا جاتا ہی پر تسلی نہیں ہوتی خیال کو دل سے دور کرنا چاہتا ہوں تو دور نہیں ہوتا۔ اور طبیعت ہی کہ کسی طرف سی نہیں ہٹتی۔ اقلیدس کی نئی شکلیں اور جبر و مقابلے کی مساواتیں حل کرنے میں جو الجھن پیدا ہوتی ہیں جس نے طالب علمی کی ہے وہی اس کی قدر خوب جانتا ہی مگر میں آپ صاحبوں کو یقین دلاتا ہوں کہ مذہبی الجھن کے آگے میں ساری الجھنوں کو بھول گیا۔ ہر وقت کی سوچ سے بند اچاٹ ہو گئی کھانا کم کھانے لگا۔ قریب تھا کہ میری تندرستی میں فرق آجائے کہ اتنے میں میری بیوی نے جس کی نسبت آپ سُن چکی ہیں کہ وہ بچپن سی بہت خواب دیکھا کرتی تھیں اور کبھی ان کا خواب جھوٹا ہوا ہی نہیں میرے بارے میں ایک بڑا لمبا خواب دیکھا جیسے میں کسی بزرگ کے ساتھ مذہبی مباحثہ کر رہا ہوں اور ان بزرگ نے میرے سارے شکوک رفع کر کے میرا پورا اطمینان کر دیا ہے۔ یوں تو انہوں نے ہزاروں خواب دیکھے اور سارا شہر اس بات سے واقف ہی مگر ان کے دو خواب بڑے عجیب ہیں ایک تو انہوں نے وقت سے پہلے اپنے ماموں کو امتحان تحصیلداری کے سوالات خواب کے ذریعہ بتا دیے تھے۔ ماموں کہیں الہ آباد کے علاقہ میں تحصیلدار رہے تھے۔ اور یہ دہلی میں خواب میں سوالات معلوم ہوئے۔ انھوں نے صبح اٹھ سوالات قلم بند کر رجسٹری کرا ماموں کے پاس بھیج دیے۔ کئی دن بعد امتحان ہوا تو ایک نقطے کا فرق نہ تھا۔ وہ خط رجسٹری کے لفافہ سمیت اس وقت تک تحصیلدار صاحب کے پاس موجود ہے؛

یہ خواب جو میرے بارے میں دیکھا۔ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہی۔ میں نے اس خواب کو زبانی نہیں سننا چاہا۔ بلکہ ان سے کہا کہ لکھ دو، وہ لکھتی جاتی تھیں اور میں برابر بیٹھا ہوا دیکھتا جاتا تھا کہ میرے جتنے سوالات ہیں جوابات میرے دل میں تھے وہی انکے قلم سے نکلتی تھی۔ یہ رسالہ جو آپ میرے ہاتھ میں دیکھتے ہیں وہی خواب ہی اور جنھوں نے دیکھا ہی۔ ان ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا بھی ہی۔ اس کے مضامین ہی میں اسبات کا ثبوت ہی کہ یہ خواب دل سے نہیں بنایا گیا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ جنہوں نے یہ خواب دیکھا ہی اس کی بعض باتوں کو سمجھ بھی نہیں سکتیں۔ اگرچہ اس خواب کو میں ان فوائد میں شمار کرتا ہوں جو نکاح کی وجہ سے مجھکو حاصل ہوئے مگر چونکہ یہ ہر ایک کے نکاح کا لازمی نتیجہ نہیں ہے اس لئے میں

اسکو کمیٹی میں پیش کرتے ہوئے تامل کرتا تھا کہ نہیں معلوم اسکو غرض کمیٹی میں داخل بھی سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر مجھکو اس خواب میں ایسی مسرت ہوئی ہے کہ آپ سب صاحبوں کو شریک کیے بدون مجھ سے نہ رہا گیا اور مطلب بھی ایسا اہم ہے کہ اس سے زیادہ ضروری کوئی مطلب ہو نہیں سکتا۔

غرض میں یہ رسالہ بڑی خوشی سے کمیٹی کی نذر کرتا ہوں اور اگر کمیٹی کی نظر میں بکار آمد ثابت ہوا اور اسکے چھپوانیکی صلاح ٹھیرے تو اسکا کاپی رائٹ بھی کمیٹی کی نذر ہے۔

صادق کا یہ بیان سنکر لوگوں کے شوق تو اسقدر مشتعل ہو رہے تھے کہ چاہو ساری ساری رات ہی کیوں نہ بیٹھنا پڑے مگر خواب بھی سنایا جائے لیکن گفت و شنود کے بعد آخر یہ رائے قرار پائی کہ نہیں خواب کو بڑے اطمینان سے سننا ہوگا اور عجب نہیں کسی کسی موقع پر بحث بھی پیش آجائے ختم ہونے تک کمیٹی کے آئندہ اجلاس اسی خواب کیلئے وقف رہیں۔ لوگوں نے بہتیرا چاہا کہ ان کو کتاب مستعار دیجائے اور کمیٹی سے خارج انکو اس کو پڑھنے اور دیکھنے کی اجازت ہو مگر پریذیڈنٹ نے اسکو منظور نہ کیا اور وہ کتاب قفل میں بند کر دی گئی جب کمیٹی کا اجلاس ہوتا نکالی جاتی لوگ سنتے اور سر دھنتے۔ اس پر بحث بھی اتنی ہوئی کہ کسی مضمون پر نہ ہوئی ہوگی۔ انجام یہ ہوا کہ کمیٹی نے بالاتفاق ریزولیوشن پاس کیا کہ:۔

جو اس کتاب جتنی باتیں بھی نہ جانتا ہو اس کا اسلام کیا

پھر تو کالج کا کوئی طالب علم نہ تھا جس کے پاس اسکی ایک چھپی ہوئی کاپی نہ ہو سنا ہے کہ اس کتاب کے کاپی رائٹ سے کالج میں ہر سال دو تین فری بورڈنگ ہاؤس تعمیر ہوتے رہتے ہیں طالب علموں نے بڑا زور مارا کہ کتاب کالج کے مذہبی کورس میں داخل ہو مگر مسلمانوں کے تعصب کے آگے کسی کی پیش نہ گئی لیکن کبتک؟ بہر کیف اس وقت تو کالج کے مذہبی دانت دکھانے کے اور کتابیں ہیں اور کھانیکے یہ کتاب۔ اس خواب کے متعلق ایک عجیب بات اور ہے کہ اسکے بعد سے صادقہ کے خوابوں کا سلسلہ آپ سے آپ بالکل منقطع ہو گیا۔ وہ اور اسکے لواحق بہتیرا چاہتے ہیں کہ وہ کوئی خواب دیکھے مگر دکھائی دے تو دیکھے جس غرض سے اسکو یہ نعمت بخشی گئی تھی آخری خواب سے اس کے شوہر کو خصوصاً اور مسلمانوں کو عموماً فائدہ پہونچنا تھا سو پہنچا۔ اب اسکو خواب نظر آئیں کیوں اور لوگ منتظر ہیں کس لیے؟